مضامینِ مدنی

ڈاکٹر سیّد ظہیر الدّین مدنی

گجرات اردو اکادمی

گجرات اردو اکادمی

(حکومت گجرات) گاندھی نگر

382017

Scanned with CamScanner

مضامینِ مدنی

ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی

گجرات اردو اکادمی
(حکومت گجرات) گاندھی نگر

MAZAMINE MADNI
(Research essay's of Dr. Madni)
(By. Dr. Saiyed Zahiruddin Madni)

سلسلۂ مطبوعات	:	4
پہلا ایڈیشن	:	October 1990,
تعداد	:	500
قیمت	:	53.00 روپے

ناشر
ڈاکٹر ہسو یاگنک (رجسٹرار)
گجرات اردو اکادمی (حکومت گجرات)
دفتر بھنڈار بھون، سیکٹر 17
گاندھی نگر 382017

Publisher :
Dr. Hasuyajnik (Registrar)
Gujarat Urdu Akademy
Dafter Bhandar Bhavan
Sector :- 17, Gandhinagar.
382017

Printer: Riddhi Graphic, Odhav, Ahmedabad.

انتساب

اپنی اہلیہ کنیز فاطمہ ایم۔ اے کے نام

مجھ سے ادب کی کیا خدمت بر آئی ہے، اس کا
حساب تو اہلِ نظر رکھیں گے، لیکن میں
اپنا کام کر سکوں اس کے لیے تم نے جس
ایثارِ نفسی اور خدمت گزاری کا عملی
ثبوت دیا ہے، اس کا حساب میرے
دل میں ہے۔

یہ انتساب جذباتِ تشکّر و ممنونیت
کے اظہار کا حرفِ اعتذار ہے۔

ظہیر الدین مدنی

پیش لفظ

اردو زبان کی ترقی و ترویج میں گجرات کا ایک اہم تاریخی رول رہا ہے۔ ناسازگار حالات کے باوجود آج بھی اردو میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ آج بھی گجرات سے ایسے ادیب، شاعر، نقاد اور محقق پیدا ہوئے ہیں جن کے ادبی کارناموں کا اعتراف ہندوستان گیر پیمانے پر ہوا ہے۔ ان سربرآوردہ ادیبوں کی ہستی گجرات کے لیے باعثِ فخر ہے۔

اردو زبان کو گجرات میں نشو و نما پانے کے بہتر مواقع حاصل ہوں اور اس کی ترویج و تعلیم کی راہ میں جو دشواریاں حائل ہیں انہیں دور کیا جا سکے، اس مقصد کے تحت ۱۹۸۶ء میں حکومتِ گجرات نے اردو اکادمی کی بنیاد رکھی۔

اکادمی نے زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے بہت سے منصوبے بھی بنائے اور انھیں عملی جامہ بھی پہنایا۔ گجرات میں گجری ادب کا بڑا سرمایہ ہے جس کی تحقیق و تدوین کی بڑی ضرورت ہے۔ گجرات کے صوفیہ، شعرا اور علما پر تحقیقی اور تاریخی کتابوں کی اشاعت بھی ایک اہم فریضہ ہے۔ گجرات کے نئے اُبھرنے والے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ مقتدر ادیبوں کی کتابوں کی اشاعت کا جو منصوبہ اکادمی نے بنایا ہے، زیرِ نظر کتاب اسی کا ایک حصہ ہے۔

اکادمی کے اشاعتی منصوبے میں گجری زبان و ادب کے متعلق نئے تحقیقی مواد کی فراہمی، تاریخِ گجرات سے متعلق اہم مآخذات کا اردو میں ترجمہ، نایاب کتابوں کی دوبارہ اشاعت اور اہم مخطوطات کی نئی تدوین و طباعت شامل ہے۔

ہمارے یہاں بڑی مدت سے اردو گجراتی لغت کی کمی محسوس کی جاتی تھی۔ اکادمی کے زیرِ اہتمام اب یہ لغت اپنی تکمیل کے آخری مراحل طے کر رہی ہے۔

ہم ممنون ہیں سید شریف الحسن نقوی صاحب کے جنھوں نے ہمارے لیے کتابت کے دشوار گزار مراحل آسان کر دیے۔

ڈاکٹر هسو یاگنک
سکریٹری، گجرات اردو اکادمی

فہرست

سورت کی صورت

سورت اور راندیر گجرات کے دو قدیم شہر ہیں۔ یہ تاپتی ندی اور بحیرۂ عرب کے سنگم پر واقع ہیں۔ تاپتی کے ایک کنارے پر سورت ہے۔ اور اس کے مقابل دوسرے کنارے پر راندیر سورت سے بھی قدیم تر بستی ہے۔ راندیر میں تبع تابعین میں سے ایک بزرگ کے مزار کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ کتب تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۲۵ اور ۱۳۲۵ صدی عیسوی میں کوفہ اور دوسرے مقامات سے عرب راندیر میں آکر بس گئے تھے۔ یہ لوگ نوائط کہلاتے تھے۔ ابھی تک راندیر میں ایک محلہ اس نام سے موجود ہے۔ یہ لوگ جہازرانی اور جہاز سازی میں مہارت رکھتے تھے اور تجارت کرتے تھے۔ دور دراز کے سفر کرتے تھے۔ ایک قلیل مدت میں ان لوگوں نے خوب دولت پیدا کرلی۔ سیاحوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے گھر بہت آراستہ ہوتے تھے۔

بحیرۂ عرب میں بحری لٹیروں کا زور تھا ۱۵۱۲ء میں پرتگیز لیٹروں نے سورت اور راندیر کو لوٹا اور پھر جلا دیا تھا۔ ۱۵۳۰ء میں دوبارہ انھوں نے سورت اور راندیر کو لوٹا اور جلا یا۔ تیسری بار بھی دونوں شہروں کو اسی طرح تاراج کیا تھا۔ دونوں شہر دوبارہ آباد ہوئے۔ مگر راندیر پھر اُبھر نہ سکا۔ البتہ سورت ایک بندرگاہ کی حیثیت سے ترقی کرتا گیا۔

سولھویں صدی میں فیروز شاہ تغلق نے سورت میں ایک قلعہ بنوایا لیکن لُٹیروں نے

اس کو بھی تباہ کر دیا تھا۔ گجرات کے ایک سلطان نے لیٹروں کے انسداد کے لیے ایک بحری بیڑا بھی رکھا تھا۔ ۱۵۴۰ء میں گجرات کے سلطان محمود سوم نے ایک قلعہ بنوایا تھا۔ یہ کام خداوند خان رومی کے سپرد کیا گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ خداوند خاں نے قلعہ کے تین نقشے سلطان کی حضور میں پیش کیے تھے۔ سلطان نے ان میں سے ایک پر لفظ مبارک لکھ دیا۔ اسی کے مطابق قلعہ تعمیر کیا گیا۔ یہ قلعہ آج موجود ہے۔ عہد قدیم میں اسی وجہ سے سورت کو بندر مبارک سورت کہا جاتا تھا

۱۴۰۷ء تا ۱۵۷۳ء سورت گجرات کے سلاطین کے قلمرو میں رہا۔ ۱۵۷۳ء میں اکبر اعظم نے گجرات کو مغلیہ سلطنت میں شامل کر لیا۔ اکبر احمد آباد سے فارغ ہو کر سورت آیا اور اس پر بھی اپنا پرچم لہرا دیا۔ ۱۶۱۶ء میں جہانگیر سورت آیا تھا۔ ۱۶۱۵ء میں جہانگیر نے یہ شہر شہزادہ شاہجہاں کو بطور جاگیر دیا تھا۔ اور شاہجہاں نے ۱۶۴۳ء میں شہزادی جہاں آرا کو پاندان خرچ (صرف خاص) کے لیے دے دیا تھا۔ اس عہد میں حقیقت خان سورت کا متصدی تھا۔ اس نے ۱۶۴۴ء میں حج بیت اللہ کے عازمین کے لیے ایک سرائے تعمیر کرائی تھی۔ اس کو مغل سرائے کہتے تھے۔ لہذا اس کے اطراف کا علاقہ بھی مغل سرائے کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اسی جگہ تمام یورپین اقوام کی کوٹھیاں تھیں۔ آج کل اس سرائے کی عمارت میں میونسپل کارپوریشن ہے۔

۱۷۰۵ء ۱۷۰۷ء عالمگیر کے دور حکومت میں سورت آسمانی سلطانی کی زد میں تھا۔ ۱۷۱۲ء میں شیواجی نے سورت کو پہلی بار لوٹا اور پھر ۱۶۷۰ء ۱۶۷۱ء ۱۶۷۴ء ۱۶۷۵ء اور ۱۶۷۹ء میں اس کو تباہ و تاراج کیا۔ شیواجی کے بعد مرہٹوں کے ۱۷۰۵، ۱۷۰۷، ۱۷۱۲ء میں گجرات پر حملوں کے موقعوں پر بھی کبھی سورت کا سکون غارت ہوتا رہتا تھا۔ ۱۷۹۱ء میں مرہٹوں نے سورت کے قریب سون گڈھ میں مستقل ڈیرے ڈالے اور گجرات پر حملے کرتے رہے۔ اس دوران میں بھی سورت لپیٹ میں آجاتا تھا۔

سورت سیلاب، قحط سالی، وبا اور آتشزدگی کے سانحوں سے بھی اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں کئی بار دوچار ہوا ہے۔ ان کی فہرست یہ ہے۔ سیلاب ۱۷۹۷ء کال ۱۷۹۰ء سیلاب ۱۸۱ کال ۱۸۱۳ء زلزلہ ۱۸۱۳ء آگ ۱۸۱۹ء اور سیلاب ۱۸۲۲ء سیلاب ۱۸۳۵ء آگ ۱۸۳۷ء آگ ۱۸۴۲ء سیلاب ۱۸۳ آگ ۱۸۴۸ء سیلاب ۱۸۴۹ء وبا (ہیضہ) ۱۸۶۴ء آگ ۱۸۶۹ء سیلاب ۱۸۷۳ء وبا (ہیضہ) ۱۸۷۵ء،

سیلاب ۱۸۷۶ء وبا۔ (ہیضہ) ۱۸۸۱ء طوفان آندھی ۱۸۸۲ء سیلاب ۱۸۸۳ء آگ ۱۸۸۹ء وبا (ہیضہ) ۱۸۹۳ء آگ ۱۸۹۶ء۔ پلیگ ۱۸۹۶ء بیسویں صدی میں اب تک پانچ چھ سیلاب آچکے ہیں بیوپاری ان آفات سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایسے وقت میں نمک جیسی چیز دو روپے سیر بکتی ہے۔

عالمگیر کے بعد مرکزی حکومت کمزور ہوگئی۔ صوبوں کے صوبیدار، قلعہ دار، متصدی، کوتوال فوجدار وغیرہ میں اقتدار کے لیے خانہ جنگیاں ہوتی رہیں۔ اس سے مرہٹوں اور انگریزوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ ۱۷۲۵ء میں سہراب خاں سورت کا متصدی تھا اور بیگلیر خان ثانی (مرزا گدا بیگ) قلعہ دار تھا۔ اس عہد میں شہر کے ایک کروڑپتی تاجر ملا محمد علی شہر کے باہر قلعہ کسٹم ہاؤس دفتر اکرو ڑگیری) شہر وغیرہ تعمیر کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ سہراب خاں مانع ہوا۔ لہذا ملا صاحب نے بیگلیر خاں کو اس شرط پر اپنا طرفدار بنالیا کہ وہ اپنے اثر و رسوخ سے دہلی سے اس کے بھائی تیغ بیگ خاں (مرزا گل) کے نام متصدی کے عہدے کی سند منگوادیں گے۔ سازباز کے بعد قلعہ دار نے کسی حیلہ بہانہ سے سہراب خاں کی حویلی پر گولہ باری شروع کردی۔ جنگ ہوئی۔ اور سہراب خاں کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور تیغ بیگ خاں کو متصدی مقرر کیا گیا۔ تیغ بیگ خاں بھی ملا صاحب کے خلاف ہوگیا۔ لہذا ملا صاحب دوبارہ سہراب خاں کے طرفدار ہوگئے۔ غرض دس سال یہ قضیہ چلتا رہا۔ آخر تیغ بیگ خاں انگریزوں کی مدد سے برسر اقتدار آگیا۔ اور اس نے ملا صاحب کو زہر دے دیا۔ یہ جنگ اقتدار تاریخ کا ایک خونی مگر دلچسپ ورق ہے۔ تیغ بیگ خاں نے مرکزی حکومت سے تعلقات منقطع کرلیے اور متصدی کے بجائے نواب کا لقب اختیار کرلیا۔ اس دن سے سورت میں نوابی کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۷۴۶ء میں تیغ بیگ کا انتقال ہوگیا۔ سورت کی نظامت کا جھگڑا پھر شروع ہوا۔ آج ایک نواب برسر اقتدار ہوتا تو کل دوسرا۔ ۱۷۵۸ء میں آخر تیغ بیگ کے داماد میر معین الدین عرف سید اچھن نے کمپنی کی مدد سے نظامت حاصل کرلی۔ ۱۷۶۳ء میں معین الدین کی وفات پر ان کے بیٹے میر حفیظ الدین نواب ہوئے اور ۱۷۹۰ء میں ان کی وفات پر ان کے بیٹے میر نظام الدین جانشین ہوئے۔ ان کے اولاد نرینہ نہیں تھی۔ لہذا ۱۸۰۰ء میں ان کے بھائی نصیر الدین کو کمپنی نے اس شرط پر جانشین مقرر کیا کہ وہ محکمۂ عدالت کے

سوا تمام نظم و نسق شہر کمپنی کے سپرد کر دیں۔ اور اس کے عوض ایک لاکھ روپیہ وظیفہ اور شہر کے محصول کا پانچواں حصہ لے لیں۔ ۱۸۲۱ء میں نصیر الدین خاں کے انتقال پر ان کے بیٹے میر افضل الدین خاں کو جانشین مقرر کیا گیا اور ان سے محکمہ عدالت بھی لے لیا گیا۔ میر افضل الدین خاں کی اولاد میں صرف دو لڑکیاں تھیں۔ لہٰذا ۱۸۴۲ء میں افضل الدین خاں کی وفات پر ان کے والد میر جعفر علی خاں کو وظیفہ خوار جانشین مقرر کیا گیا۔ میر جعفر کی اولاد میں ایک بیٹا میر ذوالفقار علی اور دو بیٹیاں تھیں۔ بڑی بیٹی کی شادی رئیس بیلہ سعید عالم خاں سے اور چھوٹی بیٹی کی میر غلام بابا خاں (محب مرزا غالبؔ) سے ہوئی تھی۔ ۱۸۶۱ء میں میر جعفر علی خاں نے وفات پائی۔ نوابی کا سلسلہ پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ سب کو وظیفے ملتے رہے۔ میر سعید عالم خاں نے ۱۸۸۷ء میں وفات پائی اور ان کے پوتے میر مسعود عالم خاں بن میر رسول عالم خاں ۱۹۴۳ء میں فوت ہوئے۔ میر مسعود عالم خاں کے فرزند میر سلطان عالم خاں بہ قید حیات ہیں۔ میر غلام بابا خاں نے ۱۸۹۳ء میں وفات پائی۔ ان کے پوتے میر حفیظ الدین خاں بن میر مظفر حسین خاں نے ۱۹۴۲ء میں وفات پائی۔ میر حفیظ الدین کے فرزند میر غلام غوث اور میر وزیر بہ قید حیات ہیں۔

۱۵۴۰ء کے بعد سورت تجارت کا بہت اہم مرکز بن گیا تھا۔ عرب تاجر ہندوستان کی اشیاء سمندر پار کے ملکوں میں لے جاتے اور ان کی ضرورت کی چیزیں ہندوستان لاتے۔ اس وجہ سے سورت کی بندرگاہ پر خرید و فروخت کا بازار گرم رہتا تھا۔ ۱۶۰۸ء میں کپتان ہانس یورپ سے بحری بیڑا لے کر سورت کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ پرتگیز پہلے سے یہاں موجود تھے جو انگریزوں کے کام میں روڑے اٹکاتے رہتے تھے۔ ۱۶۱۲ء میں کپتان لسبٹ دوسرا بیڑا لے کر سورت آیا اس وقت پرتگیزوں سے انگریزوں کی بحری جنگ بھی ہوئی۔ انگریزوں نے جہانگیر کے دربار تجارتی پروانہ حاصل کر کے سورت، کھمبائت، گھوگھا، احمد آباد میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کر لی تھیں۔ ۱۶۱۶ء میں سرٹامس رو ہندوستان آیا اور اپنے رسوخ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیادیں مضبوط کر لیں۔ ڈچ بھی آ گئے۔ اور ۱۶۲۰ء میں فرانسیسی بھی وارد ہوئے مگر تجارتی دوڑ دھوپ اور سرکشی میں صرف انگریزوں کے قدم جمے رہے۔ ۱۶۶۱ء میں کمپنی کو بمبئی جیسا مقام مل گیا۔ ۱۶۸۳ء میں بمبئی کو صدر مقام قرار دے دیا گیا۔

مغلیہ دَور میں تجارت کی وجہ سے سورت انتہائی عروج پر تھا۔ اس دَور میں انگریزوں کے دوش بدوش ہندو، عرب، تُرک تاجر بھی منڈیوں میں تھے۔ ہندوؤں میں ایسے مہاجن تھے جو بیک وقت کروڑوں روپے بطور قرض دیتے تھے۔ مسلمانوں میں مّلا عبدالغفور شیخ حامد سرخیزی، صالح چلپی، مرزا زاہد بیگ اس دور کے کروڑپتیوں میں تھے۔ مّلا صاحب ۱۹ جہازوں کے مالک تھے۔ یورپین اقوام کی یادداشتوں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ یہ عزّت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ عبدالغفور دولت بھرپور، ضرب المثل تھا۔ شیخ حامد کے پاس سات جہاز تھے۔ اس خاندان کے بعض افراد علم و ادب میں بھی بڑی شہرت رکھتے تھے صالح چلپی تُرک تاجر تھے۔ جب یہ شہر میں نکلتے تو ہزاروں سپاہی خدمت گار وغیرہ ان کے جِلو میں ہوتے تھے۔ تینوں تاجروں کو مغلیہ حکومت کی طرف سے عمدۃ التجّار کا خطاب؛ خلعت اور ایک لاکھ محصول کی معافی کا اعزاز حاصل تھا۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر تک اِن تینوں کا طُوطی بولتا تھا۔ سورت ہند، و مہاجنوں کا محلّہ تاناوٹ مسلمانوں کے محلّے سَوداگر واڑہ، تُرکی واڑہ، مغلی سرائے ایک دُوسرے سے متصل ہیں۔ یہیں یورپین اقوام کی کوٹھیاں تھیں۔ اور آج بھی بعض سوداگروں کی حویلیاں موجود ہیں۔ اسی جگہ دارالضرب بھی واقع تھا۔

عہدِ عالمگیر اگرچہ دَورِ خلفشار تھا۔ تاہم تجارتی نقطۂ نظر سے یہ عرُوج کا زمانہ تھا۔ مرہٹوں کی لوٹ مار کے باوجود منڈیاں بارونق تھیں۔ اکثر شاہی خاندان کے افراد کے بڑے بڑے ٹھیکے تھے۔ تجارت میں ان کو خاص مراعات حاصل تھیں۔ تجارت ہی کی وجہ سے سورت میں جہازرانی اور جہاز سازی کا کاروبار بہت اچھا تھا۔ اس کاروبار میں پارسی بھی بہت شہرت رکھتے تھے۔

انیسویں صدی میں بمبئی تجارتی مرکز بن گیا تھا۔ سورت کی رونق بمبئی نے چھین لی۔ بمبئی کی تجارتی رونق کا زیادہ اعزاز اہلِ گجرات اور خصوصًا اہلِ سورت ہی کو حاصل ہے۔ بمبئی کے تجارتی فروغ کو دیکھ کر تاجر قوموں، جین، بنیا، داؤدی بوہرہ، میمن، پٹنی بوہرہ نے موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ انھوں نے کوکنیوں کے دوش بدوش تجارتی سلسلے قائم کرلیے۔ ۱۸۶۴ء میں بمبئی سے احمد آباد تک ریل گاڑی کا اجراء ہوگیا۔ پھر کیا تھا سورت بمبئی گھر آنگن

ہوگیا۔ اس کے باوجود سورت میں بیوپار روزگار میں بڑی کمی نہیں ہوئی۔ ۱۸۶۰۔۷۰ء میں کپاس کا سٹا شروع ہوا۔ شیر بازار اور سٹے سے پھر سورت کے وارے نیارے ہونے لگے۔ اس میں آج کا دولتمند کل کا مفلس اور آج کا مفلس کل کا دولت مند ہوتا رہتا تھا۔ اس روزگار میں دولت آسانی سے آتی بھی ہے اور آسانی سے جاتی بھی ہے۔ دولت کی اس الٹ پھیر سے غیر تاجر بھی متاثر ہوئے۔ شیر بازار یا سٹے بازار میں جانے کی تو ہمت نہ ہوئی۔ تجارت کے میدان میں ضرور آگئے۔ لہذا سورت میں کاتنے بننے کے کارخانے (ملیں) کپاس کی جننگ فیکٹریاں، لوہے کے ڈھالنے کے کارخانے، کاغذ سازی کا کارخانہ وغیرہ قائم ہوگئے۔ تجارت کی اس بلیہاری نے امرا کے طبقے کو بھی ذہنی طور پر متاثر کیا۔ ان میں سے بعض عملی طور پر تجارتی میدان میں خم ٹھوک کر کھڑے ہوگئے بلیہ مل، غلام بابا مل، جعفر علی مل اسی ذہنی انقلاب کی یادگاریں ہیں۔ ان ملوں میں نواب بلیہ، نواب غلام بابا، نواب جعفر علی وغیرہ کا پورا سرمایہ تھا یا بڑے حصے دار تھے۔ کچھ مدت کے لیے یہ لوگ مالک یا حصہ دار رہے۔ اور پھر یہ سلسلے منقطع ہوگئے۔ یہ لوگ تجارتی ذہن، مزاج اور سوجھ بوجھ نہیں رکھتے تھے۔ اُمرا صرف خرچ کرنا جانتے تھے۔ نہ جانے کتنی دولت ٹھکانے لگ گئی ہوگی۔ بیٹنی جماعت کے ایک فرد میاں جمال الدین نے سورت میں کاغذ کا کارخانہ قائم کیا تھا۔ بیٹنی جماعت ایک تاجر جماعت ہے۔ ہندوستان اور اس سے باہر ان کے بڑے بڑے تجارتی سلسلے قائم ہیں۔ میاں جمال الدین کے خاندان میں آج بھی لوگ موجود ہیں اور کاغذ کے بڑے مشہور تاجر ہیں۔ بیٹنی جماعت کے لوگ عموماً تجارت پیشہ ہیں۔ ان میں سے بعض جاوا، سماترا، برما، مورشیس جدہ وغیرہ میں تجارت کرتے ہیں۔ اور بعض خاندان ہندوستان میں اس میدان میں رواں دواں ہیں۔ بیٹنی جماعت کے کرانی، میاں عثمان کاغذی، نرپاوالا، منیار، حوا، ولی اللہ وغیرہ خاندانوں میں سے بعض گذشتہ دور میں گذرے ہیں۔ اور بعض موجودہ دور میں تجارت میں اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ غرض ۱۹۰۰ء تک سورت میں دھن برستا تھا۔ بیوپار روزگار میں بعض بگڑے بھی اور بعض بن بھی گئے۔ مہنگائی بھی بڑھتی گئی اور اس وجہ سے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ کمانے کی فکر لاحق رہی۔ ملازمت پیشہ اور تجارت پیشہ لوگ تو پھر بھی اچھے رہے مگر گرانی کی وجہ سے امیر طبقہ جس کی آمدنی کے ذرائع محدود تھے۔ ان کی وضعداری کو بہت صدمہ پہنچا۔ اپنی وضعداری قائم

رکھنے کے تصور نے انھیں پشت در پشت مقروض رکھا۔

سورت میں مختلف مذاہب اور فرقوں کے لوگ بستے ہیں۔ ہندو، پارسی، عیسائی، مسلمان سبھی عہدِ قدیم میں بھی تھے اور آج بھی ہیں۔

لکم دینکم پر عمل تھا۔ سترھویں اور اٹھارہویں صدی میں نامی گرامی صوفیوں، قاضیوں، مفتیوں، عالموں کے نام ملتے ہیں۔ ان کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ ان دو صدیوں میں سورت میں مذہبی ماحول نہایت خوشگوار تھا۔ حضرت سید جمال الدین عرف دانا صاحب اور حضرت شیخ سید العیدروس رفاعی کی خانقاہیں اور مدارس دینی و دنیوی علوم اور رشد وہدایت کے بڑے مرکز تھے۔ اس عہد میں خانقاہوں کو کئی حیثیتوں سے اہمیت حاصل تھی۔ ان کے صدر نشین صرف مذہبی رہبر ہی نہیں تھے۔ بلکہ تبلیغ اسلام اور تصوفی نظام کے علاوہ سیاست، سماج عدل وانصاف وغیرہ بھی شعبوں میں ان کے احکام و فرمان سر آنکھوں پر لیے جاتے تھے۔ امرا و رؤسا ان لوگوں سے ڈرتے تھے۔ فقیری میں شاہی تھی۔

انیسویں صدی بلکہ اس کے کچھ پہلے ہی سے مسلمان دورِ زوال کے جنگل میں پھنس چکے تھے۔ مذہب، سماج، علم وادب ہر ایک شعبۂ حیات میں صحیح روح (اسپرٹ) عنقا ہو چکی تھی۔ غلط تصورات قائم ہو گئے تھے۔ تہذیبی رسوم وروایات کو اسلام کہا جاتا تھا۔ مذہب نذر و نیاز میں سمٹ کر رہ گیا تھا۔ اسی کو راہِ نجات اور ذریعۂ بخشش سمجھ لیا گیا تھا۔ خانقاہیں سونی پڑی تھیں۔ یا پھر تعویذ گنڈوں اور جھاڑ پھونک کی دکانیں بن کر رہ گئی تھیں۔ صوفیاء وامراکے خاندانوں میں آپس میں شادی بیاہ کے رشتے ناطے ہونے کی وجہ سے صوفی خان دانوں میں فقر و فنا کی بجائے دنیوی شاہی وبقا کا تصور کار فرما تھا۔ عجز وانکسار غرور وتمکنت سے بدل گیا تھا۔ صوفی خاندانوں کے بزرگوں کو انگریزوں نے انعام واکرام اور خطابات دے کر اپنے ایجنٹ بنا لیے تھے۔ اسلاف کے خانقہی طریقوں کو مذہبی تقاریب میں رسماً ضرور برتا جاتا تھا۔ مگر تقاریب کے آداب وروایات میں فقر کی جگہ شان امارت اور جاہ وثروت کا مظاہرہ ہوتا تھا۔

کا زور نہ تھا۔ مگر قدیم دور میں اگر کوئی متعصّب یا عہدیدار شیعہ آجاتا تو سنیوں کو نہ بخشتا۔ حیدر قلی خاں متعصّب ۱۷۱۵ء نے ملّا محمد علی کی جائداد ضبط کر لی تھی۔ اس نے بعض مذہبی مسائل کے اختلاف پر شیخ خاندان کے بزرگوں کو پریشان کیا تھا۔ اہل سنّت والجماعت نے بعض امور میں شیعوں کے طریقے اختیار کر لیے تھے۔ سورت میں امام باڑہ تو ایک ہی تھا مگر دیکھا جائے تو ہر گھر ایک امام باڑہ تھا۔ تعزیہ داری، سوانگ، ماتم و سوز خوانی، شربت و شیرینی حسینؑ کے نام پر فقیری میں جوشِ عقیدت کا اظہار کیا جاتا تھا۔ غریبوں نے دکھوں سے نجات اور مرادوں کے حصول کے لیے اللہ کو بھول کر حسینؑ سے مانگنے کے طریقے بنا لیے تھے۔ اور امراء میں غم و اندوہ میں بھی دادِ عیش کے عجیب مقدس طریقے نکال لیے تھے۔ نہ کسی کو غمِ حسین تھا نہ دل میں احترام بلندیٔ کردار حسین تھا۔ یہ دراصل فراریت تھی۔

امرا کے ہاں روز و شب محفل رقص و سرود ہوتی تھی۔ مگر محرم کے دس روز چونکہ میراثی احتراماً گانا بجانا بند رکھتے تھے۔ لہٰذا ان دس بارہ دنوں میں اُمراء کے ہاں سوز خوانی کی مجالس ہوتیں۔ ایک طرف طوائفوں کی بن آتی اور دوسری طرف اہل جاہ و ثروت فردوسِ گوش اور جنتِ نظر سے محروم بھی نہ رہتے۔ اس دور میں سورت میں طوائفوں کا بول بالا تھا۔ گویا وہ گجرات کا لکھنؤ تھا۔ اُمرا کی جیبیں خالی ہوتیں اور اربابِ نشاط کے دامن بھرتے۔ طوائفیں اپنا ایک چھوٹا سا کہنا چاہیئے برائے نام تعزیہ بنواتیں۔ عاشورہ کے روز سہ پہر کو یہ تعزیہ صرف چکلہ کے گرد گشت کے لیے نکالا جاتا۔ اس وقت بڑی بھیڑ بھاڑ ہوتی تھی۔ شہر کے رنگین مزاج، بانکے اور امرا بھی جمع ہو جاتے۔ تعزیہ کے پیچھے طوائفوں کا غول ہوتا جو حسینی فقیروں کا روپ کچھ اس طرح دھارتیں کہ سبز پریاں دکھائی دیتیں۔ طوائفیں سوز پڑھتی ہوئی تعزیہ کے ساتھ چلتی جاتیں۔ اور امیر خان والوں کے رنگین مزاج طوائفوں کو حلقہ کیے ہوئے چلتے۔ ان کے اردگرد دوسرے تماشبین ہوتے۔ مختصر سا فاصلہ طے کرنے میں دو تین گھنٹے گذر جاتے۔ امراء طوائفوں کے کوٹھوں پر جاتے۔ اس کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ تخصیص یہ تھی کہ ان کی موجودگی میں ایسے ویسے کی مجال نہ تھی کہ طوائف کے کوٹھے کا زینہ بھی چڑھ جائے مگر بیسویں صدی کے آغاز کے کچھ ہی پہلے سے امیروں کی جیبیں خالی ہو چکی تھیں لہٰذا نو دولتیوں نے ان کی جگہ لے لی۔

محرم میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں دودھ کا شربت نہ بنتا ہو۔ آداب یہ تھے کہ مٹکیاں کوری ہوں۔ دودھ کو گرم نہ کیا جائے۔ مٹکیوں پر پھول کے ہار ڈالے جاتے۔ اس نیاز میں ریوڑیاں، لوٹے، سیلی کا ہونا ضروری تھا۔ سبز کپڑے پہنے جاتے۔ سیلیاں گلے میں ڈالی جاتیں۔ گھر گھر حصّے بخرے بڑے اہتمام سے بھیجے جاتے۔ ہونے والے دولہا دلہن کے لیے طرفین سے فقیری (سبز کپڑے، سیلی، شربت وغیرہ) بھیجے جاتے۔

سورت کے تعزیے صنعت کے اچھے نمونے ہوا کرتے تھے۔ عاشورہ کے دن جب تعزیوں کو کربلا لے جایا جاتا تب سڑکوں پر میلا لگ جاتا۔ ہندو مسلمان سب برابر کے شریک ہوتے۔ ہندو اپنے عقیدے اور تصوّر کے مطابق تعزیوں پر ناریل چڑھاتے۔ تعزیوں کے مجاوران کے ماتھے پر بخور کی راکھ سے چندن کرتے اور چراغی وصول کرتے۔ تعزیوں کو اٹھانے کے لیے ڈھیڑ چمار مزدور اجرت پر رکھے جاتے اور مختلف امیروں کے گھروں پر تعزیے لے جاتے جہاں سے انھیں نیاز کے لیے پیسے ملتے۔ عاشورہ کے دن تعزیوں کے پہلے سوانگ ہوتے۔ جوگی جوگن کے گروہ ہوتے۔ دوسرا گروہ کبیر کا ہوتا۔ ایک شخص بھینسے پر سوار ہو کر اپنے کو کبیر کہلواتا۔ ایک گروہ میں ایک شخص ننگ دھڑنگ بھبھوت لگائے گھوڑے پر سوار ہوتا۔ یہ لوگ عجیب عجیب خرافات بکتے جاتے۔ ان کے ساتھ ساتھ ماتم پڑھنے والوں کی ٹولیاں ہوتیں۔ استادوں کے الگ الگ گروہ ہوتے۔ ان میں شعری مقابلے کی بھی ٹھن جاتی۔ جلوس میں نقشبند شمعیں ہاتھ میں لیے ہوئے سوز پڑھتے جاتے، رسّی بٹوے ہوتے ایک طرف امام قاسم کی سواریاں نکلتیں۔ مختلف ٹھانکوں (سواریاں بٹھلانے کے مقامات) پر سے ہوتی ہوئی کربلا جاتیں۔ امام باڑہ سے علم نکلتے اور بڑے سلیقے سے لے جائے جاتے۔ غرض یہ ہنگامہ رات کو ختم ہوتا۔

نذر و نیاز کے بہت موقعے آتے ہیں۔ ان میں رجب کے کونڈے کی نیاز بہت اہتمام سے گھر گھر منائی جاتی تھی۔ امیر و غریب بھی یہ نیاز کرتے تھے مگر امیروں کے ہاں تو دو دو من بالائی سے کونڈے بھرے جاتے تھے (سورت کی بالائی اور برفی مشہور ہے) بزرگان دین کے عرس آج بھی منائے جاتے ہیں جن میں طوائف یا قوّال کا ہونا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اگلے وقتوں میں جلوس کے ساتھ نوبت نقارہ اور اکھاڑہ کے علاوہ قوّال بھی ہوتے جو راستے

میں جگہ جگہ نعتیہ کلام سناتے جاتے۔ غرض مقدس تقریبوں کو بھی تفریحی رنگ دے دیا گیا تھا جو آج بھی موجود ہے۔ نذر و نیاز، منت مراد، صندل عرس، مرثیہ ماتم وغیرہ کو تہذیبی تقاریب کہنے میں مضائقہ نہیں لیکن انہی باتوں کو دین و مذہب تصور کر لیا گیا ہے۔

سورت گجرات کا لکھنؤ تھا۔ اس شہر پر مغلیہ تہذیب کا گہرا اثر رہا ہے۔ مشائخ اور عرب تاجروں کی وجہ سے سورت میں اسلامی تہذیب کا بھی ایک الگ دھارا نمایاں تھا۔ قہوہ عرب تہذیب کا جزو اعظم ہے۔ سورت میں عربوں کی وجہ سے اس کا بہت رواج تھا۔ اب بھی ہے۔ مگر مخصوص خاندانوں میں ہی قہوے کے فنجان کھنکتے سنائی دیتے ہیں مشائخین اور عرب خاندانوں میں اسی سے مہمانوں کی تواضع کی جاتی تھی۔ اور مغلیہ تہذیب کے زیر اثر خاندانوں میں شربت اور پان تواضع کے لوازمات تھے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں عرب تاجروں اور مشائخین کے ایک محلّے سید واڑہ کو ہندو گھنٹی والوں کے نام سے یاد کرتے تھے۔ کیونکہ روزانہ صبح ان کے گھروں اور حویلیوں کی ڈیوڑھیوں میں ان کے حبشی غلام ہاون میں بُن کوٹا کرتے تھے۔ اور قہوے کے لیے یخنی تیار کی جاتی تھی۔ اور دستوں سے کوٹنے کی وجہ سے گھنٹیوں کی آواز آتی تھی۔ ہندو عموماً ان کے محلہ سیّد واڑہ کو گھنٹی والوں کا محلہ کہتے تھے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں مغل اور عرب تہذیب میں یہ امتزاج پیدا ہوا کہ عرب تہذیب والے گھروں میں پہلے میٹھا قہوہ یعنی زعفران سے تیار کیا ہوا گرم قہوہ پلایا جاتا اور بعد میں نمکین کالا قہوہ پیش کیا جاتا۔ اب یہ رہا نہ وہ۔

انیسویں صدی میں سورت میں امرا کے ہاں دولت کی فراوانی تو نہیں تھی۔ مگر وہ لکھ لٹ ضرور تھے۔ سورت کے قلعہ دار اور بخشی نگار میر معین الدین خاں ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ اس وقت نہ جانے اس ولادت کی خوشی میں کتنی دولت صرف کی گئی ہوگی۔ مگر ان کی پہلی سالگرہ پر تقریباً پچاس ہزار روپیہ صرف کیا گیا تھا اور ۱۸۱۵ء میں ان کی رسم بسم اللہ و رسم مکتب کے موقع پر جشن منایا گیا۔ جس میں ایک لاکھ روپیہ صرف کیا گیا اور طرفہ تماشا یہ تھا کہ یہ سب کچھ سیٹھ ساہوکاروں کے بل بوتے پر کیا جاتا تھا۔ میر معین الدین کی جانشین ان کی بیگم فاطمہ تادم مرگ قرض ادا کرتی رہیں۔ لیکن ختم نہ ہوا۔ سورت کے آخری نواب میر افضل الدولہ کی دو صاحبزادیوں

کی نسبت مرزا ہمایوں اور مرزا نجف کے ساتھ قرار پائی تھی۔ یہ شہزادے دہلی سے اپنے والد مرزا کام بخش کے ہمراہ ۱۱۸۲ء میں سورت آئے تھے۔ شہزادوں نے نواب صاحب کی دولت کو بے دریغ اڑانا شروع کیا۔ نواب موصوف نے گھبرا کر شہزادوں کو دہلی روانہ کر دیا۔ ۱۸۳۳ء میں ان صاحبزادیوں کی شادی بڑودہ کے اسلحہ دار سردار میر سرفراز علی کے بیٹوں سید اکبر علی خاں اور میر جعفر علی خاں سے طے پائی۔ اس تقریب میں بھی ہزاروں نہیں لاکھوں روپیہ صرف کیا گیا۔ میر جعفر علی خاں کی صاحبزادیوں کی شادی ۱۸۷۶ء میں سید سعید عالم خاں آف بیلہ اور میر غلام بابا خاں سے بہت تزک و احتشام کے ساتھ رچائی گئی۔ اس تقریب کے موقع پر بری (جو دولہا کے ہاں سے دلہن کے ہاں بھیجی جاتی ہے) کے خوان لے جانے والوں کی قطار تقریباً ایک میل لمبی تھی۔ اس بری میں منوں اور ٹنوں خشک میوہ، شکر، مٹھائیاں تھیں۔ اور سیکڑوں جوڑے اور زیورات وغیرہ تھے۔ ۱۷۹۱ء میں سیدی عبدالکریم خاں اپنے بھائی نواب زنجیرہ سے رنجیدہ ہوکر مرہٹوں کے پاس گئے۔ مرہٹوں نے اپنے سیاسی مفاد کے پیش نظر عبدالکریم خاں کو سورت کے قریب اکیس گاؤں دیکر ایک نئی ریاست قائم کردی۔ یہ سچین ریاست کہلاتی تھی۔ اس ریاست کے نواب بھی لکھ لٹ تھے۔ ۱۸۶۹ء میں نواب عبدالکریم خاں دوم کی وفات کے بعد سال بھر فاتحہ درود پر ایک لاکھ روپیہ خرچ کیا گیا تھا۔ ۱۸۱۴ء میں نواب سیدی عبدالرحمٰن محب کی رسم بسم اللہ پر پچاس ہزار روپیہ صرف ہوا تھا۔ اسی خاندان کے نواب سیدی ابراہیم خاں اخلاص بڑے فیاض نواب گذرے ہیں۔ ان کی داد و دہش زبان زد خاص و عام تھی۔ لیکن اس فیاضی کے نتیجے میں کئی گاؤں رہن کر دیے گئے اور کئی فروخت ہو گئے۔

وہ بھی کیا چین سکون کے دن تھے۔ مشاطہ آتی جاتی۔ پیغام سلام کا سلسلہ شروع ہوتا۔ آخر بات مقرر ہوتی منگنی (نسبت) کی رسم عمل میں آتی۔ سال دو سال کے بعد شادی کی گھڑی دن تاریخ طے پاتی۔ سال بھر ہر تہوار طرفین سے تحفے تحائف بھیجے جاتے۔ تاس، کمخواب، گوٹا کناری بطور خاص بنوائے جاتے۔ دلہن کے جوڑوں کی تیاری کے لیے مہینوں پہلے سے اعزا جمع ہوتے رہتے۔ دن کو کام ہوتا اور رات کو ڈھولک پر تھاپ اور عورتوں کے گیت ہوتے۔ منڈوا باندھنے کا شگون لیا جاتا۔ رسم ادا ہوتی اور تیار ہونے پر بطور شگون طوائف

کا مجرا ہونا۔ شادی کے چار روز قبل گھر کے سامنے چندروا باندھا جاتا۔ چوگھڑیا دیکھ کر ابٹن کی رسم شروع کی جاتی۔ دلہن یا دولہا کو پیلے کپڑے صافہ دوپٹہ وغیرہ پہنا اُڑھا کر چوکی پر بٹھایا جاتا سہاگن کے ہاتھ سے رسم کا افتتاح ہوتا۔ دانہ اسپند اتار کر جلایا جاتا، پانی اُتارا جاتا۔ روپیہ پیسہ بطور نذر اُتارا جاتا۔ شریر لڑکیاں بہنیں وغیرہ اُبٹنہ ملتیں۔ اور چٹکیاں بھی لے لیتیں۔ بڑی بوڑھی عورتیں بلائیں لیتیں۔ گھر کی کنیزیں، پروردہ چھوکریاں، نوکرانیاں دعائیں دیتیں اور خوش بختی وصول کرتیں۔ ڈومنیاں لڑلڑ کر اپنا حق مانگتیں۔ کلائی پر کنگنا باندھا جاتا۔ کمر کے پٹکے میں میان میں خنجر رکھا جاتا تا کہ بلا آسیب وغیرہ سے دولہا محفوظ رہے۔ رسم کے ختم ہونے کے بعد رنگ کھیلنے کا آغاز ہوتا۔ گھر کے حوض رنگ سے بھر دیے جاتے۔ یا پھر دیگوں میں رکھا جاتا گھنٹوں ایک طوفان بدتمیزی رہتا۔ چلیے برات کا دن آگیا۔ دولہا نے غسل کیا۔ چست پاجامہ کرتا پہنا۔ کمخواب کی شیروانی زیب تن کی۔ گلے میں مروارید الماس وغیرہ کے ہار کنٹھے ڈالے گئے۔ ہاتھ پر بازوبند نورتن امام ضامن باندھا گیا۔ پاؤں میں زری کی سلیم شاہی جوتی، سر پر صافہ یا مندیل اس پر پھولوں کا سہرا۔ اور سہرے پر سونے کے تاروں کا سہرا باندھا گیا اور ہاتھ میں نخلہ دے کر دولہا کو گھوڑے پر سوار کیا گیا۔ شب گشت ترتیب دیا گیا۔ سب سے پہلے شہنائی نوازوں کے بعد رسالہ، رسالے کے بعد کوتل گھوڑے اور شہ بالے۔ براس بینڈ تخت رواں کبھی ہوا کبھی نہ ہوا۔ براتیوں کا ہجوم ہے۔ جو حسب مراتب چل رہے ہیں۔ براتیوں کے پیچھے نوشہ کا گھوڑا۔ گھوڑے کے ساتھ اس کے دوست احباب، محافظ، نگہبان وغیرہ ہیں۔ دولہا پر سے سونے چاندی کے پھول اور چاندی سونے کے سکے نچھاور کیے جا رہے ہیں۔ فقیروں کا غل مچا ہوا ہے۔ راستہ میں جگہ جگہ آتش بازی کا انتظام ہے۔

اللہ اللہ کر کے رات کے دو بجے شب گشت (برات) دلہن کے گھر پہنچتا ہے۔ منڈوے سے دس بیس گز کے فاصلے پر سب رُک جاتے ہیں۔ دلہن کی طرف کے بزرگ براتیوں کے استقبال کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ براتی منڈوے میں جاتے ہیں۔ اور دولہا کا گھوڑا ڈیوڑھی پر لے جایا جاتا ہے۔ دلہن کا چھوٹا بھائی شربت لاتا ہے جس کو بیر گڑی کا شربت کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد دولہا کو گود میں اٹھا کر منڈوے میں لے جا کر مسند پر بٹھایا جاتا

ہے۔ ادھر سمدھنوں کی سواریاں اُترنے لگیں۔ ان کی مجلس بہت شاندار ہے۔ جب سب سمدھنیں آگئیں۔ تو شربت خوری شروع ہوتی ہے۔ دلہن والیاں۔ جوان جوان بہو بیٹیاں زرق برق لباس پہنے ہوئے ہیں۔ ہاتھوں میں پھولوں کی چھڑیاں ہیں۔ شربت پلاتی جاتی ہیں۔ چھڑلویں سے ماری جاتی ہیں۔ فقرے کسے جاتی ہیں۔ فرق مراتب کا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ بزرگوں سے بزرگ چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں اور جوانوں سے جوان۔ دو تین گھنٹے یہ سلسلہ رہتا ہے اس کے بعد بڑی بوڑھیاں چلی جاتی ہیں۔ اور جوان وہیں ٹھہر جاتی ہیں۔ ادھر قاضی صاحب نے ایجاب و قبول کرایا۔ چھوارے لٹائے گئے اور شربت شروع ہوگیا۔ بچے زرق برق لباس پہنے ہوئے مجلس میں فنجان بھر بھر کر سلیقے سے دیتے جاتے ہیں۔ شربت خوری کا سلسلہ ختم ہوتے ہی طوائفوں کا غول کا غول منڈوے میں آتا ہے۔ محفل رقص و سرود گرم ہوتی ہے۔ خوبصورت تان ہو یا پھڑکتا ہو۔ شعر ہو مگر آداب مجلس کے خلاف ہوتا کہ واہ بھی منھ سے نکل جائے۔ صبح ہوتے ہوتے بھیرویں کی تانوں نے نیند کے ماتوں کو بھی تازہ دم کر دیا۔ طوائفوں نے کہرواکھیلا۔ آٹھ بج چکے ہیں۔ دولہا کو جلوے کے لیے لے جایا جاتا ہے منڈوے اور ڈیوڑھی کے درمیان بیس گز کا فاصلہ ہے مگر طوائفیں قدم قدم پر ایک ایک غزل سناتی ہیں۔ اور سینکڑوں روپیہ بیل (روپیہ جو گانے والی کو دیا جاتا ہے) اٹھالیتی ہیں۔ آخر دولہا کو اوپر پہنچایا جاتا ہے۔ دولہا عورتوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ ان کی بہنیں ان کے سر پہ آنچل ڈالے ہوئے ہیں۔ دلہن کی بہنیں دلہن کے سر پہ آنچل ڈالے ہوئے ہیں۔ ہنسی مذاق ہوتا ہے۔ فقرے کسے جاتے ہیں۔ درمیان میں آرسی رکھ کر سورہ اخلاص پڑھائی جاتی ہے۔ دولہا صرف ایک جھلک دیکھ لیتے ہیں۔ آرسی مصحف تک نہ جانے کتنے حق سالیوں کے ادا کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے بعد بداع گری (وداع) کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ دولہا گھوڑے پر سوار ہے۔ اس کے ساتھ براتی ہیں۔ پیچھے دلہن کا میانہ ہے۔ اس کے ساتھ کنیزیں محافظ وغیرہ ہیں۔ اور سب سے آخر میں کھانے کی دیگیں ہیں۔ ابھی شادی کا ہنگامہ ختم نہیں ہوا ہے۔ کئی دن کے بعد چوتھی کی تقریب ہوتی ہے۔ کنگنے کھولے جاتے ہیں۔ وہی چھڑلویں سے مار پٹائی ہوتی ہے۔ بھائی بہنوں، نوکر چاکر سب کے حق ادا کیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد چار جمعہ دلہن والے دولہا کو اس کے احباب کے ساتھ دعوت دے کر کھانا کھلاتے ہیں۔

اس کو "جماگی" کہتے ہیں.

سورت میں ہندوؤں کے ہاں بھی شادیاں بڑے تکلف سے منائی جاتی تھیں. پچاس سال قبل صرف منڈوے کی آراستگی پر پچاس پچاس ہزار روپیہ خرچ کرتے تھے. دولہا اور دلہن ہاتھی پر سوار کیے جاتے. برات میں شہ بالوں کو زرق برق لباس اور ہزاروں روپیہ کا زیور پہنا کر بگیوں میں بٹھایا جاتا. ان کے ہاں رسالہ نہ ہوتا تھا لہذا اس کا نعم البدل یہ تھا بلکہ آج بھی ہے. مزدور پیشہ لڑکوں کو خاص قسم کا یونیفارم پہنایا جاتا ہے. ان کے ہاتھوں میں بھالے جھنڈے دیے جاتے ہیں. گویا سپاہیوں کا رسالہ ہے. ایسے رسالے کرایے پر ملتے ہیں پر اس بینڈ، شہنائی نواز کے ایک نہیں کئی کئی زمرے برات میں ہوتے تھے.

یہ تو تھیں خوشی کی تقریبیں. لیکن غم واندوہ کے موقع پر بھی اصحاب جاہ وثروت اپنی شان امارت دکھلانے سے کبھی نہ چوکتے. جنازے پر قیمتی زربفت کا دوشالہ ڈالا جاتا. اس پر پھولوں کی چادر ہوتی. جنازے پر شامیانہ کا ہونا بھی ضروری سمجھا جاتا. تیجے کے دن رسماً قرآن خوانی یا وعظ ہوتا اور اس کے بعد مردانہ اور زنانہ دو جگہ مجلسوں میں سوگ اٹھائی کی رسم ادا کی جاتی. مردانہ میں نقدی کے علاوہ سوگ اٹھائی میں شالیں دی جاتیں اور زنانہ میں بڑی پر تکلف مجلس ہوتی. جس میں نقد کے علاوہ جوان بہو بیٹیوں عزیزوں کے لیے رنگین دوپٹوں پر کناری گوٹے لپیٹ کر دوسرے اعزا چڑھاوے لاتے. ایک ایک گھر سے دس دس بیس بیس دوپٹے آتے اور مجلس میں سب کو سلیقے سے دیے جاتے. تیجے کے دن بڑی شاندار دعوتِ طعام ہوتی. جس میں بریانی کا ہونا ضروری تھا. فاتحوں کا سلسلہ سال بھر رہتا جن میں چہلم سہ ماہی، ششماہی، بیوہ کے لیے ساڑھے چارماہی پر کھانے کی دعوتوں کا اہتمام کیا جاتا. ساڑھے چارماہی کی رسم کے بعد قریبی رشتہ دار بیوہ کی دعوت کرتے اور یہ سلسلہ دنوں تک رہتا. ایک دفعہ مرحوم پروفیسر ابراہیم ڈار صاحب نے برسبیل تذکرہ مجھ سے کہا. سنا ہے کہ اہلِ سورت کو مرنے والے کا غم حقیقی معنوں میں نہیں ہوتا. میں نے ازروئے مزاح جواب دیا کہ "اس بات میں اہل سورت اسلامی احکام کے پابند ہیں. تیجے کے دن بریانی کھا کھلا کر غم غلط کر لیتے ہیں. اہلِ گجرات تجارت پیشہ ہیں. انھیں مرنے والے کا

غم کم ہوتا ہے۔ دولت کے ہاتھ سے نکل جانے اور تجارت میں خسارے کا رنج زیادہ ہوتا ہے
سورت میں سماجی و تہذیبی عیش و عشرت کی ایک یادگار عیدین کی سواری تھی۔ نواب صاحب نماز عید کے لیے عیدگاہ بڑے کرّ و فر سے جایا کرتے تھے۔ محل سے ایک جلوس نکلتا تھا۔ اس میں ہاتھی گھوڑے، نشان، علم تمام ماہی مراتب ہوتے۔ پانچ چھ ہزار کا فوجی دستہ بھی ساتھ ہوتا۔ شہر قاضی کی پالکی اور اس کے پیچھے امرا کی پالکیاں ہوتیں۔ نواب صاحب خود ہاتھی پر سوار ہوتے۔ سب سے آخر میں پکے پکائے کھانے کی دیگیں چھکڑوں میں ہوتیں غربا و مساکین کو راستہ بھر کھانا تقسیم ہوتا۔ اور سیم و زر بھی خیرات کیا جاتا۔ اس جلوس کو عیدگاہ پہنچنے میں دو گھنٹے لگ جاتے۔ نماز کے بعد اسی طرح لوٹتے۔ اس کو عید کی سواری کہا جاتا تھا۔ سواری کا یہ سلسلہ ۱۹۴۰ء تک قائم رہا۔ بیسویں صدی کے آغاز سے سواری کی شان و شوکت میں بہت فرق آگیا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں نواب میر حفیظ الدین نے یہ سلسلہ ختم کر دیا اور عام مسلمانوں کی طرح عیدگاہ جایا کرتے تھے۔
ہندو قوم میں بیداری کی لہر بہت پہلے سے کارفرما تھی۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں اس بیداری کا سورت میں اثر نمایاں تھا۔ آچاریہ نرسینھ اور کوی نرمد جیسے زبردست مصلح و مشیر میدان عمل میں دوڑ دھوپ کرتے نظر آتے تھے۔ ان کی جدوجہد سے لوگ تیزی سے مذہبی اور سماجی ادبی اصلاحوں کی طرف راغب ہوئے۔ نرمد اس دور کا ترقی پسند شاعر و نثر نگار تھا۔ اس نے بیوہ کے نکاح، چھوت چھات اور مذہبی پیشواؤں کی اجارہ داری کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ اس کی جنبش قلم سے ادب و سماج میں نئے رجحانات و تصورات منظر عام پر آئے۔ اسی عہد میں پرارتھنا سماج، آریہ سماج وغیرہ کا قیام عمل میں آیا۔
مسلمانوں نے جہاں کہیں فتح و نصرت کا ڈنکا بجایا اور اپنے اقتدار کا پرچم لہرایا وہاں صرف چمن بندی کر کے نوارے ہی نہیں اڑائے بلکہ علم و ادب کے گلزاروں کو بھی آراستہ کیا۔ علم و ادب کی سرپرستی میں ان کے لیے کبھی دورائیں نہیں ہو سکتیں۔ سلاطین گجرات بھی علم و ادب کے بارے میں خصوصی اعزاز کے مالک ہیں۔ سورت ان کی قلمرو میں رہا ہے۔ لہٰذا ان کے دور حکومت میں اور مغلوں کے دور میں سورت علماء و فضلا سے خالی نہیں تھا۔ سترھویں

اور اٹھارہویں صدی کے علماء میں سے چند نام پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ اس دور میں سید عبدالوہاب بخاری صاحب ۱۶۰۵ء اور ان کا خاندان خواجہ بہادر صاحب ۱۶۰۷ء خواجہ جمال الدین عرف خواجہ دانا صاحب ۱۶۰۷ء اور ان کا خاندان حضرت سید شیخ العیدروس صاحب ۱۶۲۱ء اور ان کا خاندان سید عبدالحق صاحب ۱۶۸۶ء شیخ حسن جی صاحب ۱۶۵۲ء سید فتح اللہ جیلانی صاحب ۱۶۵۵ء سید علی واعظ ۱۷۳۵ء حضرت سید سعداللہ ۱۷۲۵ء پدر میر ولی عزلت مولانا خیرالدین محدث صاحب ۱۷۹۱ء حضرت ولی اللہ صاحب ۱۷۹۳ء میر عبداللہ تجرد صاحب ۱۷۹۲ء وغیرہ ایسے عالم گزرے ہیں جو اپنے علم و فضل کی وجہ سے دور دور تک شہرت رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ مفتیوں اور قاضیوں کے نام بھی ملتے ہیں۔ جو علیم دینی میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ سورت میں ایک محلّہ تو ایسا تھا جہاں سے علماء کی باون پالکیاں نکلتی تھیں۔ اس دور کی علمی ادبی مجلسوں میں معمولی عالموں کو تو باریابی بھی حاصل نہ ہوتی تھی۔ سورت کے علمی مدارس میں عیدروس خاندان کا مدرسہ مرجان شامی کا مدرسہ اور خواجہ دانا صاحب کا مدرسہ علم و ادب کا چراغ تادیر روشن رہنے کے لیے خصوصیت رکھتے ہیں۔ انیسویں صدی میں بھی علماء کثیر تعداد میں موجود تھے۔ مثلاً مولوی کرم اللہ شاہجہاں آبادی ۱۸۲۹ء شیخ شریف عیدروس ۱۸۵۱ء باعکظہ خاندان کے معلّم ابراہیم ۱۸۶۵ء ان کے بیٹے شیخ علی ۱۸۵۲ء شیخ عبدالمجید باعکظہ ۱۸۹۱ء قاضی غلام علی ۱۸۴۲ء قاضی سید اخی (برادر غلام بابا) سید غیاث الدین ۱۸۵۹ء سید صالح واعظ قادری ان کے بیٹے سید نظام الدین قادری واعظ ۱۸۷۶ء خوب میاں صاحب، منشی عبدالحکیم، مولوی محمود، مولوی کاظم، مولوی برکت اللہ وغیرہ علوم عقلی و نقلی میں اونچا درجہ رکھتے تھے۔ مگر اہل سورت علم کے زیور سے محروم پائے جاتے ہیں۔

اس بے توجہی اور محرومی کا ایک سبب یہ تھا کہ اس دور خلفشار میں اقتصادی حالت خراب ہونے کی وجہ سے لوگ فکر معاش میں سرگرداں تھے۔ امرا تہی دست ہو چکے تھے اور داد عیش دینے میں بھی مصروف تھے۔ علوم و فنون کی سرپرستی میں کمی ہو رہی تھی (اردو شاعری کو چھوڑ کر) دوسرا سبب یہ تھا کہ جدید طرز کی تعلیم کا چرچا بڑھ رہا تھا۔ حالانکہ جدید تعلیم کے میدان

میں بھی یہ خال خال ہی نظر آتے تھے۔ سورت میں جدید طرز تعلیم کا سلسلہ ۱۸۲۶ء سے شروع ہو چکا تھا اور ۱۸۸۵ء تک ۷۰ سے ۷۵ اسکول قائم ہو چکے تھے۔ ہندو دھنیوں نے خانگی اسکول بھی قائم کر دیے تھے۔ آئرلیش پریس بیٹرین مشن والوں نے ۱۸۴۲ء میں سب سے پہلا ثانوی اسکول قائم کیا تھا۔ ۱۸۷۰ء تا ۱۸۹۰ء لڑکیوں کے لیے بھی اسکول کھول دیے گئے تھے۔ ۱۸۸۵ء میں چونی لال شاہ نے دی انگلش ہائی اسکول کے نام سے ایک اسکول قائم کیا تھا۔ اسی کی بنیاد پر سارونجنک ایجوکیشن سوسائٹی قائم کی گئی۔ جو موجودہ دور میں کئی اسکول اور کئی کالج بہ حسن و خوبی چلا رہی ہے ۱۸۹۸ء میں یونین ہائی اسکول ایک اور سوسائٹی نے قائم کیا۔ ان کے علاوہ ایسے بھی اسکول تھے، جہاں صرف بہی کھاتا اور تجارت سے تعلق رکھنے والی ضروری باتیں سکھلائی جاتی تھیں۔ ان تمام اسکولوں میں ہندو طلبا تعلیم پاتے تھے یا پھر پارسی۔

جہاں تک بدنصیب مسلمانوں کا تعلق ہے۔ نہ ان کا کوئی اسکول تھا اور نہ وہ تعلیم کی طرف رغبت رکھتے تھے۔ مفلس پیٹ بھر کھانے کی فکر میں رہتے اور امرا کے ہاں ابھی دورِ تعیش کا خمار باقی تھا اور پھر وہ نادار بھی ہو چکے تھے۔ چند گنے چنے خاندانوں کے بچے انگریزی اسکولوں میں تعلیم پا لیتے تھے۔ وہ بھی میٹرک کی منزل سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ۱۸۷۵ء کے بعد پرائمری اسکولوں میں غریب بچوں کے لیے فیس کی معافی کا کچھ انتظام کیا گیا تو مسلمان بچے پرائمری اسکولوں میں نظر آنے لگے۔ سورت میں مسلمانوں پر جمود طاری تھا۔ اور رہبری کا فقدان تھا۔ اس صدی کے بالکل آخری سالوں میں کچھ حرکت بابرکت نظر آئی۔ ۱۹۰۱ء میں سورت میں مسلم ایجوکیشن کانفرنس کا اجلاس منعقد کیا گیا۔ اگرچہ عملی طور پر اس کانفرنس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا مگر اس اجتماع سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ مسلمان اپنی نئی پود کے مستقبل پر غور کرنے لگے اور یہ تصور دلوں پر نقش ہونے لگا کہ فرد ہو یا قوم دونوں کی بقا و بہبود کا راز حصولِ تعلیم میں مضمر ہے۔ اس طرح کانفرنس کے اجتماع کا مقصد ضرور پورا ہوا۔

جہاں تک اردو کا تعلق ہے۔ انیسویں صدی میں سورت شعر و سخن کے لیے خصوصیت رکھتا ہے۔ سترھویں صدی کے نصف آخر میں گجرات نے اردو کا مجتہد العصر شاعر ولی پیدا کیا

جو پورے ہندوستان کے لیے استاد ریختہ کا درجہ رکھتا تھا۔ اٹھارہویں صدی میں دوسرا استاد شاعر میر عبدالولی عزلت گذرا ہے۔ یہ صف اوّل کے شعرا میں سے تھا۔ سورت کو عزلت کا وطن ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ان کے والد مولانا سعداللہ نے سورت میں مستقل اقامت اختیار کرلی تھی۔ مولانا موصوف جید عالم تھے۔ عالمگیر ان کو عزت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس سے ان کی خط و کتابت تھی۔ عزلت ۱۶۹۲ء میں پیدا ہوئے اور ان کا سنہ وفات ۱۷۷۵ء ہے۔

انیسویں صدی میں سورت میں شعر و سخن کے چرچے کا سبب امرا کی دلچسپی اور سرپرستی تھا۔ نواب میر غلام بابا ۱۸۹۳ء علم و ادب کے سرپرست تھے۔ خود عالم تھے اور علماء، واقفیا کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے منشی میاں داد خاں سیاح شاگرد غالب غلام بابا خاں کے دربار سے منسلک تھے۔ انھیں کے توسط سے میر غلام بابا غالب کے حلقۂ احباب میں شامل ہوئے تھے۔ غلام بابا خاں کے منشی نول کشور سے بھی دوستانہ تعلقات تھے۔ نولکشور ۱۸۷۱ء میں سورت بھی آئے تھے۔ اور انھیں کے مہمان تھے۔ غلام بابا کے دربار سے کئی دوسرے شعرا بھی منسلک تھے۔ یہ صاحب نے غزالی کی کیمیائے سعادت کا اردو ترجمہ بھی کروایا تھا۔

اردو کا دوسرا سرپرست خاندان سچین کا نواب خاندان تھا۔ اس خاندان میں کریم، محب اخلاص، غنی اچھے شاعر گزرے ہیں۔ محب نے بدر منیر کا فارسی میں منظوم ترجمہ کیا تھا۔ ہر ہفتہ ان کے ہاں محفل مشاعرہ منعقد ہوتی تھی جس میں سورت کے شعراء شرکت کرتے تھے۔ اخلاص کا دربار شعراء سے بھرا رہتا تھا۔ جرأت کے شاگرد میاں ہجو اس سرکار سے ایک مدت تک منسلک رہے۔ میاں سمجھو سورتی سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔ اور غنی کے میاں داد خاں سیاح سے مراسم تھے۔

سورت میں عمدۃ التجار شیخ فاضل کا خاندان علم و ادب اور اس کی سرپرستی کے لیے خصوصیت رکھتا تھا۔ ان کا کتب خانہ ایک نادر کتب خانہ تھا جس میں ہزاروں کتابیں تھیں۔ اور جس پر چودہ لاکھ روپیہ خرچ کیا گیا تھا۔ اس خاندان کے بعض افراد صاحب تصنیف گذرے

ہیں۔ اور محمود، بہادر، حامد، بخشش، فاضل ایسے پانچ شاعر ہوئے ہیں۔ عمدۃ التجار ملا عبد الغفور کے خاندان میں بھی ملا فخر الدین مضطر اور ملا قطب الدین قطب اردو فارسی کے شاعر گذرے ہیں۔ ان کے دربار سے بھی کئی شعراء منسلک تھے۔ اس خاندان کے ایک فرد ملا محمد علی مفتیِ شہر کے عہدے پر فائز تھے۔

انیسویں صدی میں سیکڑوں شاعروں کے نام ملتے ہیں۔ ان میں سمجھو اور منظور کا استادوں میں شمار تھا۔ میاں سمجھو مومن سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ یا شاید مومن سے اپنے سفر دہلی کے موقع پر مشورۂ سخن کیا تھا۔ منظور میاں سمجھو کے شاگرد رشید تھے۔ اور استاد کی زندگی ہی میں صفِ اوّل میں جگہ پا چکے تھے۔ میاں سمجھو نے افیون کی تعریف میں ایک مختصر مثنوی لکھی تو منظور نے افیون کی مذمت میں جوابی مثنوی قلم بند کر دی منظور اور سمجھو دونوں غزل گوئی کے لیے شہرت رکھتے تھے۔ منظور نے تین مثنویاں دریا موج ۱۸۸۳ء، جگر سوز ۱۸۸۱ء اور منظور جہانی ۱۸۷۸ء بھی یادگار چھوڑی ہیں۔ منظور کے آتش سے تعلقات تھے۔ آتش نے جگر سوز کی تاریخ تصنیف کہی ہے۔ دریا موج میں تاپتی کے سیلاب اور سیلاب کی وجہ سے شہر کی بدحالی بیان کی گئی ہے۔ جگر سوز اور منظور جہانی بزمیہ مثنویاں ہیں۔ جو سحر البیان اور گلزار نسیم کی بحر میں کہی گئی ہیں۔ غزل گوئی میں شعرائے سورت نے دبستان لکھنؤ کی پیروی کی کوشش کی ہے۔

انیسویں صدی کے آخری ربع میں سر سید احمد خان کی آواز دور دور تک پہنچ چکی تھی۔ اہلِ گجرات ان سے اور ان کے شرکائے کار سے بہت متاثر ہوئے اور ان مصلحین کے مشوروں کو سر آنکھوں پر لیا گیا اور اس کا عملی ثبوت بھی دیا گیا۔ سورت میں سب سے پہلے امراء اکابر نے اصلاحی جدوجہد کا آغاز کیا کیونکہ انھیں میں سے بیشتر زمانے کے ہاتھوں زیادہ مجروح ہوئے تھے۔ ان اکابرین میں سے سید زین العابدین روض، نواب میر ذو الفقار علی نواب عبد الرسول عالم خاں، آف بلیہ، نواب نصر اللہ خاں آف سچین بخشی میر عظیم الدین مولوی عبد القادر باعکظ، شیخ سراج الدین حافظ بہادو والے، ننھو میاں سکرتار (عمدۃ التجار خاندان)، ملا عبد الحئی، عمدۃ التجار خاندان سیٹھ اسماعیل ترادا، میاں عبد الصمد مصری، سید نصیر الدین سورتی جمعدار ملک لکڑے والے وغیرہ نے میدان عمل و اصلاح میں قدم

رکھا۔ سید زین عیدروس سید نصیر الدین سورتی جمعدار، عبدالرحمٰن لکڑے والے وغیرہ نے ۱۸۹۰ء میں انجمن اسلام کے نام سے ایک انجمن قائم کی۔ اس کے اغراض ومقاصد دینی و دنیوی تعلیم، نادار طلباء کی امداد، صنعت و حرفت کی طرف رغبت دلانا، قبیح رسم ورواج کا انسداد، تہذیبی روایات کا تحفظ، اوقاف کی حفاظت و صحیح مصرف و تنظیم وغیرہ تھے۔ مذکورہ اغراض ومقاصد اس عہد کے مخدوش اقتصادی، سماجی، تعلیمی، مذہبی حالات کے غماز ہیں۔ ۱۹۰۱ء میں سورت میں مسلم ایجوکیشن کانفرنس کا اجلاس ہوا جس سے ذہنوں کو تھوڑی بہت تربیت ہوئی ۱۹۱۸ء میں دوبارہ مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے اجلاس کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر چالیس ہزار روپے کی رقم جمع کی گئی۔ اس رقم سے ایک مسلم ہاسپٹل قائم کیا گیا۔ اسی سال اسلام یتیم خانہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے پہلے صدر نواب منظر حسین خاں جبرین نواب حفیظ الدین بن منظر حسین اور ناظم نواب میر مسعود عالم خاں بن نواب رسول عالم خاں آف بیلہ منتخب کیے گئے یتیم خانے کے لیے راندیر کے بوٹا والا سیٹھ نے ایک کثیر رقم بطور چندہ عنایت کی تھی۔ آج یہ تمام ادارے قومی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

غالب کے گجراتی احباب و تلامذہ

گجرات میں سورت، بھڑوچ، بڑودہ اور احمد آباد چار بڑے شہر ایسے ہیں جو مغلوں کے تمدّن اور ان کے زمانے کی تہذیب کے مرکز رہے ہیں۔ یہ وہ مقام ہیں جہاں علم و ادب کا چرچا رہا ہے۔ اور یہاں کے رؤسا نے علوم و فنون کی دل کھول کر سرپرستی کی ہے۔ سورت میں غالب کے احباب میں نواب میر غلام بابا اور شاگردوں میں منشی میاں داد خاں سیّاح کا نام پایا جاتا ہے۔ بھڑوچ میں غالب کے ایک شناسا قاضی سید نورالدین فائق مؤلف تذکرہ شعرائے گجرات تھے۔ اور بڑودہ کے میر ابراہیم علی وفا، میر عالم علی خاں اور حکیم احمد حسن مودودی غالب کے شاگردوں میں سے تھے۔

سیّاح: سیّاح غالب کے بہت محبوب شاگرد تھے۔ اردوئے معلّیٰ میں ان کے نام تیس خط ملتے ہیں۔ سیّاح کے نام جو خطوط پائے جاتے ہیں، ان میں پہلا خط ۱۱ر جون ۱۸۶۰ء کا ہے۔ لیکن اس خط کے لب و لہجہ سے صاف ظاہر ہے کہ آپس میں بہت پہلے سے مراسم قائم ہو چکے تھے۔ بلکہ اس وقت تک استاد و شاگرد کے تعلقات اتنے گہرے ہو چکے تھے کہ اس خط میں غالب سیّاح کو برخوردار لکھتے ہیں۔ غالب اور سیّاح میں بڑے گہرے تعلقات تھے۔ غالب سیّاح کی غزلوں پہ اصلاح دیتے تھے۔

بعض اوقات سیاح اپنے استاد سے بعض الفاظ کے بارے میں بھی دریافت کرتے تھے۔ مگر اس تلمذ کے علاوہ غالبؔ سیاحؔ کو اپنی اولاد کے برابر سمجھتے تھے۔ غالب نے خطوط میں سیاحؔ کو برخوردار، سعادت و اقبال نشاں، عزیز جاں، نور چشم اور کبھی کبھی مذاقاً مولانا سیاحؔ اور بھائی سیف الحق سے خطاب کیا ہے۔ سیاح کو بھی غالبؔ سے فرزندانہ اور نیاز مندانہ عقیدت تھی۔

سیاحؔ کے بعض حالات زندگی سورت کے اُن بزرگوں سے معلوم کیے گئے ہیں جنھیں سیاح سے نیاز حاصل تھا اور ان کی صحبتوں سے مستفید ہونے کا موقع ملا ہے۔ بعض جگہ ہم نے نتیجے مرتب کرنے میں سیاحؔ کے نام غالبؔ کے خطوط سے بھی مدد لی ہے۔

سیاحؔ کا نام میاں داد خاں تھا۔ یہ اورنگ آباد کے ایک معزز اور آسودہ حال خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ والد کا نام عبداللہ خاں تھا۔ ابھی سیاحؔ کے شباب کا آغاز ہی ہوا تھا کہ ان کا خاندان گردش روزگار کا شکار ہوگیا۔ جب دکن انھیں تیرہ و تار نظر آنے لگا تو پندرہ، سترہ سال کی عمر میں قسمت آزمائی کے خیال سے دکن کو خیرباد کہا اور اپنی نامعلوم منزل کے سفر پر چل پڑے۔ اس طرح یہ ۱۸۴۲ء سے ۱۸۴۵ء تک سورت پہنچے اور اسی کو اپنا مستقل مسکن بنا لیا[1]۔

سیاحؔ کی تعلیم و تربیت کے متعلق قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ ان کی ابتدائی تعلیم اورنگ آباد میں گھر ہی پر ہوئی ہوگی۔ اور سورت میں اقامت اختیار کرنے کے بعد اپنی تعلیم مکمل کی ہوگی۔ ۱۸۶۰ء سے سیاحؔ کے حالات کا پتا چلتا ہے۔ سیاحؔ کو سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا۔ اس لیے تخلص بھی اسی کی مناسبت سے اختیار کیا تھا۔ یا ان کے استاد نے انھیں یہ تخلص اختیار کرنے کو کہا۔ مرزا محمد عسکری نے ادبی خطوط غالب میں لکھا ہے کہ سیاح پہلے عشاق تخلص کرتے تھے۔ مگر غالبؔ نے اسے بدل کر سیاحؔ کر دیا[2]۔ خطوط غالب سے ان کے چند سفروں کا پتا چلتا ہے۔ غالبؔ کے انتقال کے بعد بھی انھوں نے شمالی

---

[1] سیاحؔ کے بعض حالات راقم نے اپنے والد بزرگوار سے معلوم کیے ہیں۔ انھیں سیاحؔ سے نیاز حاصل تھا

[2] بزرگوں کا بیان ہے۔ عسکری نے بھی یہی لکھا ہے۔ [3] ادبی خطوط غالب صـ۲۸۱

ہند کا سفر کیا ہے۔ اس کا ذکر آئندہ کیا جائے گا۔ جون ۱۸۶۰ء میں سیاح لکھنؤ کی سیر کر رہے تھے۔ یہاں کا جو حال انھوں نے غالب کو لکھا ہے۔ غالب نے اس پر اظہار تاسف کیا[1] ہے لکھنؤ سے سیاح بنارس پہنچے جہاں سے غالب کو روداد سفر لکھ بھیجی۔ غالب نے اس کے جواب میں سیاح کو ۳۱ دسمبر ۱۸۶۰ء کو خط لکھا تھا۔ جس میں سیر و سیاحت کے حالات لکھتے رہنے کی تلقین کی ہے۔ بنارس سے یہ کلکتہ پہنچے۔ غالب کے ۴ اکتوبر ۱۸۶۱ء کے خط سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ سیاح کلکتہ سے دہلی گئے اور اپنے استاد کی قدمبوسی کے بعد اپریل یا مئی ۱۸۶۲ء میں سورت لوٹے۔ سورت پہنچنے پر غالب نے مبارکباد[2] دی ہے خطوط کے انداز سے ظاہر ہے کہ غالب سے سیاح کی یہ پہلی ملاقات نہیں تھی۔ اس پر ہم آئندہ بحث کریں گے۔

اس سفر سے لوٹنے کے بعد سیاح کی رسائی میر غلام بابا کے دربار میں ہوتی ہے اس امر پر غالب کے ۱۷ جون ۱۸۶۲ء کے خط سے کافی روشنی پڑتی ہے۔ خط کی عبارت یہ ہے:

> "میر غلام[3] بابا خاں واقعی ایسے ہی ہیں جیسا تم لکھتے ہو۔ سیاحت میں دس ہزار آدمی تمہاری نظر سے گزرا ہوگا۔ اس گروہ کثیر میں جو تم ایک شخص کے مداح ہو تو بے شک وہ شخص ہزاروں میں ایک ہے۔ لاریب کیا فرمایش کروں اور کیا تم سے منگاؤں، وہاں کون سی چیز ہے کہ یہاں نہیں"۔

اس خط سے جو نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ سیاح ۸ اپریل یا مئی ۱۸۶۲ء میں سفر سے سورت لوٹنے کے کچھ ہی دنوں کے بعد نواب موصوف کے زمرۂ مصاحبت میں داخل ہوئے۔ سیاح اپنے آقائے ولی نعمت کی خوش خلقی اور لطف و کرم سے اتنے متاثر ہوئے کہ غالب کو اپنے ممدوح کی تعریف لکھ بھیجی۔ غالب نے اس کے جواب میں مذکورہ بالا خط لکھا۔ بزرگوں سے سنا گیا ہے کہ سیاح نواب صاحب کے انتقال تک ان کی مصاحبت میں رہے[4]۔

---

[1] اردوئے معلّٰی رام نرائن لعل ص ۹ [2] سورت کا پہنچنا بہر حال مبارک ہو اردوئے معلّٰی ص ۱۱۲ [3] ایضاً [4] والد مرحوم سے سنا ہے۔

سیاح نے قریب ۳۷ یا ۴۸ سال کی عمر میں شادی کی۔ اس تاخیر کا بڑا سبب سیر و سیاحت کا شوق معلوم ہوتا ہے۔ ۱۸۶۵ء کے بعد سورت کے ایک معزز خاندان کی لڑکی سے عقد کیا اور کئی اولادیں بھی ہوئیں مگر کوئی بچہ زندہ نہ رہا۔ ایک بچے کے انتقال پر غالب نے بھی تعزیت کی ہے[1]۔ سیاح نے آخر عمر میں محلے سید واڑہ کے ایک معزز خاندان کی بچی کو متبنیٰ کر لیا تھا۔ جسے انھوں نے پرورش کیا اور بعد میں محلہ سوداگران کے عبدالرشید خاں نامی ایک شخص سے اس کی شادی کر دی تھی۔

سیاح چونکہ بڑے اچھے خطاط اور فن مصوری کے ماہر تھے۔ انھیں قلب سازی سے دلچسپی ہوگئی تھی۔ گمان غالب ہے کہ عہد جوانی ہی سے یہ اس ہنر میں مشاق تھے۔ کیونکہ سیاحی بغیر زر کے نہیں ہوتی۔ اور اس سلسلۂ مصاحبت سے پہلے بھی سیاح ہندوستان سے باہر ایران اور افریقہ کا سفر کر آئے تھے۔ غرض عرصۂ دراز تک یہ نوٹ بناتے رہے۔ آخر ایک دفعہ ستارہ گردش میں تھا۔ ۱۸۸۴ء یا ۱۸۸۵ء میں سیاح نے حیدر آباد جانے کے لیے بمبئی کے بوری بندر اسٹیشن پر سکینڈ کلاس کا ٹکٹ خریدا اور سو روپے کا نوٹ بھنایا۔ اتفاق سے ان کے بعد بھی کوئی دوسرا مسافر سو روپے کا نوٹ لے کر آیا اور کسی جگہ کا ٹکٹ خریدا۔ چونکہ ایک نمبر کے دو نوٹ یک جا ہو گئے۔ اس لیے فوراً تفتیش شروع ہوگئی۔ سیاح اس وقت جا چکے تھے۔ انھیں حیدر آباد کے اسٹیشن پر گرفتار کر لیا گیا۔ بمبئی میں ان پر مقدمہ چلا گیا۔ اور جرم کے اقبال کے بعد انھیں چار پانچ سال کی سزائے قید ہوگئی۔ خوش قسمتی سے جیل خانے کا جیلر ایک پارسی شخص تھا۔ اس نے سیاح کی علمی لیاقت کی قدر کرتے ہوئے اپنے بچوں کا اتالیق مقرر کر دیا۔ اس لیے جیل خانے میں بھی عیش و آسائش سے گزرنے لگی۔ کچھ عرصے بعد ملکہ وکٹوریا کی جوبلی کا موقع آیا تو سیاح نے ایک مدحیہ قصیدہ لکھا جسے جیلر نے سفارش کے ساتھ

---

[1] "تمہارے یہاں لڑکے کا پیدا ہونا اور اس کا مرجانا معلوم ہو کر مجھ کو بڑا غم ہوا... تم ابھی جوان ہو، حق تعالیٰ تمہیں صبر اور نعم البدل دے۔ والسلام" ۲۵ اگست ۱۸۶۷ء ص ۱۲

حکومت ہند کے پاس بھجدیا۔ اس کے صلے میں زمانۂ حبس میں کئی سال کی کمی کردی گئی۔ (بروایت والد مرحوم) اور سیّاح کو اس طرح ان کے علم و فضل نے روحانی کوفت سے نجات دلائی۔ سیّاح نے قید خانے سے آنے کے بعد بقیہ عمر سورت ہی میں گزار دی۔

سیّاح بہت سرخ و سفید اور حسین و جمیل تھے۔ قد دراز، بدن سڈول اور چہرہ کتابی تھا۔ نتھنوں کے قریب کا حصّہ ذرا پھیلا ہوا تھا۔ ضعیفی میں بھی چہرے سے نور ٹپکتا تھا اور شان و تمکنت اور وقار آشکار تھا۔ دوران گفتگو ہر جملے کو اس قدر آہستہ آہستہ اور ٹھہر ٹھہر کر ادا کرتے تھے، کہ گویا منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ مباحثے میں غصّے کو کبھی قریب نہ آنے دیتے۔ سیّاح کی وضع داری اور نفاست طبع سورت میں ضرب المثل رہی ہے لباس اور عطریات کا انھیں بے حد شوق تھا۔ پانچ ہاتھ کا صافہ ململ کا پیرہن، چھوٹی مُہری کا پاجامہ، انگرکھا اور اس پر جبّہ ان کا لباس تھا۔ وضع داری کے اس قدر سختی سے پابند تھے کہ کسی کو بھی اگر خلاف وضع کپڑے پہنے دیکھتے تو فوراً ٹوک دیتے۔ لباس کے بارے میں ذوق و نفاست کا یہ عالم تھا کہ کپڑے دہلی میں سلواتے تھے۔ راقم کے والد بزرگوار کو سیّاح کے فیض صحبت سے مستفید ہونے کا موقع ملا تھا۔ فرماتے تھے کہ ایک وقت آپ نے سیّاح سے گذارش کی کہ قبلہ سورت میں بھی اچھے درزی موجود ہیں۔ پھر کیا وجہ کہ کپڑے دہلی میں سلوائے جاتے ہیں۔ سیّاح نے فرمایا: اچھا تو ایک پیرہن سلواؤ، دیکھیں کیسا سیتے ہیں" چند روز کے بعد جب سلا ہوا پیرہن حاضر کیا گیا تو اسے غور سے دیکھنے کے بعد کہا:" میاں ہمارا کپڑا بھی خراب ہوا۔ درزی نے کلی کے ٹانکے چھوٹے بڑے کر دیے۔ یکسانی نہیں ہے۔" سیّاح اگر آدھ گھنٹے کے لیے یہاں سے کہیں باہر جاتے تو واپسی پر آدھ گھنٹے جوغہ اور انگرکھے کے شکن استری سے نکالتے۔ ایک مرتبہ پہنے ہوئے لباس کا دوبارہ پہننے کا موقع مہینوں نہ آتا۔ عطریات کے استعمال میں بھی بڑا نفیس ذوق پایا تھا۔ کبھی خلاف موسم کوئی عطر استعمال نہ کرتے۔ جس کسی محلّے سے ان کا گذر ہوتا تو لوگ بغیر دیکھے کہہ دیتے تھے۔ کہ سیّاح راستے سے گزر رہے ہیں۔ اگرچہ آخر عمر میں زمانے کی کج رفتار کے شکار ہو گئے تھے۔ تقدیر میں شکن پڑ چکا تھا۔ مگر کپڑوں پر کبھی شکن گوارا نہ کیا۔ ان کے انتقال کے بعد گھر

میں بے شمار کپڑے اور کم وبیش بیس جوڑ جوتے پائے گئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ سیّاح کو اوائل عمر ہی سے سیاحت کا بے حد شوق تھا۔ ان کی سیاحت کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ان کی سیاحت کی حدود کشمیر سے کنیا کماری اور اٹک سے کٹک تک ہی نہیں تھیں بلکہ افغانستان، برما اور افریقہ بھی ان سے نہ بچے لیطائف غیبی میں ہے۔

" میں نے بعد تحصیل علوم رحمیہ سیاحت اختیار کی۔ بنگالہ، دکن، پنجاب وسط ہند بلاد و قعرا کے کہاں تک نام لوں۔ قلمرو ہند میں سرتا سر پھرا ہوں۔ بلکہ سندھ و کابل و کشمیر و قندھار بھی دیکھ آیا ہوں۔"

سیّاح نے افریقہ و عرب کا سفر عہد جوانی میں یعنی نواب غلام بابا کی مصاحبت سے پہلے ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۰ء تک کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان کے اس عہد کے حالات سے ناواقف ہیں۔

ان کے ایک اور بیان سے بھی ہمارے خیال کی بھی تائید ہوتی ہے۔"سیر سیّاح" میں لکھتے ہیں:۔

"سیر وافی الارض نے دل تماشا گداز کو گدگدایا ادھر جوانی ولولہ جوش ادھر خود کاری جلوہ فروش۔۔ شوق سیر جزائر عرب و عجم نے بے پر۔۔۔ اڑایا۔ ہر جگہ نیا دانہ، نیا پانی قسمت نے عطا فرمایا۔۔۔ اکثر بلاد نامی ملک شرقی و غربی، جنوبی و شمالی ہند واقع ملک دکن و سندھ و پنجاب و بنگالہ وغیرہ زیر پائے سیاحت لایا۔"

مندرجہ بالا اقتباس سے سیّاح کا عرب و عجم اور دیگر ممالک کا سفر کرنا ظاہر ہے اور ہندوستان کا سفر تو کئی مرتبہ کر چکے تھے۔ یہ بھی واضح ہے کہ سیّاح نے ۱۸۶۰ء اور ۱۸۶۱ء میں جو شمالی ہند اور بنگالہ کا سفر کیا تھا۔ وہ خطوط غالب سے ظاہر ہے۔ غالب کے انتقال کے بعد ۱۸۷۰ء میں ایک دفعہ کشمیر جانے کی نیت سے شمالی ہند گئے تھے۔ اس سفر پر انھیں منشی نول کشور نے آمادہ کیا تھا۔ منشی نول کشور سے ان کے ۱۸۶۰ء یا ۱۸۶۱ء سے تعلقات تھے۔ قرین قیاس ہے کہ یہ ملاقات کا زمانہ وہی سفر کا ہے جبکہ لکھنؤ کے حالات

غالب کو لکھے ہیں۔ ان کی تصنیف "سیر سیّاح" ۱۸۷۲ء میں شائع ہوئی، اس میں لکھتے ہیں۔

"آغاز سال ۱۸۷۱ء میں سراپا خلق و مروّت، صاحب محبت و فتوت، احباب نواز اخلاص پرواز، عالی ہمم واکرم، مشہور و معروف روزگار منشی نول کشور مالک مطبع اخبار اودھ کہ بارہ برس سے یعنی سفر اوّلیں سے میرے حال پر توجہ خاص فرماتے ہیں... وعدہ سیر کشمیر کا جولائی میں قرار دے کر ندیدہ کو ٹکٹکی لگائی۔"

سیّاح نے شمالی ہند کا آخری سفر ۱۸۷۱ء میں کیا تھا۔ اس سیر کا حال اور لکھنؤ اور کانپور کے مشاعروں کی غزلوں کا مجموعہ "سیر سیّاح" کے نام سے ۱۸۷۲ء میں مطبع منشی نول کشور نے شائع کیا ہے۔ منشی صاحب ۱۸۷۱ء کے آغاز میں نواب میر غلام بابا کے بچوں کی تقریب ختنہ میں سورت تشریف لائے تھے۔ اس وقت سیّاح سے کشمیر چلنے کے لیے ماہ جولائی کا وعدہ کر گئے تھے۔ سیّاح ماہ جولائی میں بمبئی آئے۔ یہاں نواب سدی ابراہیم محمد یاقوت خاں والیِ جنجیرہ سے نیاز حاصل کیا اور کانپور کے لیے روانہ ہو گئے کانپور پہنچنے پر معلوم ہوا کہ منشی صاحب سیّاح کا بڑا انتظار کرنے کے بعد عازم کشمیر ہو گئے۔ چند گھنٹوں کے بعد ہی بارش اور سیلاب کی وجہ سے ریل بند ہونے کے سبب منشی صاحب نہ جا سکے اور واپس مکان آئے تو سیّاح سے ملاقات ہوئی۔ سیّاح یہاں چار روز قیام کرنے کے بعد لکھنؤ گئے۔ اس سفر میں راجہ محمود آباد نے سیّاح کی بڑی پرتکلف دعوت کی۔ اس دعوت سے فارغ ہونے کے بعد سیّاح منشی صاحب کے ساتھ ٹھہرے۔ شب و روز ان کے اعزاز میں محلس رقص و سرود منعقد ہوتی۔ اور دن بھر اہل ذوق اور اکابر کا سلسلہ ملاقات رہتا۔ سیّاح کا یہ دستور تھا کہ جہاں جاتے مصرع طرح دیتے اور مشاعرہ منعقد کرتے۔ اسی طریق کے مطابق لکھنؤ میں بھی مصرع طرح "اس جہر نے زمیں سے کیا آسماں مجھے" تقسیم کیا۔ ۱۲ رجب ۱۲۸۸ھ روز شنبہ دن کے چار بجے مجلس مشاعرہ بمقام قدیم چوک منعقد ہوئی اور خود صدر نشین ہوئے۔ اس مشاعرے کی غزلوں کا مجموعہ "سیر سیّاح" میں شامل ہے۔ لکھنؤ سے سیّاح آگرہ آئے۔ یہاں مچھو خاں اور صوفی صاحب نے بڑے تپاک سے ان کے اعزاز میں دعوت کی۔ آگرہ سے دہلی گئے یہاں

قربان علی سالکؔ، بدرالدین خاں مترجم بوستان خیال، مرزا محمد حسن، حکیم محمود خاں، حکیم محمد رضا، سید محمد فخرالدین سے ملاقات ہوئی۔ دہلی میں اولیائے کرام کے مزارات پر فاتحہ خوانی کے بعد غالبؔ کی قبر پہ فاتحہ خوانی کے لیے گئے۔ دہلی میں نواب ضیاءالدین نے بھی سیّاحؔ کی بڑے تپاک سے دعوت کی۔ دہلی سے سیّاحؔ پھر لکھنؤ لوٹ گئے اور وہاں کچھ دن قیام کرنے کے بعد سورت لوٹنے کا ارادہ کیا۔ اس دفعہ منشی رام پرشاد نے سیّاحؔ کو دعوت میں مدعو کیا۔ اس مجلس میں جن طوائفوں کو بلایا گیا تھا ان میں ایک شیریں بھی تھی۔ سیّاحؔ نے اس مجلس میں جو قافیے دیے ان پر اس نے فوراً مصرع موضوع کیے۔ اس کی ایک غزل بھی "سیر سیّاح" میں شامل ہے۔ اس طوائف کا ایک منظوم خط سیّاحؔ کے خطوں میں پایا گیا تھا۔ جواب ناپید ہے۔ لکھنؤ سے سیّاحؔ سورت کے لیے کانپور آئے۔ منشی صاحب انھیں الوداع کہنے کے لیے کانپور تک تشریف لائے تھے۔ کانپور میں بھی مجلس مشاعرہ منعقد ہوئی۔ مگر سیّاحؔ کی علالت اور ماہ صیام کی وجہ سے مشاعرہ نہ ہوا۔ اس مشاعرے کی غزلیں بھی "سیر سیّاح" میں شامل ہیں۔ غرض سیّاحؔ کا یہ آخری سفر تھا۔[1] اس کے بعد کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ پھر سورت سے باہر نہ گئے۔

اللہ نے سیّاحؔ کو ذوق شعر و سخن تو ودیعت ہی کیا تھا لیکن وہ علوم و فنون کے زیور سے بھی آراستہ تھے۔ سیّاحؔ ایسے طالب علم کے لیے سورت میں اورنگ آباد سے ان کی آمد پر ایسا ماحول تھا کہ ہر وہ شخص جس کو تھوڑا بھی ذوق تھا۔ علم و فضل سے بہرہ ور ہوا۔ یہ سنہ ۱۸۴۰ء یا سنہ ۱۸۴۲ء میں سورت آئے ہیں۔ سورت اس وقت علماء و فضلا سے بھرا ہوا تھا۔ منشی لطف اللہ (ان کا ذکر آگے آئے گا) اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ جب وہ سنہ ۱۸۲۱ء میں سورت آئے تو انھیں معلوم ہوا کہ یہاں بڑے بڑے علماء موجود ہیں۔ غرض سیّاحؔ نے سورت میں ماحول ایسا پایا تھا کہ علم و ادب میں

---

[1] سیّاح کا آخری سفر دکن کا تھا۔ جس کا حال اودھ اخبار میں ہے۔

بحوالہ قاضی عبدالودود صاحب۔ راقم کی مرتبہ کتاب منشی میاں داد خاں سیّاح اور کلام میں قاضی صاحب کے تکملہ میں موجود ہے۔

انھیں تکمیل کا موقع مل گیا۔ ان کی علمی و ادبی کارناموں میں ایک رسالہ محرّق قاطع برہان کے جواب میں "لطائف غیبی" نامی ہے۔ اگرچہ اس کے متعلق چند مصنفین کا خیال ہے کہ یہ غالب ہی کا لکھا ہوا ہے۔ سیّاح کی نثر کا نمونہ اور علمی لیاقت کا ثبوت ان کی تالیف "سیر سیاح" میں ملتا ہے۔ "سیر سیاح" میں اپنے سفر و حضر کا بیان مقفّٰی عبارت میں کیا ہے۔ اگرچہ یہ غالب کے شاگرد تھے، لیکن نثر و نظم دونوں میں زیادہ تر دبستان لکھنؤ کے پیرو پائے جاتے ہیں۔ صرف انھیں پر موقوف نہیں، گجرات پر دبستان لکھنؤ کا بہت گہرا اثر تھا۔ "سیر سیاح" سے ظاہر ہے کہ ان کی علمی لیاقت کی وجہ سے انھیں شمالی ہند میں بڑی وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ سیّاح کے متعلق جناب محمد عسکری صاحب "ادبی خطوط غالب" کا بیان ملاحظہ فرمائیے: "سیّاح کو فارسی میں درجۂ کمال حاصل تھا اور نہایت بے تکلفی کے ساتھ اس زبان میں گفتگو کرتے تھے!"

جس طرح سیّاح کے لباس، وضع قطع میں نفاست پائی جاتی ہے۔ اسی طرح انھوں نے فنون میں بھی بڑا لطیف ذوق پایا تھا۔ سیّاح خطاطی میں ید طولا رکھتے تھے۔ ان کے ہاتھ کا ایک طغرا اب تک محفوظ ہے۔ انھوں نے اپنا دیوان اپنے ہاتھ سے نہایت خوش خط لکھا تھا۔ جو کچھ عرصے پہلے بزرگوں کے پاس دیکھا گیا مگر اب ناپید ہے۔ دیوان کے علاوہ ایک شہر آشوب بھی لکھا ہے۔ اس میں طوائفوں اور ان کے ہتھکنڈوں کا ذکر ہے۔

۱۸۸۵ء تک سیّاح نے نہایت آرام اور عشرت میں زندگی بسر کی۔ قید سے رہا ہونے کے بعد، نواب غلام بابا کے دربار سے چار پانچ سال تک منسلک رہے۔ لیکن نواب موصوف کے انتقال کے بعد سیّاح نے بڑی عسرت میں زندگی بسر کی۔ ان حالات میں سیّاح کے ایک مدّاح اور دوست حکیم شیخ محمد میاں صاحب[1] ان کے کفیل ہوئے اور انھیں رانی تالاؤ اپنے

---

[1] حکیم شیخ محمد صاحب سورت کے ایک حاذق طبیب تھے۔ یہ گجرات کی میٹھی بوہرہ جماعت کے ایک معزز فرد تھے۔ حکیم صاحب موصوف کے صاحبزادے حاجی حکیم محمد قاسم صاحب اس وقت بقید حیات ہیں۔ محمد قاسم صاحب بھی بڑے دانا و بینا شخص ہیں۔ فن طب میں آنجناب

(باقی اگلے صفحہ پر)

مکان کے قریب لاکر رکھا۔

قریب دس بارہ سال عسرت میں گزار کر سیّاح نے اسّی یا پچاسی سال کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ کیا۔ انھیں محلہ بڑے خاں کے چکلے میں خواجہ سید جمال الدین قدس سرہٗ کی خانقاہ میں دفن کیا گیا[1]۔ نمونہ کلام:-

لیا بوسہ جو ابرو کا تو کب کیا غیظ میں آکر — کبھی دیکھی مری صورت کبھی تلوار کی صورت

مسند فقر پہ زاہد نہ ہو کیوں کر تکیہ — ہم فقیروں کو ہوا فضل خدا پر تکیہ

لطف املاک و امارات ہوا امیروں کو نصیب — فضل خالق سے فقیروں کا ہوا گھر تکیہ

کیا عجب گر ہو گئی رونے سے چشم تر سفید — ابر کالے بعد بارش ہوتے ہیں اکثر سفید

خشک تھا یہ ناتوانی سے لہو اس جسم کا — ذبح قاتل کر چکا لیکن رہا خنجر سفید

اس بیکسی میں مری رفاقت جو تم نے کی — جاں اپنی تم پہ کرتا ہوں رنج و محن نثار

نواب غلام بابا خاں: نواب میر غلام بابا خاں سورت کے ایک معزز قاضی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد سید اخی قاضی شہر تھے، اور ان کی وفات ۲۱ ربیع الثانی سنہ ۱۲۲۴ھ کے بعد ان کے جانشین ان کے بڑے بیٹے سید جمال الدین ہوئے تھے۔ یہ خانقاہ سید جمال الدین کے سجادہ نشین بھی تھے۔ والد کی وفات کے بعد غلام بابا اور ان کے دو چھوٹے بھائیوں نے بڑے بھائی کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ خود ان کی تاریخ ولادت ۴ شعبان سنہ ۱۲۵۱ھ ہے اور مولد سورت۔ ابتدائی تعلیم کے بعد یہ ایک عالم مولوی کاظم سے درس لیتے رہے۔ مگر باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ والد کی موت کے بعد ٹوٹ گیا۔ سنہ ۱۲۷۲ھ کے لگ بھگ ان کی

کا بہت وسیع تجربہ ہے۔ آپ کے پاس سیّاح کے ہاتھ کا ایک طغرا اور شہر آشوب نظم محفوظ ہے۔

[1] مرزا عسکری نے سیّاح کا انتقال بمقام بمبئی بتایا ہے جو صحیح نہیں۔ اس طرح عسکری نے سیّاح کی غالب سے ایک ملاقات میں سنہ ۱۸۶۴ء کے متعلق کچھ اس طرح سے لکھا ہے کہ گویا یہ پہلی ملاقات تھی۔ لیکن پہلی ملاقات سنہ ۱۸۶۰ء میں یا اس سے بھی پہلے ہوئی تھی۔ نادرات غالب میں بھی بے سند وہی لکھا ہے جو مرزا عسکری کے یہاں ہے۔

نسبت سورت کے نواب ۔ فضل الدین کے داماد میر جعفر علی کی دختر رحیم النساء عرف چھوٹی بیگم سے قرار پائی اور ۱۲۷۶ھ میں شادی ہوئی ۔ اس کے بعد یہ اپنی سسرال نواب باڑی میں رہنے لگے ۔ یہ علمی وادبی ذوق کے آدمی تھے ۔ خود شعر نہ کہتے تھے مگر شاعروں کے قدرداں تھے اور ان کے دربار سے کئی شعرا متوسل تھے ۔ جن میں سیاح کو امتیاز حاصل تھا ۔ مولوی برکت اللہ کے بیٹے عبدالستار کتب فروش کا بیان ہے کہ انھوں نے احیاء العلوم غزالی کا اردو ترجمہ کرایا تھا جو اب ناپید ہے ۔ یہ پتا نہیں کہ مترجم کون تھا اور یہ بھی خبر نہیں کہ طبع ہوا تھا یا نہیں ۔ غلام بابا کی دادو دہش ایسی تھی کہ بیرونی شعرا ، ان کے دربار سے تقرب حاصل کرنے کے خواہاں رہتے تھے ۔ سورت کا ایک ان پڑھ شاعر بنو میاں تھا جس کے جوگی ناموں ،

ل ۱۷۴۷ء میں جب نواب متصدی تیغ بیگ خاں مرے تو ان کے جانشین ان کے بھائی صفدر خاں ہوئے ، لیکن ۱۷۵۸ء میں مقدم الذکر کے داماد سید اچھن نے مؤخر الذکر کو ہٹا کر ان کی جگہ لے لی ۔ ان کی وفات (۱۷۶۳ء) کے بعد حفیظ الدین احمد ان کے بیٹے نواب ہوئے اور ۱۷۹۰ء میں ان کے مرنے پر ان کے بیٹے نظام الدین کا تقرر انگریزوں کی طرف سے ہوا ۔ ان کی وفات کے بعد (۱۷۹۹ء) ان کے بھائی نصیر الدین اس شرط پر ان کے جانشین قرار پائے کہ شہر کے محکمۂ عدالت کے سوا تمام نظم ونسق انگریزوں کے سپرد کر دیں اور ایک لاکھ سالانہ وظیفہ پایا کریں ۔ ان کے جانشین ان کے بیٹے افضل الدین ہوئے ۱۸۲۱ء اور ان کی وفات کے بعد ۱۸۴۲ء میں ان کے جانشین میر جعفر علی خلف میر سرفراز علی (داماد افضل الدین) سے محکمۂ عدالت بھی لے لیا گیا ، مگر وظیفہ برقرار رہا ۔ غلام بابا کی شادی ان کی چھوٹی بیٹی سے ہوئی تھی ، اس لیے یہ چھوٹے صاحب بھی کہے جاتے تھے ۔ (غالب کے خطوط میں یہ آتا ہے) میر جعفر علی خاں کی بڑی بیٹی کی شادی نواب بیلہ کے خاندان میں ہوئی تھی ۔ اسی مناسبت سے آج تک دونوں کی حویلیاں بڑی باڑی اور چھوٹی باڑی کہی جاتی ہیں ۔

(بمبئی گزیٹر)

مرثیوں اور غزلوں کا مجموعہ راقم کے پاس ہے اسے رسائی نہ ہوئی تو اس نے ان کی ہجو کہی۔ غلام بابا کو خبر ملی تو اسے بلایا اس کا کلام سنا اور ایک قیمتی دوشالہ دے کر رخصت کیا جو فوراً ہی ایک ساہوکار کے نذر ہوا جس کا وہ مقروض تھا۔

غلام بابا نہایت کشادہ دل رئیس تھے۔ ان کے دربار سے کوئی خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا۔ شہر میں ان کے بے شمار دعاگو تھے۔ سنہ ۱۳۰ھ میں بارش کی وجہ سے خواجہ دانا صاحب کی خانقاہ کے منارے کو بڑا نقصان پہنچا تو اس کی دوبارہ تعمیر میں انھوں نے زر کثیر خرچ کیا تھا۔ شیخ بہادر نے تاریخ لکھی تھی۔

امیر وقت خوشا آں غلام بابا خاں ۔۔۔ منارہ کرد بنا رفیع و عالی جاہ

برائے سال ہمایوں چو فکر بموزم ۔۔۔ بگفت ملہم غیبی زسرا و ناگاہ

زردے بانگ بگو بر عمود دین نبی ۔۔۔ دوبارہ اشہد ان لا الہ الا اللہ

یہ ہر شخص سے بقدر مراتب لطف و کرم کے ساتھ پیش آتے تھے۔ عید کے دن جو بھی ملنے جاتا اسے شربت پلاتے۔ صاحب حقیقت السورت شیخ بہادر رقمطراز ہیں۔

”خوبی عادات میر غلام بابا خاں را یارائے نیست کہ بہ حیطۂ بیان آورد خلیق وحلیم و سلیم متواضع و متحمل باوجود چنیں جلال با ہر یکے از ادنیٰ تا اعلیٰ شفقتے کہ شایان حال او بجائے آوردند“

یہ سورت میں اتنے ہر دلعزیز تھے کہ ایک شخص نے کپڑے کی مل کھولی تو اس کا نام بھی غلام بابا مل رکھا۔ ان کی وفات کی تاریخ ۱۲ شوال المکرم سنہ ۱۳۱۰ھ مطابق سنہ ۱۸۹۳ء ہے۔ اپنے موروثی قبرستان خانقاہ خواجہؒ دانا میں مدفون ہوئے۔

لہ سید جمال الدین عرف خواجہ دانا خلف سید بادشاہ پردہ پوش نقوی سید تھے سلاطین چغتائیہ کی کئی لڑکیاں اس خاندان میں بیاہی گئی تھیں۔ خواجہ دانا خود بھی ایک شاہزادی کے بطن سے تھے۔ یہ خوارزم سے قریب ایک موضع جنوق میں سنہ ۸۹۸ء میں متولد ہوئے عمر سہ برس کی تھی کہ سید بادشاہ اسمٰعیل صفوی کی شورش میں شہید ہوئے۔ باپ کے ایک مرید

(باقی اگلے صفحہ پر)

غلام بابا اور غالب کے تعلقات کا آغاز سیّاح کی وساطت سے ہوا اور قبل اس سے کہ دونوں میں مراسلت جاری ہو، غالب نے ایک خط میں انھیں سلام لکھا تھا۔ اور ان کے بڑے بیٹے میر مظفر حسین کی ولادت کا قطعۂ تاریخ بھیجا تھا (خط بنام سیّاح نوشتہ اگست ۱۸۶۳ء) خط وکتابت میں پہل غلام بابا نے کی، اور ان کا پہلا خط وہ تھا جس میں انھوں نے اپنے خسر کی وفات کی اطلاع دی تھی۔ غالب کے تعزیت نامے میں جو ۶ ستمبر ۱۸۶۳ء کا لکھا ہوا ہے۔ قطعۂ تاریخ وفات بھی شامل ہے۔ خط مورخہ ۹ اگست ۶۶ء سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام بابا کے چھوٹے بیٹے (جن کا نام جعفر علی تھا) کی ولادت پر غالب نے ان کا تاریخی نام مہابت علی خاں تجویز کیا تھا۔ غالب لکھتے ہیں: مجھے اس پر اصرار نہیں کہ یہی نام رکھا جائے مگر یہ تو بتا چلیے کہ پسند ہوا یا نہیں۔ ان کی لڑکی کی رسم بسم اللہ ہوئی تو اس موقع پر بھی غالب نے قطعۂ تاریخ بھیجا۔ (خط ۱۴ نومبر ۶۶ء) انھوں نے ایک بڑا مقدمہ جیتا اور اس کی خبر غالب کو ملی تو انھوں نے ایک قطعۂ تاریخ لکھا اور ظفر نامہ ابد

نے پرورش کی، ۱۸ سال کی عمر میں بابا جو یاں مجذوب ترکستانی سے ملنے بلخ گئے۔ پیر خاں بن جانی بیگ خاں والی توران نے اپنی رضاعی بہن سے ان کا نکاح کر دیا، بلخ میں ایک مدت تک قیام کے بعد براہ سندھ آگرہ آئے۔ یہاں بہت سے اُمرا مرید ہوئے گجرات آتے ہوئے برہانپور میں ٹھہرے وہاں شاہزادہ دانیال نے بیعت کی۔ بڑودہ میں نظیر بدخشی کی ملاقات سے فیضیاب ہونے کے بعد سورت آئے، قاضی شہر نے استقبال کیا اکبر بھی معتقد تھا اور اس نے ایک رقم کثیر بھیجی جس سے خانقاہ بنوائی جو زیارت گاہ عالم ہے۔ وفات بتاریخ ۵ صفر ۱۰۱۶ھ ہجری جمعہ آخر شب۔ مولانا درویش تاشقندی نے آپ کے ملفوظات جمع کیے ہیں اور قاضی خاں بخاری نے آپ کے حالات میں مقامات العارفین لکھی ہے آپ کے فرزند محمد قاسم کی ایک کتاب مناقب الاخیار بھی آپ کے احوال میں ہے۔

(حقیقت السورت)

سے تاریخ نکالی۔ غالب سے مہر کھدوانے کی فرمایش بھی کی تھی جس کی یقین ہے کہ تعمیل ہوئی ہو (خط بنام سیّاح ۱ مارچ ۱۸۶۶ء) سیّاح نے روپے بھیج کر اپنے لیے چند لوٹیاں منگوائی تھیں، انھیں ٹھیک نہ آئیں تو انھوں نے غلام بابا کے نذر کردیں۔ غالب سیّاح کو لکھتے ہیں کہ وہ اسے میراارمغاں سمجھیں، انھیں اور لوٹیاں بھیجدوں گا۔ غلام بابا کا سلوک غالب کے ساتھ خردانہ تھا۔ ان کا کوئی خط تو موجود نہیں لیکن غالب کے ایک خط بنام سیّاح کی عبارت ہے: "حیران ہوں کہ چھوٹے صاحب کے خط کا کیا جواب لکھوں۔ انھوں نے مجھے شرمندہ کیا۔ اپنے کو چھوٹا اور مجھ کو بزرگ لکھا، سید تو سب مسلمانوں کے بزرگ ہوتے ہیں۔ میں تو مسلمانوں میں بھی ایک ذلیل علیل فقیر حقیر آدمی ہوں"۔

(۱۲ فروری ۱۸۶۷ء) غلام بابا نے غالب کو ایک گھڑی تحفتہً بھیجی تھی، ان کے نام کے خط میں تو لکھا ہے کہ "میں نے اسے بہت عزیز سمجھا اور اپنے سر اور آنکھوں پر رکھا"۔ (۳ دسمبر ۱۸۶۴ء) لیکن دراصل وہ زرنقد کے خواہاں تھے کہ درفش کاویانی کو طبع کراسکیں اور سیّاح کو انھوں نے صاف لکھدیا کہ میں یہ چاہتا تھا، گھڑی بے کار ہے اسے واپس کردیتا لیکن غلام بابا کو برا معلوم ہوتا اس لیے رکھ لی (۳ دسمبر ۱۸۶۴ء) اس کے بعد انھیں سو روپے بھی ملے۔ غلام بابا نے غالب کو اپنی تصویر بھیجی تھی اور عجب نہیں کہ غالب نے بھی اپنی تصویر انھیں روانہ کی ہو۔ گو اس کا ذکر غالب کے کسی خط میں نہیں۔ ان کے نام کے دس خط اردوئے معلی میں ہیں۔

حکیم سید احمد حسن مودودی متخلص بہ فدا و جمالی: حکیم سید احمد حسن حکیم میر سرفراز علی کے عزیز دلی میں تھے اور سہسوان چھوڑ کر بڑودہ میں بود و باش اختیار کرلی تھی (بروایت میر محمد علی مجسٹریٹ سہسوان جو حکیم صاحب کے خاندان کے ہیں) یہ نہایت حاذق طبیب تھے اور بڑودہ میں مطلب کرتے تھے، سال وفات ۱۳۶۸ھ/۱۹۴۸ء ان کے فرزند اکبر سید محمود حسن، متخلص بہ افسر، ظہیر دہلوی کے شاگرد تھے۔ ان کی موت بڑودہ میں ۲۸ سال کی

۱؎ ایک بار اور سو روپے بھجوائے۔

عمر میں ہوئی۔ ان کا تھوڑا سا کلام میر ابراہیم علی وفا کے مجموعۂ کلام کے حاشیے پر ملتا ہے [1]

تمہارے غم میں آخر دھج بنا ہم نے فقیرانہ
اٹھایا شہر سے بستر بسایا جا کے ویرانہ

کہا رو رو کے میں نے شب جو اپنے غم کا افسانہ
تجاہل دیکھیے کہتے ہیں تو کس کا ہے دیوانہ

لپٹ جاتا ہے فرط شوق سے کیا بے حجابانہ
فدا ہم دیکھ کر جلتے ہیں وصل شمع و پروانہ

ہو سکے تو کیجیے ڈھب آخری دیدار کا
لب تک آپہنچا ہے دم اس ناتوان وزار کا

ہم ہی کچھ مرتے نہیں ہیں آپ کی اس چال پر
اک جہاں پامال ہے اس نازکی رفتار کا

عاشقوں کا کوچۂ قاتل میں یہ ہے ازدحام
روز بہر امتحاں ہوتا ہے خوں دو چار کا [2]

حکیم صاحب احمد حسن قنوجی (برادر صدیق حسن خاں) کی وساطت سے ۱۸۶۰ء میں غالب کے شاگرد ہوئے تھے (خط بنام احمد حسین قنوجی ۲۱ ستمبر ۱۸۶۰ء) حکیم صاحب کے نام غالب کے ۱۱ خط اردوئے معلیٰ میں ہیں۔ اس کتاب میں جو پہلا خط ہے۔ ۱۹ ذی الحجہ کا ہے مگر اس میں سنہ مندرج نہیں اور اسی خط سے یہ پتا بھی چلتا ہے کہ مراسلت قبل سے تھی۔ ان خطوں میں جن کا زمانۂ کتابت ٹھیک معلوم ہے۔ سب سے قدیم ۹ جنوری ۱۸۶۲ء کا اور آخری ۱۷ جولائی ۱۸۶۷ء کا ہے انھوں نے غالب کے ایک خط میں قبلۂ قبلہ اور کعبۂ کعبہ لکھا تھا۔ غالب نے متنبہ کیا ہے کہ یہ "سوء ادب ہے بہ نسبت قبلہ" ان کے نام کے دو سجع بھی غالب کے ایک خط میں ہیں، جو ممکن ہے کہ خود غالب کے کہے ہوئے ہوں۔ میر ابراہیم علی خاں اور میر (عالم؟) علی خاں نے انھیں کی وساطت سے غالب کا تلمذ اختیار کیا تھا۔ ۸ اپریل ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں غالب کبر سن کی وجہ سے اصلاح اشعار سے معذوری ظاہر کرتے ہیں، مگر بعد کے خطوط سے ثابت ہے کہ اصلاح کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا گو ۱۸ اکتوبر ۱۸۶۶ء کے خط میں شکایت کی ہے کہ آپ کی غزلیں "برستی ہیں کہاں تک دیکھوں" میر ابراہیم علی خاں نے

---

[1] افسر کا کلام ڈاکٹر وحید اشرف شعبۂ عربی فارسی مدراس یونیورسٹی نے ۱۹۸۳ء میں شائع کر دیا ہے۔ [2] یہ کلام مرتبہ کلام میں نہیں ہے۔

سو روپے انھیں کی وساطت سے بھیجے تھے، اس کی رسید ظاہرا انھوں نے کئی بار مانگی غالب لکھتے ہیں کہ "سو روپے کے لوٹ کی رسید سو بار مانگتے ہیں"۔

میر ابراہیم علی خاں کے دادا میر سرفراز علی خاں[1] سہسوان ضلع بدایوں سے مہاراجہ گووندراؤ

---

[1] میر سرفراز علی خاں سہسوان کے ایک نہایت معزز خاندان سے تھے، اور ان کا سلسلۂ نسب خواجہ قطب الدین مودودی کے ذریعے حضرت امام حسینؓ تک پہنچتا ہے۔ (بروایت جناب میر محمد علی زمیندار سہسواں) میر صاحب نے بڑودہ آکر راقم کے خاندان کے ایک بزرگ سید عبدالقادر سے جو اس وقت سلح دار سردار کے عہدے پر فائز تھے۔ ایک قطعۂ زمین خریدا اور اس پر حویلی تعمیر کرائی جو میر صاحب کے باڑے کے نام سے مشہور اور اب تک ان کے اخلاف کے تصرّف میں ہے۔ میر صاحب ذی ہوش اور کار آزمودہ تھے۔ انھوں نے بہت جلد مہاراجہ بڑودہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور پیشوا کے دربار میں درجۂ امتیاز حاصل کر لیا اور انگریزوں اور مہاراجہ کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے میں اپنی ہوشمندی کا ثبوت دیا۔ انگریز گورنروں نے انھیں بہت اچھے سفارشی خطوط دیے تھے۔ جن میں ان کی سپاہ گری معاملہ فہمی اور سیاستدانی کی بڑی تعریف کی ہے۔ مہاراجہ بڑودہ نے صلۂ خدمات میں انھیں کاٹھیاواڑ میں کھانڈیا اور داوڑی بطور جاگیر عطا کیے۔ جو اب تک ان کے اخلاف کے قبضے میں ہے۔ یہ مہاراجہ کی طرف سے سر جون مالکم کے ساتھ مہم مالوہ پر بھی گئے تھے۔ اور سر جون نے ایک خط میں ان کی خدمات کو بہت سراہا ہے۔ ان کے دو بیٹے تھے میر جعفر علی، داماد میر افضل الدین اور میر اکبر علی جو اپنے والد کے بعد بڑودہ میں سلح دار سردار ہوئے۔

(بمبئی گزیٹر)

(تاریخ سرداراز بڑودۂ مرہٹی)

گائکواڑ (۱۷۹۳ء تا ۱۸۰۰ء) کے عہد میں بڑودہ آئے اور یہاں دوسری شادی یہاں کے نواب نورالدین حسین خاں کی سالی سے کی، جس کی وجہ سے بہت جلد عروج حاصل کیا۔ اس بی بی سے دو بیٹے تھے۔ اکبر علی خاں اور جعفر علی خاں (مؤخرالذکر بعد کو نواب سورت کہلائے اور مقدم الذکر اپنے والد کے جانشین ہوئے۔ میر ابراہیم علی خاں انھیں کے بیٹے تھے۔ ان کی صحیح تاریخ ولادت معلوم نہیں مگر اس خاندان کے افراد سے معلوم ہوا ہے کہ ۱۸۳۵ء اور ۱۸۴۰ء کے درمیان پیدائش یقینی ہے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، مگر سن شعور پر پہنچنے کے بعد سورت میں اپنے چچا کے پاس رہے۔ جہاں منشی لطف اللہ فریدی سے عربی فارسی انگریزی پڑھی (یہ بھی اسی خاندان کے لوگوں سے سنا ہے) ۱۸۶۰ء میں جب ان کے والد کی وفات ہوئی ہے۔ تو انھیں بڑودہ جانا پڑا اور ریاست نے سلح دار کی جگہ ان کے نام منتقل کردی۔ یہ بڑے خوش رو اور وضعدار شخص تھے۔ ان کی تصویر جو مہیش پرشاد صاحب کو بنارس میں کسی سے ملی تھی۔ میں نے دیکھی ہے۔ قد میانہ، بدن چھریرا اور رنگ صاف تھا۔ ڈاڑھی خوبصورتی کے ساتھ ترشواتے تھے۔ لباس بڑودہ کی وضع کی پگڑی، انگرکھا اور آڑا پاجامہ۔ میر صاحب بہت خوش گلو تھے۔ ہر ماہ اپنے یہاں مجلس میلاد منعقد کرتے اور مولود خود پڑھتے تھے۔ آواز میں اتنا درد تھا کہ محفل میں سکتے کا عالم ہو جاتا تھا۔ سنا گیا ہے کہ اس کا شہرہ لکھنؤ تک پہنچا تھا۔ اور واجد علی شاہ نے انھیں بلایا تھا اور انھیں داد دی تھی۔ ان کی شادی بڑودہ کے منشی غلام قادر کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ بیٹے چار تھے میر احتشام علی، ناصر علی، یوسف علی اور محمود علی۔ احتشام علی جو سب سے بڑے تھے۔ ظہیر دہلوی کے شاگرد تھے۔ اور جاد تخلص کرتے تھے۔ ان کا دلوان ان کے پوتے میر محبوب علی خاں کے پاس ہے۔ میر ابراہیم علی نے ۱۸۸۵ء میں بمقام بڑودہ وفات پائی۔

میر صاحب کا تخلص طالب و وفا تھا۔ آخری تخلص کے متعلق یہ شعر ہے۔

علی تو نام تیرا تخلص رکھ وفا اپنا ۔۔۔ مرے بھائی فدا نے مجھ کو سمجھا یا جگیمانہ

ندا حکیم احمد حسن کا تخلص تھا۔ مذہبی دھن کے آدمی تھے۔ اور حضرت محمود میاں چشتی فاروقی احمد آبادی کے مرید تھے۔ بیشتر کلام نعتیہ ہے اور ان کے خاندان میں محفوظ۔

دہاں نہ جانے کا لیتے ہو وعدہ مجھ سے ولے
زباں سے لاکھ کہوں دل پہ اختیار نہیں

نہ دو دل اس گل رعنا کو اے وفا دیکھو
گلوں کے حسن دوروزہ کا اعتبار نہیں

کب لبوں پر مرے نالے نہیں فریاد نہیں
کب تری وعدہ فراموشی مجھے یاد نہیں

ہوئے آخر تمہارے ہجر میں یہ جوشش وحشت
اجاڑا ہم نے بستی کو بسایا جا کے ویرانہ

بیان درد فرقت کر کے تم احساں جتاتے ہو
کہانی آپ کی سن لی مری اب سنیے افسانہ

شاد ہوں سینے میں جب دل ناشاد نہیں
اب وہ شیون نہیں نالہ نہیں فریاد نہیں

ہے مرے قتل کو اک جنبش ابرو کافی
تیغ کیوں باندھتے ہو تم کوئی جلاد نہیں

//*

گجرات کے مرثیہ گو شعرا

اردو زبان کی ادبی تشکیل کا فخر گجرات و دکن کو حاصل ہے۔ یہاں اردو کو خانقاہی اور درباری و محلاتی ماحول ایسا سازگار ملا کہ ادب اتنے سرعت کے ساتھ پھیلا کہ ایک قلیل مدت میں تقریباً تمام اصناف نظم و نثر میں معتدبہ سرمایہ جمع ہوگیا۔ اس طرح اردو ادب نے ایک مقام حاصل کرلیا۔ اور دو ادبی زبانیں معرض وجود میں آگئیں۔ جن کی ترقی یافتہ شکل ولی گجراتی کے کلام بلاغت نظام میں دیکھی جاسکتی ہے۔

صنف مرثیہ کا آغاز بھی سرزمین دکن میں ہوا۔ دکن میں اس صنف کی مقبولیت کے کئی اسباب تھے۔ سلاطین دکن شیعہ مسلک کے پیرو تھے۔ ان کے جذبۂ عقیدت سے عوام کا متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ اس سے بھی زیادہ اہم سبب یہ تھا کہ واقعۂ کربلا ایک ایسا سانحہ ہے کہ بلا تفریق مذہب و ملت ہر فرد و بشر کا اس سے متاثر ہونا لازمی ہے تاجداروں کے رجحان طبع کی وجہ سے بڑے بڑے امام باڑے، عزاخانے وغیرہ تعمیر ہوگئے اور عشرۂ محرّم سے متعلق تمام جذباتی و سماجی رسوم کو اہتمام بلکہ مبالغہ سے منایا جانے لگا۔ مرثیہ اس غم و اندوہ کے اظہار کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ لہٰذا شعرائے دکن نے اپنے آقایانِ ولی نعمت، ذاتی عقیدت اور عوام النّاس کے جذباتی تقاضوں کو مرثیہ نگاری کے ذریعے پورا کیا۔ ان شعرا میں بعض ایسے ہیں جنھوں نے صرف صنفِ

مرثیہ ہی میں طبع آزمائی کی۔ بعض غزل گو اور مثنوی نگار اساتذہ نے بھی تبرکاً مرثیے کہے اور بعض ہندو شعرا کا بھی پتا چلتا ہے جنھوں نے اپنے تاثرات مرثیوں میں قلم بند کیے[1]۔ تاجداران دکن نے بھی مرثیے کہے اور وجہی، نصرتی، غواصی وغیرہ جیسے ماہرین ادب نے بھی۔ غرض بیسیوں نہیں سیکڑوں مرثیہ گو دکن میں پیدا ہوئے، جنھوں نے اس صنف کو فروغ بخشا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ دکن میں مرثیہ گوئی نے شیعہ سلطنتوں کے خاتمے کے بعد زیادہ عروج حاصل کیا۔ اس عروج و مقبولیت کا ظاہری سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ دکن پر مغلوں کے تسلّط سے قبل اہل دکن اپنے آپ کو آزاد تصور کرتے تھے۔ مغلوں کے تسلّط کے بعد ان کے اس تصوّر حریّت کو صدمہ پہنچا۔ لہٰذا ذہنی طور پر اہل دکن نے مذہب و عقیدت کی طرف رجوع کیا تاکہ ان کے مجروح دلوں کے لیے تسکین کا سامان ہو۔ اس کی ایک بیّن دلیل یہ ہے کہ دکن کے عشقیہ مثنوی گو شعرا نے بھی مغل دور میں مرثیہ اور مذہبی مثنویوں کی طرف توجہ مبذول کی۔ اس امر سے اہل دکن کی ذہنی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ اس دور کے مرثیے حقیقت میں سوز و گداز کے نمونے ہیں چوں کہ چوٹ سخت تھی۔ اس لیے جو بات دل سے نکلتی تھی، اثر رکھتی تھی۔ قدیم دور کے مرثیے زبان کے اعتبار سے آج بلند مرتبہ نہ سمجھے جائیں گے مگر جذبات اور قدرتی انداز بیان کے لحاظ سے ضرور بلند ہیں۔ اور یہی ان مرثیہ نگاروں کا مقصد تھا۔

گجرات میں شہر سورت فاطمیوں کا اور کھمبایت اثنا عشری مسلک والوں کا مرکز رہا ہے۔ دوسرے شہروں میں صرف چند شیعہ خاندان ہیں۔ لیکن ہر شہر میں امام باڑہ عزاخانہ وغیرہ موجود ہیں۔ اہل سنّت والجماعت پر چند اپنے عقیدوں اور تصوّرات

---

(۱) سفارش حسین رضوی ص ۲۳

• ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی۔ ایم اے پی ایچ ڈی: ڈائرکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی: مصنّف ولی گجراتی، اردو غزل ولی تک وغیرہ۔

(۲) سفارش حسین رضوی اردو مرثیہ ص ۲۳

ہیں اہل تشیع سے مختلف ہیں لیکن عشرۂ محرم وہ بھی بڑے اہتمام سے مناتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان دنوں ہر گھر ایک امام باڑہ اور عزا خانہ بن جاتا ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس موقع پر سورت کے عشرۂ محرم کا ایک نقشہ پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ گجرات کے محرم کے تہوار کی ایک تصویر سامنے آسکے۔ گجرات کے ہر شہر میں تقریباً اسی طرح عشرۂ محرم منایا جاتا ہے

سورت میں شیعیت کا زور نہ تھا۔ مگر قدیم دور میں اگر کوئی متصدی یا عہدیدار شیعہ آجاتا تو سنیوں کو نہ بخشتا۔ حیدر قلی خاں متصدی ۱۷۱۵ء نے ملا محمد علی کی جائداد ضبط کرلی تھی اس نے بعض مذہبی مسائل کے اختلاف پر شیخ خاندان کے بزرگوں کو پریشان کیا تھا۔ اہل سنت والجماعت نے بعض امور میں شیعوں کے طریقے اختیار کرلئے تھے۔ سورت میں امام باڑہ تو ایک ہی تھا۔ مگر دیکھا جائے تو ہر گھر ایک امام باڑہ تھا۔ تعزیہ داری، سوانگ ماتم و سوزخوانی، شربت و شیرینی حسین کے نام پر فقیری میں جوش عقیدت کا اظہار کیا جاتا تھا۔ غریبوں نے دکھوں سے نجات اور مرادوں کے حصول کے لیے اللہ کو بھولکر حسینؓ سے مانگنے کے طریقے بنالیے تھے اور امرا نے غم واندوہ میں بھی داد عیش کے عجیب (مقدس) طریقے نکال لیے تھے نہ کسی کو غم حسین تھا نہ دل میں احترام بلندئ کردار حسین تھا۔ یہ دراصل فراریت تھی۔

امرا کے ہاں روز و شب محفل رقص و سرود ہوتی تھی۔ مگر محرم کے دس روز چونکہ مراثی احتراماً گانا بجانا بند رکھتے ہیں۔ لہذا ان دس بارہ دنوں میں امرا کے ہاں سوزخوانی کی مجالس ہوتیں۔ ایک طرف طوائفوں کی بن آتی اور دوسری طرف اہل جاہ و ثروت فردوس گوش اور جنت نظر سے محروم بھی نہ رہتے۔ اس دور میں سورت میں طوائفوں کا بول بالا تھا۔ گویا وہ گجرات کا لکھنؤ تھا۔ امرا کی جیبیں خالی ہوتیں اور ارباب نشاط کے دامن بھرتے۔ طوائفیں اپنا ایک چھوٹا سا، کہنا چاہیے برائے نام تعزیہ بنواتیں

ماخوذ از مقالہ "سورت کی صورت" از ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی۔ ماہنامہ مطبوعہ "صبح امید" جون ۱۹۷۱ء

عاشورہ کے روز سہ پہر کو یہ تعزیہ صرف چکلہ کے گرد گشت کے لیے نکالا جاتا۔ اس وقت بڑی بھیڑ بھاڑ ہوتی تھی۔ شہر کے رنگین مزاج، بانکے اور امرا سبھی جمع ہو جاتے۔ تعزیہ کے پیچھے طوائفوں کا غول ہوتا جو حسینی فقیروں کا روپ کچھ اس طرح دھارتیں کہ سبز پریاں دکھائی دیتیں۔ طوائفیں سوز پڑھتی ہوئی تعزیہ کے ساتھ چلتی جاتیں اور امیر خاندانوں کے رنگین مزاج طوائفوں کو حلقہ کیے ہوئے چلتے۔ ان کے ارد گرد دوسرے تماشبین ہوتے۔ مختصر سا فاصلہ طے کرنے میں دو تین گھنٹے گذر جاتے۔ امرا طوائفوں کے کوٹھوں پر جاتے۔ اس کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ تخصیص یہ تھی کہ ان کی موجودگی میں ایسے ویسے کی مجال نہ تھی کہ طوائف کے کوٹھے کا زینہ بھی چڑھ جائے مگر بیسویں صدی کے آغاز کے کچھ ہی پہلے سے امیروں کی جیبیں خالی ہو چکی تھیں۔ لہذا نو دولتیوں نے ان کی جگہ لے لی۔

محرم میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں دودھ کا شربت نہ بنتا ہو۔ آداب یہ تھے کہ مٹکیاں کوری ہوں۔ دودھ کو گرم نہ کیا جائے۔ مٹکیوں پر پھول کے ہار ڈالے جائیں۔ اس نیاز میں رلوڑیاں، پوے، سیلی کا ہونا ضروری تھا۔ سبز کپڑے پہنے جاتے۔ سیلیاں گلے میں ڈالی جاتیں۔ گھر گھر حصے بخرے بڑے اہتمام سے بھیجے جاتے۔ ہونے والے دولھا دولہن کے لیے طرفین سے فقیری (سبز کپڑے، سیلی، شربت وغیرہ) بھیجی جاتی۔

سورت کے تعزیے صنعت کے اچھے نمونے ہوا کرتے تھے۔ عاشورہ کے دن جب تعزیوں کو کربلا لے جایا جاتا تب سڑکوں پر میلا لگ جایا کرتا۔ ہندو مسلمان سب برابر کے شریک ہوتے۔ ہندو اپنے عقیدے اور تصوّر کے مطابق تعزیوں پر ناریل چڑھاتے۔ تعزیوں کے مجاوران کے ماتھے پر بخور کی راکھ سے چندن کرتے اور چراغی وصول کرتے۔ تعزیوں کو اٹھانے کے لیے ڈھیر چمار مزدور اجرت پر رکھے جاتے اور مختلف امیروں کے گھروں پر تعزیے لے جاتے جہاں سے انھیں نیاز کے لیے پیسے ملتے۔ عاشورہ کے دن تعزیوں کے پہلے سوانگ ہوتے۔ جوگی جوگن کے گروہ ہوتے۔ دوسرا گروہ کبیر کا ہوتا۔ ایک شخص بھینسے پر سوار ہو کر اپنے کو کبیر کہلواتا۔ ایک گروہ میں ایک شخص ننگ دھڑنگ بھبھوت لگائے گھوڑے

پر سوار ہوتا یہ لوگ عجیب عجیب خرافات بکتے جاتے۔ ان کے ساتھ ماتم پڑھنے والوں کی ٹولیاں ہوتیں۔ استادوں کے الگ الگ گروہ ہوتے۔ ان میں شعری مقابلے کی بھی ٹھن جاتی جلوس میں نقشبند شمعیں ہاتھ میں لیے ہوئے سوز پڑھتے جاتے۔ دستی بٹوے ہوتے۔ ایک طرف امام قاسم کی سواریاں بٹھلانے نکلیں۔ مختلف تھانکوں (سواریاں بٹھلانے کے مقامات) پر ہوتی ہوئی کربلا جاتیں۔ امام باڑے سے علم نکلتے اور بڑے سلیقے سے لے جائے جاتے۔ غرض یہ ہنگامہ رات کو ختم ہوتا۔

مرثیہ سانحہ کربلا سے متعلق ماتم کا جزو لاینفک ہے۔ اگر اس ادبی پہلو کو ہٹا دیا جائے تو پھر عشرۂ محرم میں رسوم و قیود کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔ گجرات میں اہل سنّت والجماعت کے شعرا نے مرثیہ گوئی میں برابر کا حصّہ لیا ہے۔ اہل سنّت اور اہل تشیع اپنے اپنے مختلف عقائد و تصوّرات کے پیش نظر رسوم ادا کرتے ہیں۔ لیکن مرثیہ گوئی میں موضوع کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔

بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری میں گجرات میں بعض مرثیہ گویوں کا پتا چلتا ہے ان کے مرثیوں کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دکن کے مرثیوں سے مختلف نہیں ہیں۔ زبان و انداز بیان میں سادگی ہے اور ان مرثیوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ مرثیہ گویوں کا مقصد ادبی نہیں ہے۔ وہ اپنے موضوع کے سختی سے پابند ہیں یعنی ان کا مطمح نظر رونے رلانے کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ مرثیہ گو اہل بیت کے مصائب کا مؤثر طریقے پر بیان کر کے لوگوں کو متاثر کرنا اپنا مذہبی فرض خیال کرتے تھے۔ عزلت، گجرات کے ایک بلند درجہ شاعر گذرے ہیں۔ وہ فن و ادب کے ماہر تھے۔ وہ مرثیوں میں ادبی پہلو کو کمزور دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے گجرات و دکن کے بعض مرثیہ گویوں پر اس طرح اعتراض کیا تھا۔

خام مضمون مرثیہ کہنے سوں چپ رہنا بھلا
پختہ درد آمیز عزلت نت توں احوالات بول[1]

---

[1] سفارش حسین رضوی اردو مرثیہ، ص ۱۲

اس پر گجرات کے شاعر رضا نے اس کا جواب دیا تھا۔

اے عزیزاں گرچہ عزلت مرثیہ میں کہا
خام مضمون مرثیہ کہنے سوں چپ رہنا بھلا
لیکن اس مظلوم بے سر کا بیاں کرنا روا
تا کہ سن کے یو بیاں ہوویں محباں اشکبار[1]

غرض قدیم دور میں مرثیے کا مقصد صرف درد وغم کے جذبے کو ابھارنا ہوا کرتا تھا۔ اس میں تراش خراش اور جدّت وندرت ادبی اعتبار سے شمال میں عمل میں آئی۔ اس کی وجہ سے زبان میں شستگی کے علاوہ بعض ادبی محاسن بھی پیدا ہوگئے۔ لیکن اصل مقصد فوت ہوگیا۔

غرض اردو ادب میں گجری ودکھنی نے اس صنعت کو روشناس کرایا۔ اس مضمون میں گجرات کے بارہویں اور تیرھویں صدی کے چند مرثیہ گویوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ چودھویں صدی میں بھی چند مرثیہ گویوں کا پتا چلتا ہے لیکن ان کو یہاں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

اشرف

نام محمد اشرف اور تخلص اشرف تھا۔ گلشن گفتار میں اس کا ترجمہ اس طرح ہے۔

"محمد اشرف، اشرف تخلص، گجراتی، بلا واسطہ شاگرد ولی محمد، طبع رنگین داشت، شعرش در نواح گجرات شہرت دارد، دیوان لطیف تصنیف نمودہ[2]۔"

اپنے نام سے متعلق اس نے یہ لطیف نکتہ پیدا کیا ہے۔

نام میرا ہے اس سبب اشرف
مشتے از خاک پائے احمد ہوں

اشرف صاحب دیوان شاعر ہے۔ اس کے دیوان کا ایک نسخہ مرحوم پروفیسر

---

[1] سفارش حسین رضوی اردو مرثیہ ص ۱۲۰

[2] خواجہ خان حمید، گلشن گفتار مرتبہ سید محمد، ص ۱۲

سید نجیب اشرف ندوی کے کتب خانہ میں تھا۔ مجھے اس کے مطالعہ کا موقع ملا تھا۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی مرحوم اسے اپنے ساتھ کراچی لے گئے۔ معلوم نہیں اس کا کیا حشر ہوا۔ قاضی صاحب نے مذکورہ دیوان پر ایک مضمون قلم بند کیا مصنّف علی گڈھ کی ایک اشاعت میں شائع کیا تھا۔ (مصنف کا شاید نمبر ۱۱ یا ۱۲ ہے) دیوان مذکور کے آخری صفحہ پر اشرف الرسولی شاہی لکھا ہوا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اشرفؔ حضرت شاہ عالم قدسرہ کے خاندان میں مرید تھا۔ شاہ عالم کے عقید تمند اپنے کو شاہی لکھتے ہیں اور حضرت قطب عالم کے عقید تمند اپنے نام کے ساتھ قطبی لکھتے ہیں۔ اس وقت ان دونوں خاندانوں کے تمام افراد شیعہ مشرب سے ہیں۔ نہ جانے کس منزل سے ان لوگوں نے کارواں بدلا۔ ممکن ہے اشرفؔ بھی شیعہ مشرب سے ہو۔

غزل کے علاوہ اشرفؔ نے مثنوی اور مرثیہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ برٹش میوزیم میں اشرفؔ کی ایک مثنوی جنگ نامۂ حیدر کے نام سے محفوظ ہے۔ اس کا ایک نسخہ پروفیسر ندوی کے کتب خانہ میں بھی ہے۔ مثنوی کا سنہ تصنیف ۱۱۲۵ھ ہے۔ اڈنبرا یونیورسٹی میں اشرفؔ کے ۱۳ مرثیوں کا ایک مجموعہ محفوظ ہے۔ ان میں کل ۱۴۰ اشعار ہیں۔ احمد آباد کی بھولاناتھ لائبریری کے ایک مخطوطہ دیوان ولی کے صفحہ ۴۳ کے حاشیے پر بھی اس کا ایک مرثیہ ملتا ہے۔ مذکورہ دیوان ولی کے صفحہ ۴۵ کے حاشیے پر اشرف کی ایک نعت اور صفحہ ۴۵ کے حاشیے پر ایک ریختہ بھی تحریر کیا ہوا ہے۔ اس کی ایک نعت پیر محمد شاہ کتب خانہ کے ایک مخطوطہ مولودنامہ از حافظ رحمت اللہ احمد آبادی کے حاشیے پر ملتی ہے۔

اشرفؔ اپنی مرثیہ گوئی کے متعلق ایک شعر میں اس طرح کہتا ہے:

کہا ہوں بے بدل یو مرثیہ جب سوں اماموں کا
ہوا مشتاق ہر ایک شاعر ملک دکن میرا

لہ بھولاناتھ لائبریری احمد آباد کے مخطوط دیوان ولی کے ص۴۳ کے حاشیہ پر درج ہے۔

مرثیہ

بسکہ تیرا غم ہے بھاری یا امام
رات دن کرتا ہوں زاری یا امام

زخم تیر غم تیری ماتم سیتی
دل میں لایا ہے کاری یا امام

نقد دل حاصل ہے ان کو جو کئی
تجھ قدم پر جاں نثاری یا امام

والیٔ تخت ولایت کا چھتر
ہے تمہاری دوستداری یا امام

یوں لگی دل بیچ نیش غم ترا
جیوں لگی زخم کٹھاری یا امام

داغ دل جوں لالہ تیرے غم سیتی
دی منجھے نت یادگاری یا امام

ہیں شہنشاہ سر پہ ملک دیس
جو کیتی خدمت تمہاری۔ یا امام

کینہ ورزی جو شقی تم سوں کیا
ہے دو جگ میں اس کوں خواری یا امام

جیوں قدس فرح خم ہوئے فلک
بار تجھ غم کا ہے بھاری یا امام

غرق بحر جرم ہوں روز جزا
شرم تم رکھیو ہماری یا امام

ابشار چشم اشرفؔ سوں ہے نت
جوئے خوں تجھ غم میں جاری یا امام[1]

مرثیہ

بانو کہیں اصغر نہیں اب میں جھولاؤں کس کنیں
سونا ہوا ہے پالنا اب میں سولاؤں کس کنیں

نہلا کے میں کپڑے پہنا اس کوں بناتی گل نمن
دو پھول سو کھا نیر بن اب میں بتاؤں کس کنیں

سوتا تھا جب وہ نیند بھر پینے اوٹھاتی دود کوں
بیدم ہے دیکھو آج وہ اب میں جگاؤں کس کنیں

جب مسکراتا دو بجا شاد ہوتی دل منے
بے جاں پڑا ہے گود میں اب میں ہنساؤں کس کنیں

[1] بھولاناتھ لائبریری احمد آباد کے مخطوطہ دیوان ولی کے صفحہ ۳۴ کے حاشیہ پر درج ہے

جب شہ کوں غم گیں دیکھتی لے جا کے دیتی گود میں
سوتا کفن وہ اوڑ کر اب میں لے جاؤں کس کنیں

جاتے تھے جب شہ رن منے اصغر کوں میں چھاتی لگا
دکھ میں بھولاتی اوس کھلا، اب میں کھلاؤں کس کنیں

اوٹھتا وور وور درد بن اب یوں چوپی کے کر رہا
بتیں دھاراں دود کی اب میں پلاؤں کس کنیں

آتش کے شعلے دل منے او ٹھتے ہیں تجھ بن اے بچے
اس کے بجھانے کوں گلے اپنے لگاؤں کس کنیں

یک تل نہیں ہے چین مجہ غم کا بیاں کیوں کر کروں
رو رو کے میں بے ہوش ہوں اب میں رلاؤں کس کنیں

اشرف نہیں محرم کوئی اس درد کا دنیا منے
تجھ بن اے احمد ماجرا غم کا سناؤں کس کنیں[1]

رضی

محمد رضی نام اور رضی تخلص تھا۔ وہ احمد آباد گجرات کا باشندہ تھا۔[2] حدیقۂ احمدی میں بھی مرقوم ہے کہ "یکے از شعرائے گجرات بودہ" ہاشم علی مرثیہ گو نے ایک جگہ حافظ رضی لکھا ہے۔ رضی ولی گجراتی کا شاگرد اور اشرف کا خواجہ تاش تھا۔ ولی، رضی اور اشرف کی ہم طرح غزلیں پائی جاتی ہیں۔ اشرف نے رضی کے ایک مصرع پر مصرع بھی لگایا ہے

اس مصرعۂ رضی کا اشرف ہے دل سے بھوکا
بیغم ہمارے غم کوں کھاتا نہیں سبب کیا

---

۱ سفارش حسین رضوی اردو مرثیہ ص ۱۱۳

۲ خواجہ خاں حمید اگلشن گفتار ص ۱۲

رضی کے نو مرثیے اڈنبرا یونیورسٹی میں محفوظ ہیں۔ اشعار[1] کی کل تعداد ۸۷ ہے۔ مذکورہ بالا مرثیوں میں کا ایک مرثیہ راقم کے کتب خانہ کی ایک بیاض میں بھی پایا جاتا ہے۔

غم سوں ہے بے قرار میرا دل	دکھ سوں ہے زار زار میرا دل
گلشنِ غم سے ہے شہیداں کے	لالہ داغدار میرا دل
نت شہیداں کے زخم غم سیں	شق ہے جوں ذوالفقار میرا دل
نیم بسمل نمن تڑپتا ہے	ہو کے غم کا شکار میرا دل
گرد غم سوں امام کے اے رضی	کیوں نہ ہو پر غبار میرا دل

ظلم دشتِ کربلا

(از مراثی رضی)

نالہ و فریاد و واویلا ہے اے پروردگار	غم ستیں آل نبی کا دل ہوا ہے بے قرار
ظلم دشت کربلا میں دیکھ بے حد و شمار	اسی محشر تلک روتے ہیں وہ کہ سوں زار زار

داغ غم سوں شاہ کے ہر ہر طرف کھیلا ہے باغ	لالۂ خونی کفن ہے دل میں تب سوں داغ داغ
پھول بن میں جب ستی پایا ہے اس غم کا سراغ	جامہ اپنے بر منے پہنا ہے سوسن سوگوار

ماتم شہ سوں پڑی خرمن پہ دل کے بیجلی	تب ستے حاصل ہوئی افسوس ہم کوں بے کلی
نین جوں بادل کنی، ہو راہ جیسے بانسلی	غم کے جنگل میں بجاتا ہوں سدا بے اختیار

آج خاطر جمع کا ہے مجھ پریشاں حال کی	گرچہ ہے ترکِ ادب تفسیر اس اجمال کی
ایک عاشورا کہاں قیامت ہے نبی کے آل کی	دیکھ تن سوں سر جدا جیوں آفتاب نیزہ دار

---

[1] قلمی بیاض مملوکہ راقم

نہیں رضیٰ معلوم رازِ حق تعالیٰ کا سبب نورِ چشم ساقیٔ کوثر بہوت ہو مضطرب
چشم تر جوئے فرات اوپر کھڑے جب تشنہ لب نوح کا طوفاں مگر اُس وقت ہوتا آشکار

(بیاض ۔ مرثیہ نمبر ۲۳، بہ حوالہ اردو شہ پارے)

عزلت

میر عبدالولی عزلت سید سعد اللہ سلونی کے بیٹے ہیں ۔ سید سعد اللہ عالم متبحر تھے اورنگزیب ان کے علم و فضل کا قائل تھا ۔ انھیں بادشاہ سے خط و کتابت کا بھی شرف حاصل تھا ۔ حج بیت اللہ سے واپسی پر سید سعد اللہ نے سورت میں مستقل اقامت اختیار کر لی تھی جہاں سنہ ۱۱۳۸ھ مطابق سنہ ۱۷۲۵ء میں ان کا انتقال ہوا ۔

عزلت سید سعد اللہ کے منجھلے بیٹے سنہ ۱۱۰۴ھ مطابق سنہ ۱۶۹۲ء میں پیدا ہوئے ۔ عزلت بھی اپنے والد کی طرح منقولات و معقولات میں بلند درجہ رکھتے تھے ۔ عزلت کو فنون لطیفہ (شاعری، موسیقی، مصوری) میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا ۔ انھیں خطاطی میں بھی مہارت حاصل تھی ۔ اور عربی فارسی کے علاوہ انھیں ہندی میں درک حاصل تھا ان کے زمرہ احباب میں خان آرزو، میر تقی میر، گردیزی، شفیق اورنگ آبادی، آزاد بلگرامی وغیرہ جیسی مقتدر ہستیاں تھیں ۔ امرا میں بھی یہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے

میر عبدالولی کا تخلص تو عزلت تھا لیکن وہ عزلت نشیں نہیں تھے ۔ ان کے دلی اور مرشد آباد اور حیدر آباد کے سفر کا پتا چلتا ہے ۔ حیدر آباد میں صلابت جنگ نے انھیں دو گانو بطور وظیفہ دیے ۔ دکن میں انھوں نے مستقل اقامت اختیار کر لی اور عمر کے آخری بیس سال وہیں گذار کر سنہ ۱۱۸۹ھ مطابق سنہ ۱۷۷۵ء میں انتقال کیا ۔ ان کا مزار میر مومن کے دائرہ میں ہے ۔

عزلت فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ۔ ان کی تصانیف ۔ میں اردو دیوان، فارسی دیوان، راگ مالا، بارہ ماسہ، تعلیقات پر حواشی میر زاہد، شطرنج کبیر جدید اور ایک بیاض کا پتا چلتا ہے ۔ اردو دیوان اور راگ مالا سنہ ۱۹۶۲ اور ۱۹۷۲ء میں

بالترتیب اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شائع ہو چکے ہیں۔ دونوں کے مرتب انسٹی ٹیوٹ کے ریسرچ اسسٹنٹ عبدالرزاق قریشی صاحب ہیں۔

معلوم ہوتا ہے عزلتؔ نے مرثیہ کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے مرثیے دستیاب نہ ہو پائے صرف دو شعر ملتے ہیں۔

وا مصیبت مصطفےٰ کا جان آج ۔۔۔ خاک پر بے سر پڑا ہے بے جان آج

ہے غلام اے شاہ عزلتؔ نت لول ۔۔۔ دے اثر اس کے سخن کوں یا رسولؐ

عزلتؔ کی مرثیہ گوئی کی ایک اور شہادت اس طرح بھی ملتی ہے کہ انھوں نے مرثیہ گویوں پر اعتراض کیا ہے:

خام مضمون مرثیہ کہتے سوں چپ رہنا بھلا
پختہ درد آمیز عزلتؔ نت نوں احوالات بول[1]

مندرجہ بالا شعر سے گمان ہوتا ہے کہ وہ مرثیے خود بھی کہتے ہوں گے نیز ان کے ذہن میں مرثیہ کے لیے بلند معیار موجود تھا۔

عزلتؔ کی مرثیہ گوئی کی وضاحت عبدالجبار ملکاپوری کے بیان سے بھی ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں کہ عزلتؔ اہل بیت کے مدّاح تھے۔ اسی وجہ سے بعض لوگ انھیں امامیہ مشرب کے پیرو سمجھتے تھے۔ وہ ماہ محرّم میں دس روز وعظ کہتے اور مرثیے بھی پڑھتے تھے[2]۔ ایک بلند پایہ شاعر جب محرم میں وعظ کہتا ہو، نیاز دلواتا ہو اور اہتمام کرتا ہو اس کے متعلق ماننا ہوگا کہ وہ کم از کم ماہ محرم میں ضرور مرثیے لکھتا ہوگا۔

ہاشم علی

ہاشم علی کا نام علی محمد خاں تھا۔ مگر اس نے تخلص ہاشم علی اختیار کیا تھا۔ اس کے مرثیوں کا

---

[1] سفارش حسین رضوی، اردو مرثیہ ص ۱۲۰

[2] ڈاکٹر محی الدین قادری زور ار دو شہ پارے ص۱۵۳ [3] عبدالجبار صوفی ملکاپوری 'تذکرہ شعرائے دکن جلد دوم ص۸۱۸

مجموعہ دیوان حسینی کے نام سے پایا جاتا ہے۔ دیوان حسینی کے آخر میں کاتب نے تمتہ یوں لکھا ہے

"تمام شد دیوان حسینی گفتۂ علی محمد خاں دام ظلہ تخلص ہاشم علی"

ان مرثیوں میں بھی ایک شعر مجموعہ کے نام کے متعلق ملتا ہے۔

توں لکھا ہے کربلا کا یوں بیاں ہاشم علی

ہے یو "دیوان حسینی" نام اس دیوان کا

دیوان حسینی کا ایک نسخہ اڈنبرا یونیورسٹی میں موجود ہے۔ اس کی نشاندہی ڈاکٹر زور اور نصیر الدین ہاشمی نے اردو شہ پارے اور یورپ میں دکھنی مخطوطات میں کی ہے۔ اس مجموعہ کا ایک نسخہ پونا میں پروفیسر شیخ عبدالقادر کے کتب خانہ میں بھی موجود ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے یہ نسخہ دیکھا تھا اور اس پر مولانا نے ایک مفصل مضمون سپرد قلم کیا ہے جو نقوش سلیمانی میں شامل ہے۔

بقول ڈاکٹر زور دیوان حسینی ضخیم نہیں ہے۔ زور صاحب نے مرثیوں کی تعداد ۲۳۸ بتائی ہے اور نصیر الدین ہاشمی نے تعداد ۳۰۰ لکھی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس طرح صراحت کی ہے کہ مجموعہ میں تین سو صفحات ہیں اور ہر صفحہ پر تقریباً سترہ اشعار درج ہیں۔ اس حساب سے اشعار کی مجموعی تعداد ۵۱۰۰ ہوتی ہے۔ اس اطلاع کی روشنی میں یہ کہنا مناسب نہیں کہ دیوان ضخیم نہیں۔

تذکروں میں ہاشم علی کا ترجمہ نہیں ملتا۔ خواجہ خان حمید اورنگ آبادی کا تذکرہ گلشن گفتار اور میر تقی میر کا تذکرہ نکات الشعرا دونوں ۱۱۶۵ء میں مرتب کیے گئے ہیں لیکن ان دونوں میں بھی ہاشم علی کا ذکر نہیں ہے۔ ممکن ہے مرثیہ گو ہونے کی وجہ سے اس کو شامل نہ کیا گیا ہو۔ غرض اس کے وطن سے متعلق کوئی بیرونی شہادت نہیں پائی جاتی مگر اس کے کلام میں بعض اشارے ایسے ملتے ہیں۔ جن کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا وطن گجرات تھا۔ مثلاً

گجرات میں پڑے جب یہ مرثیے کو یاراں

سن کر چلے ہیں روتے دکھنی دکھن کوں اپنے

ا؎ مولانا سید سلیمان ندوی، نقوش سلیمانی ص ۲۲۸

ہاشم علی عجب نشیں یہ مرثیے کو سُن کر
تجھ پر خلیفہ قادر تحسیں کرے دکھن میں
ہاشم علی لے آئے محباں نے یو خبر
دکھن سے ہو کے تیرے سخن کر بلا چلے

ان اشعار سے یہ واضح ہے کہ ہاشم علی گجرات کے کسی شہر میں رہتا تھا۔ بعض اشعار میں اس نے لفظ نگرا استعمال کیا ہے۔ جیسے

سن نگر میں شور محشر ہر گلی ہے شب قتل شہیداں آج رات
یہ نگر میں شور شہ کے باج ہے اس الم کا نالہ گھر گھر آج ہے

گجرات میں نگر نامی کوئی شہر نہیں ہے لیکن بعض شہر ایسے ہیں جن کے نام میں آخری جز و نگر ہے۔ ایک ہے اسلام نگر جو موجودہ دور میں پوربندر کے نام سے مشہور ہے آزادی سے قبل پوربندر کاٹھیاواڑ (سوراشٹر) میں ایک ہندو ریاست تھی۔ دوسرا شہر احمد آباد سے پچاس میل کے فاصلے پر احمد نگر کے نام سے مشہور تھا۔ اس کو ہمت نگر کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اسی طرح گجرات میں ویس نگرا اور وڈ نگر بھی شہر ہیں۔ غرض لفظ نگر شہر کے لیے عموماً استعمال ہوتا ہے۔ راقم کو ایک دفعہ کاٹھیاواڑ میں مانگرول جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ مانگرول مسلم ریاست تھی۔ اس ریاست کا حکمراں خاندان مرحوم قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی کا ننہیال تھا۔ اس کے ایک حکمراں نواب حسین میاں صاحب کے دور میں ریاست میں اردو شاعری کا کافی چرچا تھا۔ حضرت داغ دہلوی، مشتاق رامپوری کچھ مدت ریاست مذکور میں دربار سے منسلک رہے تھے۔ تسلیم، جلال، شمشاد وغیرہ کو بھی اس دربار سے وظیفے ملتے رہے ہیں۔ اس ریاست کے ایک شاعر جناب خوشتر سے ملاقات کے موقع پر انھوں نے بتایا کہ ہاشم علی مانگرول کا رہنے والا تھا۔ اس کے چند شعر بھی سنائے جن میں سے ایک مصرع یاد رہ گیا۔

منگرول کی گلی میں ہاشم علی یو بولا

بااین ہمہ تیقن کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ پوربندر کا رہنے والا تھا یا مانگرول کا

یا احمد آباد سے اس کو وطنی تعلق تھا۔

ہاشم علی کے زمانۂ حیات کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے لیکن اس کے ادبی دورِ حیات کے متعلق بعض اندرونی شہادتیں مل جاتی ہیں۔ دیوان حسینی میں ایک عبارت ملتی ہے۔

"از جملہ تفصیلات امام شہید کہ بریں عاصی شدہ آنست کہ برادر ایمانی حافظ کلام ربانی فضل الدین در عالم رویا بتاریخ بستم ماہ مبارک رمضان ۱۱۴۸ھ مشاہدہ نمود وغیرہ۔

عبارت مذکورہ ایک مرثیہ کی تمہید میں لکھی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہاشم علی ۱۱۴۸ھ میں زندہ تھا۔ اسی دیوان میں ایک مرثیہ کے آخر میں یہ شعر ہیں۔

جب منجم نے کیا اس دردنامہ کا حساب

غین وقاف وسین وطا آیا رقم اندر کتاب

۱۰۰۰ ۱۰۰ ۶۰ ۹ ۱۱۶۹ھ

سن کے یو تاریخ کوں سینہ میں دل ہوتا کباب

ختم کر ہاشم علی قاسم کی شادی کا بچن

دوسرے شعر میں آخری لفظ بچن مولانا سید سلیمان ندوی نے دیا ہے۔ زور صاحب نے لفظ بیں لکھا ہے۔

ان شہادتوں سے ظاہر ہے کہ ہاشم علی ۱۱۴۶ اور ۱۱۶۹ کے درمیان زندہ تھا۔ یہ زمانہ اس کی مقبولیت اور پختگیٔ فن کا معلوم ہوتا ہے۔ نہ جانے ۱۱۴۸ کے کتنے سال قبل سے وہ مرثیہ کہتا رہا ہوگا۔ اور یہ بھی کہنا مشکل ہے کہ کب تک اس میدان میں شہ سواری کرتا رہا۔ اس کو ولی گجراتی کا ہمعصر تو نہیں کہہ سکتے مگر اس کے ولی کے فوراً بعد کا شاعر ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔

ہاشم علی کے مرثیے دکن میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہوں گے۔ بعض مرثیوں میں دکن کے مرثیہ گو استادوں کو اس انداز سے یاد کرتا ہے گویا ان سے اس کے ادبی راہ و رسم بھی تھے۔ جیسے:

ہاشم علی عجب نیں یوں مرثیہ کوں سن کر   بجھ پر خلیفہ قادر تحسین کرے دکھن میں

ایک مرثیہ میں وہ بعض شعرا کو اس طرح یاد کرتا ہے۔

ہزار حیف نیں شاعراں دکھن   سوروحی و مرزا او قادر نہیں

اس شعر سے کئی باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ روحی و مرزا ہاشم علی سے پہلے انتقال کر چکے تھے۔ وہ اپنے مرثیوں کو بلند پایہ خیال کرتا تھا۔ اور بلند پایہ مرثیہ گویوں ہی سے داد سخن کی توقع رکھتا تھا۔ ایک بات اور غور طلب ہے کہ ہاشم علی دکن کے مرثیہ گویوں کو محبت سے یاد کرتا ہے لیکن گجرات کے کسی مرثیہ گو کا ذکر نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ دکن میں شیعت کا زور تھا اور گجرات میں نہیں تھا اگرچہ محرم گجرات میں بھی اہل سنت والجماعت بڑے اہتمام سے مناتے تھے اور مرثیے بھی کہتے تھے۔ گجرات کے مرثیہ گو اگرچہ غیر معمولی نہیں تھے۔ مگر انھیں معمولی بھی نہیں کہہ سکتے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ گجرات میں صنف مرثیہ کی محض نمایندگی ہوتی رہی ہے۔ دکن کے مرثیہ گو ہر حیثیت سے بلند درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک بات اور مذکورہ شعر سے واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک مرثیہ کے لکھنے کے وقت خلیفہ قادر زندہ تھا۔ جس سے ہاشم علی داد چاہتا ہے۔ اور دوسرے مرثیہ میں اس کو اس طرح یاد کیا گیا ہے کہ وہ مر چکا تھا۔ اس سے قادر کے زمانۂ حیات پر صرف اتنی روشنی پڑتی ہے کہ وہ ۱۱۹۵ سے قبل مر چکا تھا۔ اور ۱۱۸۴ میں زندہ تھا۔

ہاشم علی پیشہ ور مرثیہ گو نہیں معلوم ہوتا اور نہ وہ شاعر ہونے کا دعویدار ہے وہ بربنائے عقیدت مرثیہ لکھتا تھا اور وہ بھی سال میں دو ایک مرثیے۔ اگر پیشہ ور ہوتا تو مرثیے لکھ لکھ کر بیچتا پھرتا اور اس کا مجموعہ بہت ضخیم ہوتا۔ ہاشم علی نے اپنے لیے صرف مرثیے کا میدان چن لیا تھا۔ وہ خود کہتا ہے کہ مرثیہ کے سوا دوسرے اصناف میں شعر نہیں کہتا۔

ہاشم علی ہمیشہ ثنا خوان شاہ کا   غیر مدح و منقبت سخن اس نے لکھا نہیں[1]

شاعری بیں بو مقرر ہے تجھے ہاشم علی   جو ثناد مرثیہ شعر دگر کہنا غلط[2]

ہاشم علی کئی جگہ اپنے خلوص نیت کا اظہار اس طرح کرتا ہے۔

---

[1] تا [2] ڈاکٹر زور: اردو شہ پارے۔ ص ۱۱۲

ہوس نہیں شاعری یاراں مجھے ہے مدعا زاری
سخن میں کر خطا دیکھو کرم سیتیں گناؤ مت

عقیدتمندی اور خلوص مقصد کی وجہ سے ہاشم علی کو اکثر خوابوں[1] میں بزرگ ہستیوں کا دیدار نصیب ہوتا تھا وہ اس کو اپنے مرثیوں کی برکت سمجھتا تھا۔ اپنے مرثیوں کی بنا پر اس کو اپنی نجات کا بھی یقین تھا کہتا ہے۔

حشر کے میدان میں جب نور چشم مصطفےٰ
روضۂ رضواں کو بھیجیں گے محباں کو چھوڑا
یاد کر ہاشم علی تجھ کوں کہیں روز جزا
وہ ہمارا کمتریں مداح شاعر کاں گیا[2]

ہاشم علی ہر سال دو ایک مرثیے لکھتا تھا۔

تجھ کوں ہاشم حسین سرور ہر برس مرثیہ لکھاتے ہیں[3]۔

اس نے بعض مرثیے مخصوص تقریبوں کے لیے بھی لکھے ہیں۔ دو مرثیے پچاس پچاس شعر کے لکھنے کے بعد آخر میں لکھتا ہے۔

۱۔ ازیں جارو بروئے تابوت ایستادہ شدہ میخواند و آہستہ روانہ شوند[4]

۲۔ درمیان روز سیوم کہ در اصلاح روز پھول و زیارت گویند و ایں مرثیہ مخصوص آں روز است[5]"

۳۔ مرثیہ چہلم کہ باصطلاح اہل ہند چالیسواں گویند و مناسب است کہ دراں روز یا شب خواندہ شود[6]

ہاشم علی کا جو کچھ کلام مولانا سید سلیمان ندوی، پروفیسر زور صاحب اور مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب کے توسط سے منظر عام پر آیا ہے۔ اس کے پیش نظر اس کے

---

[1] اردو شہ پارے میں کئی خواب بیان کیے گئے ہیں ص۱۶۳

[2] اردو شہ پارے ص ۱۶۲ [3] نالہ اردو شہ پارے ص ۱۶۵

کلام کی زبان ولی کے دور کی زبان ہے۔ مثلاً سیں، سوں، سیتیں، کوں، جلیتے = جتنے، اپنے = اتنے انجھو = آنسو، باج = بغیر، اندھکار، اندھارا = تاریکی، منے = میں، نین = آنکھ، اکاس = آسمان، نمانا = جھکانا وغیرہ۔ عام طور پر مستعمل پائے جاتے ہیں۔ مرثیوں کی زبان اور انداز بیان نہایت سلیس وسادہ اور پختہ ہے۔ ہاشم علی عربی سے بھی واقف تھا۔ اس کے مرثیوں میں بعض مصرعے عربی میں پائے جاتے ہیں۔ جیسے: بعض مرثیوں میں تمہیدیں اور خوابوں کا ذکر فارسی میں ہے ایک جگہ یہ بھی اشارہ ہے کہ اس نے حافظ شیرازی کی غزل "دل می رود زدستم" پر مصرعے بہم پہنچائے ہیں۔ غرض وہ عربی اور فارسی میں درک رکھتا تھا۔

جہاں تک معنوی خوبیوں کا تعلق ہے ہاشم علی نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا اچھا ثبوت پیش کیا ہے۔ چونکہ اس نے نہایت خلوص وعقیدت سے مرثیے لکھے ہیں۔ اس لیے ان میں اثر موجود ہے۔ اس کے مرثیے دکن کے مرثیہ گویوں کے مرثیوں سے کم درجہ ہوسکتے ہیں مگر ان میں جو سوز وگداز ہے اس سے قاری پر رقت ضرور طاری ہوجاتی ہے اور دل بھر آتا ہے۔ اس نے مرقعہ نگاری کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مجموعی حیثیت سے اس کے مرثیے معیاری کہے جاسکتے ہیں۔

کہتیں بالو آج میں کس کا جھولاؤں پالنا
بانے اصغر باج میں کس جھولاؤں پالنا

اے جان مادر کہاں ہے تو پھر کریں تجھ کو کہاں لگو
بیٹھی اکیلی کیا کروں کس کا جھولاؤں پالنا

بریں سولاؤں میں کسے درد بلاؤں میں کسے
جاباں بناؤں میں کسے کس کا جھولاؤں پالنا

سویا ہے گردن ڈال کیوں الجھے زلف کے بال کیوں
رنگیں لو ہوسیں گال کیوں کس کا جھولاؤں پالنا

تو کھول انکھیاں میں دیکھوں تو بول بتیاں میں سنوں
رونا نہیں تو کیا کروں کس کا جھولاؤں پالنا

تو چھوڑ کر مجھ کو کہاں گیا توں دو دکس کا کیوں پیا
بسرا ہے میری کیوں میا کس کا جھولاؤں پالنا

بھیگا لہو میں ہے گلا، لیتی ہوں تیری میں بلا
توں پاس اپنے مجھ لولا کس کا جھولاؤں اپنا

جاؤں کدھر میں کیا کروں، یہ گود خالی لے پھروں
اصغر اصغر میں کہوں کس کا جھولاؤں اپنا

یہ دیکھ میرا حال توں، توری موں سر کے بال کوں
میں دل کی حالت کیا کہوں کس کا جھولاؤں پالنا

تھے کھیلنے کے دن تیرے، کیا عمر تھی، کیا سن تیرے
نہیں چین مجھ کو بن تیرے کس کا جھولاؤں پالنا

نہیں بھولی مجھ کو توں کبھوں تجھ یاد کرنے میں رہوں
رو رو کے تجھ بن دن بھروں کس کا جھولاؤں پالنا

یہ بہن تیری غمگسار، بیٹھی ہے روتی زار زار
تو اٹھ سکینا کو پکار کس کا جھولاؤں پالنا

تو روٹھ ہٹ کر کہاں گیا، میں تجھکوں لاؤں پھر منا
منہ ہووے مجھ سوں توں جدا کس کا جھولاؤں پالنا

تیری صورت پر میں فدا پھرتا نظر میں تو رہا
جب کہ لحد میں توں گیا کس کا جھولاؤں پالنا

جانا نظر سین نور کیوں توں مجھ سوں ہونا دور کیوں
آتا ہے غم کا پور کیوں کس کا جھولاؤں پالنا

کہاں سیں اجل تھی گھات میں گولے کے تجھ کو ہات نہیں
بالا کیا جی بات میں کس کا جھولاؤں پالنا

اے میرے پیارے لاڈلے، پھر آکے لگ توں مجھ گلے

انجھوں نین سیں بہ چلے کس کا جھولاؤں پالنا

کہاں کھیلتا ہے آج تو، خالی یہ گھر باج یوں

جاتا ہے میرا راج کیوں کس کا جھولاؤں پالنا

ہاشم علی کوں نہیں تواں، بانو کا لکھنا سب بیاں

کہتی تھی ہر دم با فغاں کس کا جھولاؤں پالنا[1]

بچّے کا غم

بالے اصغر کے تئیں بلاتی رہی — سونا یہ پالنا جھولاتی رہی

جھولا تیرا پڑا رہا خالی — ڈوری مجھ ہات میں بلاتی رہی

ہائے کیوں روٹھ کر گیا مجھ سوں — مرے پیارے کے تئیں مناتی رہی

بھول کیوں توں چلا میّا میری — آرے اصغر تجھے بلاتی رہی

میں سلاتی تھی جب لگا چھاتی — آنچل اپنا تجھے اوڑاتی رہی

رات دن میں کبھو نہ دی رونے — کر کے باتاں تجھے ہنساتی رہی

تھا برس گانٹھ کا تجھے ارمان — لال جاماں ترا سلاتی رہی

قاسم آیا ہے جب بھیانے کوں — میں تماشا تجھے دکھاتی رہی

لہو بھرا کیوں ترا چند مکھ ہے — جس کوں ہاتھوں سے میں دھلاتی رہی

دودھ پینا مرا گیا بالے — غم سوں چھاتی مری بھر آتی رہی

تج کوں بھاتی نہ تھی اندھاری رات — تری خاطر دلوا جلاتی رہی

کر کے تعویذ دل اوپر رکھنی — بد نظر سے تجھے یہ چھوپاتی رہی

کیوں نہ آخر ہوئی عمر میری — تجھ بنا حیف جگ جیاتی رہی[2]

---

[1] مولانا سید سلیمان ندوی، نقوش سلیمانی ص ۲۲۵ [2] ڈاکٹر زور ارد و شہ پارے ص ۲۹۴

بی بی فاطمہ کا بین

آیا محرم اوڑنا دھولا را ۔ روتا ہے عالم اس غم بیں سارا
خیر النساء نے تب یوں پکارا ۔ میرا حسینا ناحق مارا

ہے ہے حسینا تیری جوانی ۔ تھا قطب تارا تیری پیشانی
دوجا نہیں تھا کوئی جگ میں ثانی ۔ میرا حسینا ناحق مارا

جب تشنگی سوں توں تلملایا ۔ ساتوں سمندر تب کھل بلایا
نہیں ظالماں نے پانی پلایا ۔ میرا حسینا ناحق مارا

توں عرش کا تھا روشن ستارا ۔ تیرا اشرف تھا سب آشکارا
ہے آج تیرا سوتن سوں نیارا ۔ میرا حسینا ناحق مارا[1]

رضا

رضا کے گجراتی ہونے کی دو شہادتیں ملتی ہیں۔

۱۔ حدیقۂ احمدی مولفہ شیخ احمد بخش میاں (عمدۃ التجار) میں ایک باب گجرات کے شعرا سے متعلق ہے۔ اس میں تحریر ہے "رضا یکی از شعرائے گجرات بودہ" اور اس کا ایک شعر دیا ہے[2]۔

نہ کہنا اے رضا کی نے (کسی سے) اپیں کے دل کے مطلب کوں
نہ بول اپنا، سخن اپنا بیاں اپنا

---

[1] ڈاکٹر زور اردو شہ پارے صفحہ ۲۹۶ [2] بیاں = بیا

۲۔ اس کے ایک مرثیہ کے مندرجہ ذیل شعر سے بھی یہ واضع ہوتا ہے کہ وہ گجرات سے تعلق رکھتا تھا۔

اے رضا قاسم کے جلوہ کا بیاں کر توں تمام
تجکو محشر ہیں شفیع ہوکر چھڑاویں گے امام
مرثیہ بجھ کن لکھا کر لے گئے ہیں ہر کدام
لے گئے دکھنی دکھن کوں آج ہے قاسم کا بھیا

سید عبدالولی عزلت سورتی نے کسی وقت مرثیہ گویوں کی کم مایگی پر اس طرح اعتراض کیا تھا۔

خام مضمون مرثیہ کہنے سے چپ رہنا بھلا پختہ در آموز عزلت نت توں احوالات بول

رضا نے عزلت کے اس اعتراض کا جواب یوں دیا ہے:

اے عزیزاں گرچہ عزلت مرثیہ ہیں یو کہیا
خام مضمون مرثیہ کہنے سوں چپ رہنا بھلا
لیکن اس مظلوم سے سر کا بیان کرنا روا
تاکہ سن کے یو بیاں ہوویں محباں اشکبار

ڈاکٹر زور کا بیاں ہے کہ اڈنبرا یونیورسٹی میں رضا کے پندرہ مرثیے موجود ہیں جن کے اشعار کی تعداد ۳۶۰ ہے[1]

رضا ہاشم علی کا ہمعصر تھا۔ چونکہ اس کا زیادہ کلام ہمارے سامنے نہیں ہے اس لیے اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ کرنا ممکن نہیں مگر اس کے خود بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مقبول شاعر تھا۔ اور شہرت حاصل تھی۔ ایک مرثیہ میں اس نے یہ ظاہر کیا ہے کہ مرثیہ گوئی کی برکتوں سے وہ بہت مشہور اور کامیاب شاعر بن گیا ہے[2] ڈاکٹر زور کو رضا کے مرثیوں کے مطالعہ کا موقع ملا تھا۔ ان کا بیان ہے

---

[1] بھیا سے بیاہ۔ ڈاکٹر زور۔ اردو شہ پارے ص ۱۶۱

[2] ...

کہ رضا اپنے زمانہ کا اچھا شاعر تھا۔ اس کو اپنے ہمعصر مرثیہ گویوں سے مقابلہ بھی کرنا پڑا تھا۔ وہ متعدد مرثیہ نویسوں کا استاد بھی تھا۔ لوگ مرثیے لکھوانے کے لیے اس کی خوشامد کرتے تھے۔

نہیں ہے طاقت نا کروں غم کا سویں سارا بیاں
تم کرو زاری سہاں کی آج اے پیر و جواں
آفریں مجھ کوں کہو اے شاعران و ذاکراں
کرتا ہوں اب میں سخن کوں آج ہے قاسم کا بھیا
اے رضا قاسم کے جلوہ کا بیاں کر توں تمام
تجھ کوں محشر میں شفیع ہو کر چھڑا دیں گے امام
مرثیہ تجھ کن لکھا کر لے گئے ہیں ہر کدام
لے گئے دکھنی دکھن کوں آج ہے قاسم کا بھیا

(بہ حوالہ سفارش حسین رضوی، اردو مرثیہ، ص ۳۴، ۱۳۲)

غلامی

غلامی گجرات کا ایک نہایت پرگو شاعر تھا۔ اس کا نام غلام رسول تھا۔ اس کا آبائی وطن سورت تھا۔ لیکن اس نے کھمبایت میں بود و باش اختیار کر لی تھا۔ وہ ریختہ، مثنوی مرثیہ مناقب وغیرہ کئی ہی اصناف میں شاعری کرتا تھا۔ اور ہر ایک صنف میں مختلف تخلص اختیار کرتا رہا۔ اپنے تخلص سے متعلق لکھتا ہے۔

غلام رسول نام ہے گا مرثیوں میں — تخلص مطالب ہے سب ریختوں میں
مناقب مدح میں انور مدامی — ہے قصوں میں لقب میرا غلامی[1]

غلامی کی مثنوی تمیم انصاری مشہور ہے۔ کئی بار یہ مثنوی بمبئی سے شائع ہو چکی

---

[1] ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی "لوائے ادب"

ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۱۸۸ھ ہے۔ غلامی نے اس بات کا مثنوی میں اظہار کیا ہے کہ مثنوی مکمل ہونے کے بعد بمقام کھمبایت بندھاروں کی مسجد میں ایک مجلس میں پڑھی گئی تھی۔ اور شیرینی تقسیم کی گئی تھی۔ اس نے ایک جگہ اپنے استاد حضرت فدا کا ذکر کیا ہے۔

فدا ہیں گے میرے استاد اشعار میں نے سیکھا جین (جن) سے کہنا اشعار

ڈاکٹر زور نے اردو شہ پارے میں ایک غلامی مرثیہ گو کا ذکر کیا ہے۔ جس کے سترہ مرثیے اڈنبرا میں محفوظ ہیں[1]۔ گمان ہوتا ہے کہ اسی گجراتی غلامی کے مرثیے ہوں گے۔ ڈاکٹر زور نے اس امر میں اپنی رائے بھی پیش کی ہے کہ غلامی گجرات کا شاعر ہونا چاہیے اور دلیل کے طور پہ یہ لکھا ہے کہ غلامی نے ایک جگہ اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ گجرات چھوڑ کر کربلا جانے کا خواہشمند ہے۔ اگرچہ وہ خود لکھتا ہے کہ مرثیہ میں وہ غلام رسول تخلص کرتا ہے۔ تاہم ہمارا گمان یقین کی حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے کہ مرثیہ گو غلامی مثنوی گو غلامی ہی ہے۔

زور صاحب نے غلامی کو ہاشم علی، رضا وغیرہ کا ہمعصر بتایا ہے۔ لیکن غلامی نے اپنے ایک مرثیہ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جس شہر میں وہ رہتا تھا وہاں دوسرے بہت مرثیہ گو موجود تھے۔ شہر کھمبایت جہاں غلامی نے مستقل اقامت اختیار کر لی تھی۔ وہاں آخری ناظم گجرات مومن خاں بانیٔ ریاست کھمبایت کی وجہ سے شیعیت کا چرچا رہا۔ وہاں کے بیشتر خاندان مغلوں اور ایرانیوں کی نسل سے چلے آتے ہیں۔ عہد قدیم میں بھی بہت سے ایرانی تاجروں نے کھمبایت کو اپنا وطن ثانی بنا لیا تھا۔ گجرات میں آج بھی شیعیت کا بڑا مرکز کھمبایت ہے۔

قاسم کی رخصت

دوہرا غم آکے گھیرے گا شاہ زمن کوں آج جلوہ میں کیوں بٹھائے ہیں ابن حسن کوں آج

---

[1] اردو شہ پارے ص ۷

کھونگھٹے میں سوگ آن پڑے گا دولہن کوں آج
قاسم خدا کے واسطے مت توں دن کوں آج

غلطان خوں ہونے ہیں سب احباب و اقربا
باندھے کمر زبہرے شہادت وہ مقتدا
قاسم نے اذنِ حرب طلب کر کے یوں کہا
عمو نہ جاؤ رن کو رضا دو ہمن کو آج

رحلت کے دن پدر یو وصیت کیا مجھے
تجھ پر نثار ہونے نصیحت کیا مجھے
تاکید کر کے کام کی رخصت کیا مجھے
یہ سن انجھو میں شہ نے کیتے پر نین کوں آج

بدلے اگر تجھے یو وصیت کیا پدر
حق میں ترے مجھے بھی جو کے وہ نامور
لاؤں بجا میں حکم برادر توں کر صبر
یو بات کر طلب کئے سرور کہے بہن کوں آج

خیمہ میں اپنے لایا وہ دلھن کو نوجواں !
ہل من مبارز اہلِ ستم بولے ناگہاں
دستِ عروس چھوڑ کے قاسم ہوئے رواں
بولے خدا کوں سونپ چلا ہوں تمن کوں آج

دامن پکڑ عروس لگے رونے غم ستیں
کہتے میاں ابھی ہیں اوٹھانے ہو ستیں
بولے کہ شوخی کرتے ہیں اعدا ستم ستیں
جا کر بٹھاؤں غرفۂ دوزخ وطن کوں آج

کہنے لگے کہ ہوتے ہو یا ابن عم جدا
بیکس اکیلی چھوڑ مجھے دکھ میں مبتلا
تم کوں کریں یا شہید مبادا یہ اشقیا
بوا ہو ترستی رہوں پھر میں ملن کوں آج

نوشہ کہیں کہ جلتے بچھڑیں گے نہیں ہمن
دنیا کے بیچ پھر کے ملیں گے نہیں اپن
محشر اوپر ہے وعدۂ دیدار جان من
ہونا ہے پارہ پارہ ہمارے بدن کوں آج

پوچھے کہ روزِ حشر میں پاؤں نہیں کہاں
کیونکہ پچھانوں مجھ کوں بتا جاؤ کچھ نشاں
دل بھر کے مکھ تمہارا نہیں دیکھی در جہاں
ٹک بیٹھو تا کہ سن لو یہ میٹھے بچن کوں آج

یاراں بیاں یہ غم کا نپٹ بے شمار ہے
لعنت دو ظالماں کوں ہزاراں ہزار ہے
بہتر نہ طول قصۂ غم اختیار ہے
جو دکھ دیتے ہیں حضرتِ شاہِ زمن کوں آج

ہے شش جہت میں غم شہ بیکس کا بر ملا
غم کی خزاں کہتے ہیں جنت میں نہ کربلا
روتے ہیں انس و جن و ملائک دریں عزا
یکبارگی سو کھائے ہیں سرو و سمن کوں آج

رونے میں مت قصور کرو رے موالیان
اجڑا ہے کربلا میں محمدؐ کا خاندان
آنسو یہ غم کا حشر میں نہیں جائے رائیگاں
بے آب کر دیے ہیں علیؓ کے رتن کوں آج

ہرگز نہ رکھ توں خوفِ غلامی ز حاسداں
دکھلاویں کربلا تجھے آخر دو سروراں
آلِ عبا ستیں توں مدد مانگ بر زباں
جو آرزو ہے کہہ توں حسین و حسن سوں آج

نوری

نوری کا نام شجاع الدین تھا۔ وہ گجرات کے ایک سید خاندان سے تعلق رکھتا تھا[1] فکرِ معاش میں وہ گجرات سے گولکنڈا گیا۔ اس وقت ابوالحسن تانا شاہ آخری فرماں روا کا زمانہ تھا۔ نوری ابوالحسن کے وزیر سید مظفر کے بیٹے کا اتالیق مقرر ہوگیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ نوری اچھا خاصا پڑھا لکھا شخص ہوگا۔ محض شاعر ہی نہیں تھا۔ میر حسن نے اپنے تذکرہ "تذکرۂ شعرائے اردو" میں لکھا ہے[2] کہ حاسدوں نے نوری پر وزیر زادہ سے

---

[1] ڈاکٹر زور اردو شہ پارے ص ۲۹ [2] میر حسن تذکرۃ الشعرائے اردو ص ۱۷۷

صحبت بد کاالزام لگایا لہذا نوری شرم کی وجہ سے گولکنڈا سے کسی اور جگہ چلا گیا۔ میر حسن نے نوری کا ایک شعر دیا ہے۔

" نوری اپس کے دل کی کسی سے نہ کہہ بنا حاصل بھلا اب اس سے دوانے جو تھا سو تھا

کوئی نظم اس ہیں تو کرتا نہ تھا ولے سب تعصب دیا ہم مٹا
نہ کچھ خوف کھایا نہ جھجکا ذرا ہم مرثیے سے بہل کردیا
شروع میں کیا نظم کل واقعات دہم تک احوال پورا لکھا
ہیں جب اس کوں لوگوں کے آگے پڑھا عجب حال عاشور خانہ میں تھا
جن وانس کرتے تھے سب واہ واہ دکھنی ہیں لکھا ہے کیسا مرثیا
زباں اپنی ہیں کس نے ایسا لکھا کبھی اس سے پہلے سنا ہیں پڑھا

اما ماں سے اس کا ملے گا صلہ
کہ ہے نوری ہی موجد تو اس طرز کا[1]

سیّد

پروفیسر زور کا بیان ہے کہ شاید اس کا نام سید غلام محمد تھا۔[2] انھیں کا بیان ہے کہ اس نے اپنے ایک مرثیے میں انگریزوں کا ذکر کیا ہے۔ جس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ وہ گجرات کا باشندہ ہونا چاہیئے مگر انگریزوں کا محض ذکر کرنے سے اس کو گجراتی کہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اس نے کس انداز میں ذکر کیا ہے اس سے راقم لاعلم ہے۔ اس کے مرثیوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ طب اور نجوم سے واقف تھا۔ اس کے دس مرثیے اڈنبرا میں محفوظ ہیں۔ ان مرثیوں میں دو فارسی زبان میں ہیں۔

---

[1] داستان اردو، بحوالہ نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو ص ۳۰۵

[2] ڈاکٹر زور، اردو شہ پارے ص ۱۷۰

قطرے سے گہر ہونے تک

اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ مخلوط بولی کی حیثیت سے وجود میں آئی اور اپنی صلاحیتوں اور فطری خوبیوں کی بنا پر بولی سے زبان کے درجہ تک پہنچ گئی۔ غیر زبانوں کو اپنا لینا اس کی بڑی خوبی ہے۔ اسی میں اس کی درازیٔ عمر اور مقبولیت کا راز مضمر ہے۔ اس کی عمر ابھی ہزار بارہ سو سال سے زیادہ نہیں ہے۔ اس پر کئی زبانوں کا پرتو پڑتا رہا ہے۔ ان کی صحبت سے اس میں ہمہ گیری اور ہم آہنگی کی صفت پیدا ہوگئی۔ اس کے بننے سنورنے ابھرنے میں امیر غریب، خادم مخدوم، سادھو سنت، صوفی صافی، پڑھے لکھے، ان پڑھ سب نے ہاتھ بٹایا اور جس نے اس کو چاؤ پیار سے بلایا اس کے منھ لگ گئی۔ اس پر سب کا احسان ہے اور سب پر اس کا احسان ہے۔

عیسوی ۷۱۱ میں محمد بن قاسم نے سندھ پر فتح حاصل کی۔ سندھ میں ایک اسلامی حکومت قائم ہوگئی۔ صدیوں کے سماجی وسیاسی تجارتی کاروبار اور اختلاط کا نمایاں اثر سندھی زبان میں عربی الفاظ اور سندھی کے عربی نما رسم الخط سے واضح ہوتا ہے ۱۰۲۲ء میں محمود غزنوی نے پنجاب کو فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا تھا۔ پنجاب ۱۷۵ سال حکومت غزنہ کا صوبہ رہا۔ ہزاروں کی تعداد میں عہدیدار، اہل کار، اہل صنعت وحرفت، علماء وادبا وہاں آباد ہوگئے۔ ۱۲۰۶ء میں قطب الدین ایبک دہلی کا پہلا مسلم بادشاہ قرار پایا۔ وہاں بھی ہزاروں کی تعداد

یں امیر غریب، نوکر چاکر، علما صوفیا وغیرہ قسمت آزمائی کے لیے پہنچ گئے۔ اس سیاسی اُلٹ پھیر سے عربی فارسی، ترکی، ہندی زبانیں بولنے والوں کو ایک دوسرے سے واسطہ پڑا۔ سرکاری افسر ایک زبان بولتے اور دفتری کارندے دوسری زبان بولتے تھے۔ بازار منڈی میں تجّار ہندوستانی اور خریدار غیر زبانیں بولنے والے تھے۔ سودے سلف کے لین دین کے ساتھ لفظوں اور لسانی ترکیبوں کا بھی لین دین ہوتا ہوگا۔ غیر زبانیں بولنے والوں نے بھی دکانیں سجائی ہوں گی۔ اور خریداروں میں ہندوستانی بھی ہوتے ہوں گے۔ بڑے تاجر اپنا مال لے کر مختلف صوبوں میں جاتے ہوں گے۔ اور سفر و قیام میں صوبے صوبے کی زبانوں سے دو چار ہوتے ہوں گے۔ سیاسی فاتحوں نے حکومتیں قائم کر کے اپنا سکّہ ڈھالا مگر اس سے صدیوں قبل عرب اور ایرانی تاجر دکن و گجرات کی منڈیوں میں اپنا سکّہ چلا چکے تھے۔ دکن و گجرات کے ساحلی مقامات پر ظہور اسلام کے پہلے سے عرب ایرانی تاجر آتے رہتے تھے۔ سب سے پہلے اسلام کا پیغام بھی عرب تاجر ہی ہندوستان لائے۔ ۷ویں ۸ویں صدی عیسوی میں عرب اور ایرانی تاجر اور مہاجر گجرات کی بندرگاہوں پر لنگر انداز ہوئے۔ ایرانی تو اس دور میں منڈیوں کے شاہ کا درجہ رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے ہندوستان کو وطن ثانی بنا لیا تھا۔ یہاں کی خاک ایسی دامن گیر ہوئی تھی کہ مر کے بھی جدا نہ ہو پائے۔ ان کی قبریں اور کتبے آج بھی اس کی شاہد ہیں۔ مانا کہ بہت سارا تجارتی کاروبار ترجمانوں کے ذریعہ سے ہوتا ہوگا تاہم یہ لوگ منڈیوں میں اپنے کان زبان بند کر کے نہیں بیٹھتے ہوں گے۔

سیاسی فاتحوں کے ساتھ ساتھ روحانی فاتحوں نے بھی ہند پر عظیم فتح حاصل کر لی۔ ملک گیروں کے ہاتھوں سے ملک نکل گئے۔ ان کے نام و نشان بھی مٹ گئے لیکن روحانی فاتح آج بھی ہمارے دلوں پر حکومت کر رہے ہیں۔ ان نفوس قدسیہ کے طریقے انوکھے تھے۔ ان کے درباروں میں دربان نہیں ہوتے تھے۔ ان کے ہاں ذات پات اور اونچ نیچ کا فرق نہیں تھا۔ یہ اپنے آپ کو مخدوم نہیں بلکہ خادم تصوّر کرتے تھے۔ یہ لوگوں کی عزّت کرتے تھے اور اللہ انھیں عزّت دیتا تھا۔ یہ ملک کے

لوگوں میں گھل مل جاتے تھے۔ ان پاک بندوں نے ہند کی زبانیں اختیار کر لیں، ان کے نام اختیار کر لیے ان کے فلسفوں کو تصوّف کا رنگ دے کر دلوں کو مسخّر کر لیا۔ غرض ان لوگوں نے اپنے حسنِ اخلاق اور اسلامی تعلیمات کے عملی ثبوت کی نفا طیبیت سے عوام کو اپنی طرف کھینچا اور درسِ انسانیت دیا۔ اس میل محبت، بھائی چارہ اور اختلاط کا اردو زبان پر بہت ہی گہرا اثر پڑا اور زبان کے اٹھان کے ساتھ ساتھ اس کی فطرت بھی تعمیر ہوتی گئی۔

ہندوستان میں اللہ والوں کی آمد کا سلسلہ گیارہویں صدی عیسوی سے ہو چکا تھا۔ ان بزرگوں میں شیخ علی ہجویری عرف داتا گنج بخش کو اوّلیت حاصل ہے۔ لاہور میں آپ رشد و ہدایت کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اور وہیں پیوند خاک بھی ہوئے۔ دہلی میں حکومت قائم ہونے کے بعد سے کئی خانوادوں کے بزرگ تشریف لائے ان میں سہروردیہ اور چشتیہ سلسلوں کے بزرگوں کو خصوصیت حاصل ہے۔ بہت قلیل عرصہ میں سلسلوں کے لوگ اٹک سے کٹک اور کشمیر سے کماری تک پھیل گئے۔ شمالی ہند کے بزرگوں میں حضرت بہاالدین ذکریا، حضرت بختیار کاکی، حضرت معین الدین چشتی رح، حضرت فرید گنج شکر، حضرت نظام الدین اولیا، حضرت نصیر الدین چراغ دہلی، حضرت علاالدین صابر، گجرات میں حضرت شیخ حسام الدین متوفی ۷۳۶ھ، شیخ عزیز اللہ متوکل متوفی ــــــ شیخ رحمت اللہ متوفی ــــــ شیخ علی متقی۔ شیخ بہاء الدین باجن متوفی ۹۱۲ھ سید شرف الدین مشہدی متوفی ۸۰۸ء، شیخ احمد کھٹو متوفی ۸۴۹ھ دکن کے حضرت برہان الدین غریب متوفی ۱۳۳۸ حضرت راجو قتال متوفی ۱۳۹۲ عین الدین گنج العلم متوفی ۱۳۹۶ء حضرت گیسو دراز متوفی ۸۲۵ھ میراجی شمس العشاق متوفی ۱۴۹۷ء وغیرہ وہ بزرگ ہیں جنھوں نے وحدت کا پیغام عام کرنے، درسِ انسانیت دینے اور اردو زبان و ادب کو آگے بڑھانے میں غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔

صوفیا نے ہندی زبان کو تو اپنا ہی لیا تھا۔ دیسی زبانوں کو وہ رات دن کی بول چال میں بھی استعمال کرتے تھے اور اس میں متصوفانہ کلام بھی ان سے یادگار ہے۔ اس

کے دوش بدوش اردو کی ابھرتی ہوئی شکل بھی سامنے تھی اور یہ عوام میں مقبولیت بھی حاصل کر رہی تھی۔ لہٰذا بعض صوفیا نے اس بولی کی مقبولیت حاصل ہونے کی وجہ سے اس کو ادبی شکل دیدی۔ اس ادبی کاوش میں گجرات و دکن کے صوفیا شیخ بہاء الدین باجن، علی جیو گام دھنی احمد آبادی متوفی ۹۷۳ھ قاضی محمود دریائی متوفی ۹۴۱ھ گجراتی احمد آبادی خوب محمد چشتی متوفی ۱۰۲۳ھ احمد آبادی، حضرت گیسو دراز، شمس العشاق وغیرہ کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ امیر خسرو کا کلام مشتبہ ہے ورنہ وہی اردو کے پہلے شاعر مانے جاتے۔ یہ بحث ہمارے موضوع سے ہٹ کر ہے۔

گجرات کے بزرگوں میں سے شاہ باجن برہانپور تشریف لائے۔ باجن کا سنہ ولادت ۷۹۰ھ مطابق ۱۳۸۸ء ہے۔ باجن کے والد کا نام شیخ معزالدین تھا۔ باجن شیخ رحمت اللہ کے مرید تھے۔ آپ کے والد بزرگوار گجرات میں قیام پذیر تھے۔ لہٰذا آپ بھی گجرات احمد آباد میں رہتے تھے۔ آپ کئی بار حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے اور نزدیک و دور کا سفر بھی کرتے رہتے تھے۔

خود فرماتے ہیں۔

"این فقیر تا طرف سندھ قریب خراسان و طرف دکن قریب سرحد سیلان سافر بود۔"

ایک بار حج بیت اللہ کے لیے جاتے ہوئے خراسان تک پہنچے تھے کہ سرورِ کونینؐ نے بشارت دی کہ تمہارا حج قبول ہوگیا۔ اور وہ گجرات لوٹ جائیں اور وہاں سے برہان پور جاکر رشد و ہدایت کی خدمت انجام دیں۔ باجن وہیں سے لوٹ آئے اور پہلے خلد آباد جاکر حضرت برہان الدین غریب کے مزار پر حاضری دی۔ متولی درگاہ کو حضرت غریب نے بشارت دی تھی کہ باجن کو ہمارا خرقہ عنایت کر دیا جائے۔ باجن نے دکن سے برہان پور پہنچ کر خانہ پور میں قیام کیا۔ جب بادشاہ کو اطلاع ہوئی تو اس نے امرا کو استقبال کے لیے بھیجا۔ باجن برہان پور تشریف لائے اور شاہ بازار میں ایک جگہ اقامت اختیار کرلی۔ بادشاہ نے اس جگہ ایک مسجد اور خانقاہ تعمیر کرادی۔ آپ نے ۹۱۲ مطابق ۱۵۰۶ء میں وفات پائی۔ آپ کا مزار اسی جگہ مرجع

خلائق ہے۔ ملفوظ جلالی میں آپ کی تاریخ وفات کا مادّہ "شاہ باجن عاشق اللہ بود" دیا ہوا ہے۔

شاہ باجن نے اپنے پیر و مرشد کے حالات اور تصوّف کے نکات اپنی تصنیف خزانۂ رحمت میں بیان کیے ہیں۔ خزانۂ رحمت کا ایک ناقص نسخہ اورینٹل کالج لاہور میں ہے۔ دوسرا نسخہ کراچی میں پایا جاتا ہے ایک نسخہ برھان پور کے عالم خطیب جامع مسجد کے حضرت احکام اللہ مرحوم کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ اسی نسخہ کا مطالعہ راقم کو بھی نصیب ہوا ہے۔ اس میں شاہ صاحب کا کافی کلام پایا جاتا ہے جس کے مطالعہ سے تشکیلی دور کے کلام کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ صوفیا نے اس عہد کی ہندی کو اپنایا تھا۔ لہذا شاہ صاحب کا ہندی کلام بھی ہے۔ نمونہ ملاحظہ کیجیے۔

یہ فتنی کیا کتے ملتی ہے	جب ملتی ہے تب چھلتی ہے
اُن چھل بہت بھلائے	اُن رو کر بہت رولائے
اس کارن تینہ ترسنہ	جگ ملے تو اس سے نہ لینہ
یہ فتنی انھوں تپاوے	جگ پاس نا نھوں آوے

اس نظم کے چند اور بھی بند ہیں۔ اس پر لکھا ہوا ہے "صفت دنیا بزبان دہلوی نیشتہ" دوسری نظم ہے جس پر لکھا ہوا ہے "ایں مناجات بزبان ہندی گفتہ شدہ است۔"

پڑھ پنڈت پوتھی دھویاں	سب جانا سدھ بدھ کھویاں
سب جوگیاں جوگ بسارے	سب تپئی تپ بکارے
ایک درشنی درشن بھولے	سرنانگے پانو کھولے

وغیرہ (خزانۂ رحمت)

ایک اور نظم ہے "مناقب حضرت ایشان بزبان دہلوی نیشتہ شدہ است"

جب راوت جھوجھن جاونہ	تب تو آگئیں ہوا جائیں
جھوجھ کر باھڑنہ آونہ	تب تو پیچھے ہووا آئیں

اپنے مرشد کے پیے لکھتے ہیں۔

محمد سرور پریم کار حمت اللہ بھریا | باجن جیوڑا وار کر سر آگیں دھریا
میرے مرشد رحمت اللہ عاشق رسول ہیں | باجن اپنی جان ان پر قربان کرتا ہے
باجن جی امر ہے موا نہ کہیو کوئی | جے کوئی موا کہے مودا اودھی ہوی
باجن اپنے پاپ سب جن رور و دھوئے | پایئں نہونا رہا تب لو ہو روے

مولوی معین الدین مرحوم نے حضرت شیخ علی متقی اور شاہ عیسٰی جیدرا للہ کے اشعار نمونتاً اپنی ایک تقریر مطبوعہ میں نقل کیے ہیں۔ آپ کے ملاحظہ کے لیے اشعار یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

شیخ علی متقی!

سُن سہیلی پریم کی باتاں | یوں مل رہے جیوں دودھ نباتا

(بحوالہٗ عاشق و معشوق دودھ اور مصری کی طرح محبت میں ایک جان ہو جائیں اس کو عشق و محبت کہتے ہیں۔

مولوی صاحب نے حضرت شاہ جندا للہ کا بھی ایک شعر دیا ہے۔ فرماتے ہیں ایک دن حضرت برہان الدین راز الہٰی نے دریافت کیا کہ دنیا کیا ہے۔ آپ نے ایک شعر پڑھ دیا۔

جسے ہر کو لبرا دے سہی | دنیا نانو اسی کا کہی!

دنیا اس کو کہتے ہیں جو خدا کی طرف سے غافل کر دے۔

باجن اور اس دور کے دوسرے بزرگوں کے کارنامے ہندی میں بھی ہیں اور مخلوط زبان میں بھی ہیں۔ رفتہ رفتہ زبان میں نکھار پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ سولہویں اور سترھویں صدی عیسوی میں گجرات و دکن میں اس زبان کو فروغ حاصل ہوا۔ صوبائی لسانی خصوصیات کی وجہ سے گجرات میں زبان کو گجری کہا جاتا تھا۔ دکن میں یہ دکنی کہلاتی تھی۔ اور شمال میں یہ دہلوی کہلاتی تھی۔

ایک مدت تک اردو خانقاہوں میں پروان چڑھتی رہی لیکن سلاطین دکن

کے عہد میں یہ زبان شاہ پسند ثابت ہوئی اور درباروں میں باریاب ہوگئی نیز محلوں میں بھی اس کو رسائی حاصل ہوگئی اور جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد کا مصداق بن گئی۔ درباری رکھ رکھاؤ اور محلاتی چاؤ سے زبان متاثر ہوتی گئی۔ شاہی سرپرستی کی وجہ سے ادیب و شاعر میدان میں جوہر دکھانے لگے۔ اس طرح زبان ارتقائی مدارج طے کرتی گئی۔ اس عہد میں فنکار شعرا نے زبان کو کافی آگے بڑھایا لیکن ایک مدت کے بعد زبان کے دھارے میں ٹھہراؤ آنے لگا۔ ایسے میں ولی گجراتی متوفی ۱۷۰۷ء نے جس کو عرفِ عام میں ولی دکنی کہا جاتا ہے اپنی اجتہادی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر شستہ و رفتہ زبان کو غزل کے پیمانے میں پیش کیا۔ حالات ایسے سازگار ثابت ہوئے کہ جدتِ زبان اور ندرتِ اندازِ بیان نے شمال و جنوب میں اس شرابِ دو آتشہ کو مقبول سے مقبول تر بنا دیا۔ فارسی کے بڑے بڑے فنکاروں نے بھی اس زبان میں طبع آزمائی کر کے زبان کی لیاقت و صلاحیت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ اس وقت سے شمال و جنوب میں ایک معیاری ادبی زبان رواج پا گئی۔ اور صوبائی رنگ مٹ گئے۔ ولی کا کثرت میں وحدت کا کرشمہ اردو ادب میں ایک اہم موڑ تھا۔

امیر خسروؔ اور ہندوستانی موسیقی

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں   تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

امیر خسرو بھی ایک ایسے ہی شخص ہیں جو صدیوں میں خاک کے پردے سے نکلے تھے وہ غیر معمولی عقل و فراست اور اجتہادی صلاحیت لے کر آئے تھے۔ انھوں نے تہذیب کے بعض شعبوں میں چراغ روشن کیے، جن کی روشنی سے ان کے بعد آنے والی نسلوں نے فیض پایا۔ آج ان کی ایسی ہی بیش بہا خدمات کا اعتراف کر کے بزم خسرو میں شرکت کا فخر حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

بھارت باہر سے آنے والوں کے لیے ہمیشہ فراخ دل ثابت ہوا۔ یہ ملک سیاسی فاتحوں کے لیے میدان کارزار، تاجروں کے لیے منڈی بازار، مہاجروں کے لیے مستقل گھر بار رہا ہے۔ یہاں جو لوگ آئے وہ بعد میں یہیں کے ہو رہے۔ جو اپنے ساتھ لائے وہ ملک کو دیا اور جو پسند آیا وہ اس سے لے کر اپنا لیا۔ اسی عمل سے ہر دور میں ایک تہذیب وجود میں آئی، جس کو ایک نیا نام دے دیا گیا۔ اس بیان کی تصدیق بھارتی علم و فن موسیقی کے تجزیے سے ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا ورود تاجروں اور مہاجروں کی حیثیت سے آٹھویں صدی عیسوی سے پایا جاتا ہے۔ ۱۱۹۶ء سے یہ سیاسی فاتحوں کی حیثیت سے برسر اقتدار رہے۔ ہندوستان میں مسلم حکومت قائم

ہوتے ہی صوفیائے کرام نے بھی اس سرزمین کو اپنے قدموں کی برکتیں بخشنا شروع کیں۔ سیاسی اور روحانی فاتحین کے عمل دخل سے ہندوستان میں ایک نئے ذہن کا خمیر تیار ہونے لگا اور ایک نئی تہذیب کی داغ بیل پڑی۔ صوفیہ ہندوستان کے جس علاقے میں اپنے مقدس مقاصد کی برآری کے لیے گئے، وہاں کی زبان اور بولی سب سے پہلے اختیار کرلی۔ انھوں نے ہندوستانی، لباس، وضع قطع، نام وغیرہ بھی اختیار کرلیے اور اس طرح اہل ہند سے گھل مل گئے۔ علم موسیقی کا بغور مطالعہ کیا جاتا ہے تو ایسی ہی یک جہتی و یگانگت کے بڑے دل خوش کن کرشمے نظر آتے ہیں۔

مسلمانوں کے دربار اہلِ نشاط سے خالی نہیں تھے۔ ان کے درباروں میں ایرانی اور ہندوستانی دونوں ملکوں کے اہل فن موجود تھے۔ اسی طرح اہل اللہ کے دربار میں بھی مجالسِ سماع منعقد ہوتی تھیں۔ شمس الدین التمش کے دربار میں علمار نے بادشاہ سے یہ شکایت کی تھی کہ حمیدالدین ناگوری کی خانقاہ میں سماع کا دور چلتا رہتا ہے۔ اس بات پر التمش نے حمیدالدین کو دربار میں طلب کیا اور علمار کے روبہ رو اس کے خلافِ شرع عمل کی بازپرس کی۔ حمیدالدین نے سماع سے متعلق صحیح طریقہ اور اس کے آداب کو واضح کر کے آخر میں کہا کہ بادشاہ خود بھی بغداد میں محلسِ سماع میں رات بھر گلگیری کرتا رہا ہے اور اسی کی برکت سے آج وہ بادشاہ کے درجہ کو پہنچا ہے۔ اس کے بعد التمش نے کوئی سختی نہیں کی بلکہ دربار میں رقص و سرود کا باقاعدہ انتظام کیا جاتا تھا۔ التمش کے بعد معزالدین کیقباد جلال الدین خلجی وغیرہ کے دربار میں عجمی اور ہندی مُغنّی و مُطرِب قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ جس طرح مسلمانوں نے بھارت کی زبانیں اختیار کرلی تھیں اسی طرح انھوں نے فن موسیقی کو بھی اپنا لیا تھا۔ اس دور کی رائج الوقت موسیقی میں کمال حاصل کر کے دادِ تحسین حاصل کی۔ ان ماہرینِ موسیقی میں سب سے بلند درجہ امیر خسرو کو حاصل ہوا۔ انھیں نائک کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ یہ بھی دیکھتے چلیے کہ نایک کس کو کہتے ہیں؟

۱۔ "زمانۂ سابق میں جو باسم نایک ملقب ہوتے تھے۔ وہ علم موسیقی میں جس قدر کہ قواعد و مدارج ہیں۔ ان سب پہ حاوی و قادر ہوتے تھے جب نایک کہلاتے

تھے۔ ۔ ۔ ۔ جو کسی نے بے مشقِ کامل سے مرتبۂ وقفیت حاصل کیا تو پنڈت ہوا اور اس سے درجۂ اعلیٰ پہ پہنچا تو گنی کہلایا اور اس سے زیادہ بڑھا تو گندھرپ ٹھہرا اور جو اس سے زیادہ ہوگیا۔ تو گاین ہوگا اور جو ان سب درجوں سے مرتبۂ بالا کو پہنچا تب نایک مشہور ہوا یعنی یہ شخص عالم و عامل ہر شے علم موسیقی کا ہے۔"[1]

۲۔ جو کوئی راگہائے دیسی و مارگ یعنی جدید و قدیم جانتا ہو اس کو گندھرپ کہتے ہیں اور جو فقط راگ دیسی جانتا ہو اس کو کنکارو بھی کہتے ہیں اور اگر گندھرپ دیکھی راگ دھرپد و ترووٹ یا مثل اس کے اور چیز کا وقوف رکھتا ہو اس کو کلاونت کہتے ہیں اور جو کوئی خیال و قول و قلبانہ و نقش و گل و ترانہ جانتا ہے اس کو قوال کہتے ہیں۔ قوم کلاونت زمانۂ اکبر شاہ سے کہلائی اور قوم قوال عہد بادشاہ علاء الدین غوری سے ہے۔ زمانہ سات سو برس کا ہوا کہ حضرت امیر خسرو قدس سرہٗ بانی مبانی اس قوم کے ہوئے ۔ ۔ ۔ اور جو کہ اس علم کا عالم ہے۔ اور عامل نہیں ہے اس کو پنڈت کہتے ہیں اور جو کہ عالم و عامل گانے اور بنانے اور بجانے اور رقص وغیرہ کا عالم ہے۔ وہ نایک کہلائے گا۔ ورنہ گایک کہلاتا ہے۔[2] اس سے قبل کہ امیر کی مہارت و اجتہاد کے متعلق کچھ بیان کیا جائے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس عہد میں کس قسم کی موسیقی کا رواج تھا۔

ہندوستان میں علم موسیقی کا آغاز ویدوں کے عہد سے خیال کیا جاتا ہے۔ عہد قدیم میں ہندوستان میں ایرانی بھی آئے اور یونانی بھی۔ ان کی آمد سے ان ملکوں کی موسیقی سے ہندوستانی موسیقی کتنی متاثر ہوئی اور ہندوستان کی موسیقی سے بیرونی ممالک کتنے متاثر ہوئے۔ یہ بتانا مشکل ہے۔ مگر کسی نہ کسی قسم کا امتزاج ضرور عمل میں آیا ہوگا۔

اس بات کی نشان دہی کی جاتی ہے کہ موسیقی کے ایک ڈھنگ دھرپد سے قبل

---

[1] معدن الموسیقی از محمد کرم امام ص ۲

[2] معدن الموسیقی ص ۱۲۵

ہندوستان میں چھند، پربند، دھورو، بد وغیرہ موسیقی کے ڈھنگ تھے۔ لیکن آگے چل کر ماہرین نے اجتہاد سے کام لیا اور دھورو اور بد کے امتزاج سے ایک نیا طریقہ ایجاد کیا جس کو دھرپد کہتے ہیں۔ دھرپد گانے کے چار طریقے ہیں۔ اس میں سُر، لے، تال اور بول سب ہوتے ہیں۔ مگر سُر پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ پہلے دھرپد مندروں اور مٹھوں تک محدود رہا لیکن جب یہ درباروں میں پہنچا تو اس میں جدتیں کی گئیں۔ جن کی وجہ سے مندروں اور درباروں کے دھرپد الگ الگ ہوتے گئے۔ اس طریقے میں جو جدتیں دکھائی گئیں ان میں قابل توجہ یہ ہے کہ جب سنسکرت پراکرت کا دور ختم ہوا۔ تو دیسی زبانیں ابھر رہی تھیں اور دھرپد نئی زبانوں کی وجہ سے نئے نئے روپ اختیار کرتا گیا۔ اسی کی وجہ سے دھرپد مقبولیت حاصل کرنے لگا اور سارے ہندوستان میں پھیل گیا۔ دھرپد کو اکبر کے دور سے محمد شاہ رنگیلے کے دور تک خصوصًا عروج حاصل رہا۔ گوالیار کے راجا مان سنگھ اس کے بڑے دلدادہ تھے۔ سنگیت میں جدتوں کے شوق میں ماہرین کہیں بے راہ رو نہ ہوتے جائیں۔ اس خیال سے مان سنگھ نے اس کے اصول اور قاعدوں پر ایک تصنیف یادگار چھوڑی ہے۔ اس میں پہلی بار موسیقی کے کرناٹکی ور ہندوستانی ایسے دو الگ الگ ڈھنگوں کا ذکر ملتا ہے۔ ہندوستانی ڈھنگ یہی دھرپد ہے۔ جو چھند، پربند سے مختلف رواج پا گیا۔ دھرپد کو بھی پہلے پہل دیسی کہا جاتا تھا۔ جو مارگ کے اصولوں سے جدتوں کی وجہ سے قدرے مختلف تھا مگر جب دیسی میں بھی مارگ کے قاعدوں کی پابندی کی جانے لگی تو یہ بھی مارگ میں شمار کیا جانے لگا۔

ماہرین موسیقی کا خیال ہے کہ چودھویں صدی سے آغاز ہونے والی نئے ڈھنگ کی موسیقی کو قدیم موسیقی سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس سے ان کی کیا مراد ہے۔ اس کو سمجھنے سے میں قاصر ہوں۔ تہذیب کے ہر شعبے میں پرانی بنیاد ہی پر نئی عمارت تعمیر کی گئی ہے یا پُرانا مسالا نئی تعمیر میں کام میں لیا گیا ہے۔ موسیقی میں مارگ اصولی موسیقی کو کہتے ہیں۔ اور اس سے مختلف طریقے کو دیسی کا نام دیا جاتا ہے لیکن جب مارگ کے قاعدوں کو دیسی میں برتا جاتا ہے تو دیسی کو بھی مارگ کہنے لگتے ہیں۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ دھرپد کو بھی دیسی کہا جاتا تھا لیکن بعد میں اس کو مارگ مان لیا گیا تھا۔ اس جگہ عہد قدیم

یں لکھی گئی چند کتابوں کے ناموں کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔

۱۔ چوتھی صدی عیسوی میں ماتنگ نامی شخص نے پروہت دلیشی نام کی تصنیف یادگار چھوڑی ہے۔

۲۔ ایک کتاب نٹ شاستر کے نام سے بھی ملتی ہے اس کا سنہ تصنیف چھٹی صدی عیسوی ہے۔

۳۔ تیرھویں صدی عیسوی میں ہری پال دیو نے سنگیت رتناکر یا سنگیت سدھاکر نامی کتاب یادگار چھوڑی ہے۔

۴۔ تیرھویں صدی میں جے دیو نے گیت گوند کے نام سے کتاب تصنیف کی تھی۔

۵۔ عہد اکبری میں گوالیار کے راجا مان سنگھ نے مان کتوہل (کوتہل) کے نام سے ایک کتاب تصنیف کرائی تھی۔

۶۔ تان سین کی راگ مالا سنہ ۱۵۴۹ء

۷۔ ہری دیو کی سنگیت درپن سنہ ۱۶۷۳ء

۸۔ گنگارام سیتو کی سنگیت رتناکر کی شرح

۹۔ دیوکوی کی راگ رتناکر سنہ ۱۶۷۳ء

۱۰۔ مہاراجا سوائی پرتاب سنگھ (مہاراجہ جے پور) سنگیت سار ۱۸۰۴-۱۷۷۹ء

۱۱۔ عہد عالم گیر کے ایک امیر سیف خاں فقیر اللہ نے مان کتوہل کا ترجمہ فارسی میں کیا اور اس کا نام راگ درپن رکھا۔

۱۲۔ انیسویں صدی میں پنڈت بھات کھنڈے نے کئی جلدوں میں ہندوستانی سنگیت پدھتی کے نام سے کتاب تصنیف کی۔

ان کتابوں کے علاوہ راگ بودھ، سنگیت درپن، سنگیت سار، راگ مالا نغماتِ آصفی از محمد رضا، معارف النغمات از راجا نواب علی، معدن الموسیقی (سنہ ۱۹۲۵ء) از محمد اکرم امام، ہندوستانی میوزک از ہوارٹ وغیرہ، موسیقی پر چند مستند کتابیں پائی جاتی ہیں۔

مذکورہ بالا کتابیں سنسکرت، ہندی، فارسی، اردو اور انگریزی زبان میں ہیں۔

مذکورہ بالا کتابوں میں سے ابتدائی دور کی کتابوں کے مطالب بھی سمجھنا مشکل ہیں۔ لہٰذا عہد قدیم کے طرز موسیقی کے متعلّق کوئی رائے دینا ممکن نہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہندی موسیقی پر یونانی، ایرانی موسیقی کی آمیزش کی وجہ سے جو اثر پڑا اس نے اس مسئلے کو اور مشکل بنا دیا اور اس آمیزش کا تجزیہ کرنا مشکل ہی نہیں دشوار ہے۔ عہد قدیم کی موسیقی کی تفصیلات میں جانے کی چنداں ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ امیر خسرو تیرھویں صدی عیسوی کی پیداوار ہیں اور یہ دور دھرپد کا دور تھا۔

امیر خسرو کا سنہ پیدائش ۱۲۵۳ء اور سنہ وفات ۱۳۲۵ء ہے۔ مسلمانوں کو دہلی میں وارد ہوئے ابھی نصف صدی گزری تھی کہ امیر کی سی غیر معمولی شخصیت کا ظہور ہوا۔ خسرو کی شخصیت جامع کمالات تھی۔ وہ ایک بلند درجہ شاعر، ماہر لسانیات تھے۔ وہ درباداری بھی جانتے تھے۔ اور صوفی منش بھی تھے۔ انھوں نے اپنی صلاحیتوں سے سماج اور تہذیب کو جو فیض پہنچایا وہ ناقابل فراموش ہے۔ خسرو کو ہندوستان کی ہر چیز سے والہانہ محبّت تھی۔ انھوں نے سنسکرت کی جس خلوص و محبّت سے تعریف کی ہے وہ ان کی مہارتِ لسانی پر صاد ہے۔ فنِ موسیقی میں ان کی قدرتِ کاملہ کے کرشمے تو رہتی دنیا تک یاد رکھے جائیں گے۔

امیر خسرو کے خمیر میں ہندیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ فارسی اس دور کی تہذیبی زبان تھی۔ لہٰذا اس میں انھوں نے جی بھر کے کہا لیکن ہندیت کا جذبہ کہاں دب سکتا تھا۔ ان کی فارسی تصانیف میں اس جذبے کی جھلکیاں تو مل ہی جاتی ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ ان کے ہندیت کے جذبے کا ظہور ان کے فن موسیقی اور غنائی ہندی شاعری میں نمودار ہوا ہے۔ خسرو کو جس طرح سنسکرت اور ہند کی دوسری زبانوں میں دست رس حاصل تھی۔ اسی طرح ہندی موسیقی میں بھی وہ ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ہندی موسیقی میں دھرپد رائج تھا۔ اس کی غنائی شاعری میں دیوتاؤں کی حمد و ثنا تھی۔ فن کی دقّت طلبی اور شاعری کا مذہبی پہلو ایرانی مزاجوں سے میل نہیں کھاتے تھے۔ اس کا نعم البدل تجویز کرنا از بسکہ ضروری تھا۔ خسرو چونکہ متصوّفانہ مزاج لائے تھے۔ اس لیے انھوں نے موسیقی

ہیں جو اجتہاد کیا وہ اپنے مزاج ہی کی مطابقت سے کیا۔

موسیقیت اور غنائیت خسرو کی رگ و پے میں موجود تھی۔ وہ چاہتے تھے۔ اس آواز کو صوتی شکل دے دیتے تھے۔ مثلاً نوبت نقارہ کی آواز کو اس طرح باندھا ہے۔

نان کہ خوردی خانہ برد، نان کہ خوردی خانہ برد، خانہ برد خانہ برد

نان کہ خوردی خانہ برد، نہ کہ بدست تو کردم خانہ گرد، خانہ برد خانہ برد

یا دھنک کی آواز کو اس طرح باندھا ہے:

در پئے جاناں جاں ہم رفت، جاں ہم رفت، جاں ہم رفت رفت رفت جاں ہم رفت

ایں ہم رفت و آں ہم رفت، آں ہم رفت، آں ہم رفت، اینہم آں ہم اینہم آں ہم آں ہم رفت

رفتن رفتن رفتن دہ، دِہ دِہ رفتن دہ، رف رف رفتن دہ رفتن دہ

دھنک کی آوازوں کی صوتی شکل پر غور کیجئے۔ خسرو نے اگرچہ اپنی حاضر دماغی اور موسیقانہ مزاج کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن اس میں ان کا فلسفیانہ و صوفیانہ خیال و جذبہ بھی رونما ہوتا ہے۔

خسرو سوچنے والا دماغ اور اختراع پسند طبیعت لائے تھے۔ انھوں نے ہندی موسیقی میں بہت ہی سلیقہ مندی سے اجتہاد کیا۔ ان کے پیش نظر دو مسئلے تھے ایک تو دیوتاؤں کی حمد و ثنا کا نعم البدل اور دوسرا دھرپد کی کرختگی میں ملائمت پیدا کرنا تاکہ ایرانی مزاجوں کے پسند خاطر ہو۔ انھوں نے دھرپد کے قاعدوں اور ضابطوں کو ملحوظ خاطر رکھ کر کچھ تبدیلیاں کیں اور صوفیانہ اصول تصوّف کے پیش نظر حمد و نعت وغیرہ کو غنائی شاعری میں داخل کیا اور اس کو موسیقی کے اصولوں کے مطابق راگوں میں بٹھایا۔ اس میں غزل کے موضوعات ہجر و فراق، حسن و عشق، بہار و خزاں کو باندھا ہے۔ ان میں تصوّرات و جذبات کی اہل تصوّف ترتیب کرتے ہیں۔ پھر ان کو مزامیر کے ساتھ پیش کیا۔ جو سونے پہ سہاگہ ہوگیا۔ یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ بعض محققین اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ 'خیال'، خسرو کی ایجاد نہیں۔ جون پور کے فرماں روا حسین شرقی اور اس کے بعد محمد شاہ رنگیلے کے دور کے ماہرین فن کو اس کی ایجاد و ارتقا کا فخر حاصل ہے۔ اس سلسلے

میں چند آرا ملاحظہ فرمائیے۔

" دھرپد کے مقابلے میں امیر خسرو نے ترانہ ایجاد کیا۔ سلطان حسین نے دھرپد میں ایک نیا اور عمدہ طریقہ ایجاد کر کے رواج دیا جو آج تک مستعمل ہے۔ انھوں نے آہنگ میں تصرف کر کے اسے اور رنگین بنا دیا اور اس کو خیال کے نام سے موسوم کیا۔ اس میں انھوں نے بڑی جدت پیدا کی ہے۔"

(ہماری موسیقی، مضمون از عابد علی)

مختصر یہ ہے کہ کلاسیکی سنگیت کے رمز شناسوں میں امیر کا مقام اتنا بلند ہے کہ چار و نا چار پنڈتوں نے انھیں نایک گر دانا اور گرہنتھیوں نے انھیں جگت استاد جانا۔

(ہماری موسیقی، مضمون از عابد علی)

واجد علی شاہ مدعی ہیں کہ امیر دھرپد کے مقابلے میں خیال گاتے تھے۔ جان عالم پیا اس بات پر امیر سے کچھ خفا بھی معلوم ہوتے ہیں کہ ان کے خیال میں ہماری کلاسیکی سنگیت کے رموز دھرپد ہی میں مخفی ہیں۔ خیر یہ تو اپنے اپنے ذوق کی بات ہے لیکن اس سے شاید کسی کو انکار نہ ہوگا۔ کہ کلاسیکی سنگیت کے راگ راگنیوں میں امیر نے نہایت دل فریب پیوند لگائے ہیں۔ جو راگنیاں انھوں نے اختراع کی ہیں ان میں ایک بہار راگنی ہے۔ جس کا مزاج ایسا لچک دار ہے کہ گانے والے ان کے سروں کو دوسرے راگ راگنیوں کے سروں میں ملا دیتے ہیں اور اس تال میں سے ایک نئی شکل پیدا کر دیتے ہیں۔ (ہماری موسیقی، مضمون از عابد علی)

خسرو کے زمانے تک گویوں کا مدار استت، اگیت اور چھند پر تھا۔ جو کرناٹکی زبان میں گائے جاتے تھے۔ شمالی ہند کے لوگ دکنی زبانوں سے عموماً ناواقف تھے، اس لیے صرف نغمے سے حظ اندوز ہوتے۔ لیکن کلام کا لطف حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ خسرو نے عجمی موسیقی کے انداز پر ہندوستانی میں قول، قلبانہ، ترانہ اور نقش و گل وغیرہ اختراع کیے۔ جن کی تعداد بارہ بتائی جاتی ہے۔ اسی طرح چوتالا، تلوڑا، رڈیک وغیرہ تالوں کی جگہ خمسہ، ذو بحرا اور فرودست وغیرہ تالیں قرار دیں۔ سازوں

یں ہندوستانی ستار بھی انھیں کی ایجاد بتایا جاتا ہے۔ جو ایرانی ستار کی اصلاح شدہ شکل ہے بادشاہ نامے میں خیال کو بھی انھیں کی اختراع قرار دیا گیا ہے۔

(رسالہ آجکل اگست ۵۶ء مضمون از امتیاز علی عرشی)

تقریباً ۶۲۷ھ میں حضرت امیر خسروؒ مشہور شاعر و صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ فن موسیقی کے بہت بڑے ماہر تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ انھوں نے بہت سی نئی ایجادات واختراعات کیں۔ حضرت امیر خسروؒ موسیقی میں جو نئی ایجاد کرتے تھے وہ اپنے پیر بھائیوں کو سکھا دیتے تھے۔ اور اپنے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے۔ یہ لوگ خواجہ معین الدین چشتی کے مرید میاں سامنی کی اولاد سے تھے۔ میاں سامنی گونگے اور بہرے تھے۔ خواجہ صاحب کی دعا سے اللہ نے ان کو نطق اور سماعت بخشی اور یہ بہترین موسیقار ہوئے۔ انھیں اصحاب کی اولاد میں سے قوال بچے مشہور ہوئے۔ انھیں لوگوں میں میاں شکر اور میاں مکھن ہوئے، جنھوں نے دھرپد کو نئی شکل دے کر نئے تالوں میں خیال رکھا۔ اس کو اس خوبی اور خوبصورتی سے پیش کیا کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ چونکہ یہ ایک نئی چیز تھی اس لیے اس کا رواج بہت تیزی سے ہوتا گیا اور لوگ اسے قبول کرتے گئے۔

(رسالہ آجکل اگست ۱۹۵۶ء مضمون از عظمت حسین خاں)

خیال: پندرھویں صدی میں جون پور کے شاہان شرقیہ میں سے سلطان حسین شرقی نے ایک نئے ڈھنگ کا گانا ایجاد کیا اور اس کا نام خیال رکھا ایک روایت یہ بھی ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی میں حضرت امیر خسروؒ نے من جملہ دیگر اختراعات کے خیال بھی ایجاد کیا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ طریقہ امیر خسروؒ ہی نے وضع کیا ہو۔ مگر خیال کی ترویج و ترقی کا سہرا سلطان حسین شرقی ہی کے سر ہے۔ (ہندوستان موسیقی مرتبہ مفتی فخر الاسلام)

امیر خسروؒ نے یہاں کی موسیقی کو سیکھا اور حد کمال کو پہنچایا۔ انھوں نے ایرانی موسیقی میں بھی ایسا ہی کمال حاصل کیا تھا۔ اور دونوں کی آمیزش و ترکیب سے ایک تیسری چیز نکال لی جس سے موسیقی کے فن میں ایک تازہ روح پیدا ہوگئی۔

(رسالہ آجکل اگست ۵۶ء مضمون از غیب حسین)

کہا جاتا ہے کہ امیر خسروؒ نے علاوہ قول، قلبانہ، نقش گل، سولہ، منڈھا، ترانہ اور تروٹ کے علاوہ خیال بھی ایجاد کیا۔ اس کے تقریباً دو سو سال کے بعد سلطان حسین شرقی کے نام سے بھی اس اختراع کو منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن آج کل حضرت امیر خسرو کے ایجاد کردہ خیال گایکی کا پتا لگانا ناممکن ہے۔ ان کے ایجاد کردہ قول، قلبانہ وغیرہ کی بندشیں اب بھی ملتی ہیں۔ اور حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ پر عرس کے موقعے پر سننے میں آتی ہیں۔ ترانہ اور ترووٹ گویے اب بھی گاتے ہیں۔ لیکن ان کے ایجاد کردہ خیال کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ اس کے ساتھ ساتھ حسین شرقی کے بنائے ہوئے چند راگ اب تک مستعمل ہیں۔ مثلاً جون پوری وغیرہ۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امیر خسرو اور سلطان حسین شرقی کے خیال کی شکلیں ایسی نہ تھیں کہ قبولِ عام کی سند حاصل کر سکیں۔ لہٰذا اس وقت کے چھند پربندھ اور دھرپد کے مقابلے کی تاب نہ لاکر حافظوں سے سہو ہوگیا۔ (رسالہ آجکل ۱۹۶۵ء مضمون از جیون لال مٹو)

مشہور و معروف بسیار فن طبّاع امیر خسروؒ نے ہندوستانی موسیقی کے ڈھانچے میں ایرانی نغمات کو شامل کیا اور ستار، طبلا جیسے ساز ایجاد کیے۔ قوالی کے چلنت بولوں اور جزئیات سے خیال وجود میں آیا۔ اس کے ساتھ ہی سنگیت کاری کے مسلمہ انداز میں بھی تغیر و تبدّل ہونے لگا۔ مثلاً: مندروں کی دھرپد سے 'دربار، یعنی شاہی درباروں کی دھرپد کی تخلیق عمل میں آئی'۔ (رسالہ آجکل اگست ۱۹۵۶ء مضمون از سمتی مٹاٹکر)

یوں تو امیر خسرو نے بھی دھرپد کے قول، قلبانہ، نقش گل، سولہ، ترانہ، ترووٹ اور منڈھا ایجاد کر کے ہندوستانی موسیقی میں گراں قدر اضافہ کیا تھا۔ لیکن ان کے کوئی دو سو سال بعد جون پور کے سلطان حسین شرقی نے دھرپد کے مقابلے میں خیال ایجاد کیا۔ لیکن عوام میں یہ ایجاد کچھ زیادہ فروغ نہ پا سکی اور دھرپد ہی رائج رہا۔

(رسالہ آجکل اگست ۱۹۵۶ء

مضمون از کوثر تسنیم)

مذکورہ بالا اقتباسات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بعض حضرات کو خسرو کو خیال کا موجد ماننے میں تامل ہے۔ اگر خسرو سے موسیقی میں اس اجتہاد و ایجاد کا فخر چھین لیا جائے تو اس غیر معمولی شخصیت سے بڑی بے انصافی ہوگی۔ بلاشبہ خسرو خیال کے موجد ہیں۔ انھوں نے دھرپد میں تصرف کر کے خیال کا ڈھنگ ایجاد کیا۔ یہ ابتدائی شکل میں قدامت پسندوں کو پسند نہ آیا ہوگا۔ کیونکہ یہ بالکل نئی چیز تھی۔ اس کے گانے کا انداز دھرپد سے الگ تھا، اس کی تالیں الگ تھیں اور اس کی غنائی شاعری بھی مختلف تھی۔ آگے چل کر سلطان حسین شرقی نے اس میں جدتیں پیدا کر کے اسے ایک نیا رخ دیا۔ اسی کو محمد شاہ رنگیلے کے دور میں سدا رنگ اور ادا رنگ نے اور بھی انوکھے رنگ میں پیش کیا۔ خسرو نے جو راگنیاں یا دھنیں ایجاد کیں یا ہندی موسیقی سے جو مخلوط راگنیاں ترتیب دیں۔ وہ سب خیال ہی کی ہیں۔ ان کی تالیں بھی پکھاوج کی تالوں سے مختلف ہیں۔ خسرو نے جو کچھ اجتہاد کیا۔ ضرورتاً کیا۔ وہ صوفی تھے۔ صوفی کی صحبت سے مستفید ہونے کے انھیں مواقع ملے تھے۔ وہ صوفیوں کے مزاج اور قلب کے اندرونی گوشوں سے خوب واقف تھے۔ صوفیہ دھرپد کے بھاری پن اور پکھاوج کی گھن گرج کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ لہذا خسرو نے ان کی روح و قلب کو گرمانے کے لیے ایک ڈھنگ نکالا جو صوفیوں کے مزاجوں سے میل بھی کھائے اور جس میں نزاکت و لطافت بھی ہو۔ غرض اس اعجاز خسروی نے ہندی موسیقی میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ جو آج ہندوستانی موسیقی کا شمالی ہند کی موسیقی (کرناٹک سے الگ) کے نام سے مقبول عام ہے۔

خسرو اپنی اجتہادی صلاحیتوں کو کئی طریقے سے کام میں لائے ہیں۔ وہ ایرانی موسیقی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ انھوں نے بعض ایرانی دھنوں کو ہندی موسیقی میں داخل کیا۔ ایسی راگنیاں یا دھنیں بہت ہوں گی۔ مگر زنگولہ، حجاز، نوروز کے نام مشہور ہیں یہ نام ہند یا لیے گئے ہیں اور جنگلا، ہیج، نور چکا کے ناموں سے مشہور ہیں۔ دوسرا طریقہ انھوں نے یہ اختیار کیا کہ ہندی اور ایرانی راگوں کی آمیزش سے چند راگنیاں بنائیں۔ اور دوسرے ہندی موسیقی میں چند دھنیں ایجاد کیں۔ مثلاً قول، ترانہ، نقش گل قلبانہ،

بسیط سوہلہ وغیرہ۔

ایرانی موسیقی میں ہنگام یا گام یعنی راگ بارہ ہیں۔ پھر یہ مختلف طریقوں سے تقسیم پاکر ہزاروں کی تعداد میں ہو جاتے ہیں۔ یہ بالکل ہندی موسیقی کی طرح ہے۔ جیسے چھے راگ اور چھتیس راگنیوں سے ہزاروں راگ، راگنیاں بنائے گئے ہیں۔ ایرانی موسیقی میں بارہ مقامات یا راگ بارہ برجوں[1] کی مناسبت سے بنائے گئے ہیں۔ ان کو کسی شاعر نے رباعی میں اس طرح باندھا ہے۔

راست[1]، عشاق[2]، بوسلیک[3]، یاز   بانوا[4]، اصفہان[5]، بزرگ[6] نواز
کوچک[7]، اشتاد عراق[8]، زنگولہ[9]   پس حسینی[10]، راہوئے[11] و حجاز[12]

ہندی موسیقی میں بھی سُر کو بارہ برجوں پر تقسیم کیا گیا ہے[2]۔

خسرو نے ہندی ایرانی موسیقی سے جو راگنیاں ترتیب دیں۔ ان کی فہرست یہ ہے:-

راگوں کے نام:

مجیر: نمارا اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے۔

سازگری: پوربی، گورا، گن کلی اور ایک فارسی راگ

ایمن: ہنڈول اور نیریز

عشاق: سارنگ، لبسنت اور نوا

---

[1] بارہ راگوں کو برجوں پر اس طرح تقسیم کیا گیا ہے = راست: برج حمل، اصفہان = برج ثور، عراق = برج جوزا، کوچک = برج سرطان، بزرگ = برج اسد، حجاز = برج سنبلہ، بوسلیک = برج میزان، عشاق = برج عقرب، حسینی = برج قوس، زنگولہ = برج جدی، نوا = برج دلو رہادی (راہوئے) برج حوت۔ راگوں کی تاثیر برجوں کے مطابق ہے۔ معدن الموسیقی، ص ۲۱۵

[2] بحوالۂ امیر خسرو اور ہندوستانی موسیقی از سید رغیب حسین، رسالہ آجکل بابت اگست ۱۹۵۶ء

[3] معدن الموسیقی از محمد کرم امام، ص ۷۲

موافق: توڑی، مالٹری (مالری)، دوگا، حسینی

غنم : پوربی میں تغیر

زلیف: کھٹ راگ، شہ ناز

فرغنہ : گنکلی (گن کلی)، گورا اور فرغانہ

سرپردہ: سارنگ، بلاول اور راست

باخزر: دلیکار اور ایک فارسی راگ

فردوست: کانہڑا، گوری، پوربی اور ایک فارسی راگ

منم (منعم) (صنم): کلیان اور ایک فارسی راگ

فہرست ماخوذ از شعر العجم، ج دوم ص ۱۰۴

ان کے علاوہ قول، ترانہ، خیال، نقش، نگار، بسیط، سولہ خسرو کی ایجادیں ہیں۔

صوت المبارک میں نواب واجد علی شاہ نے خسرو کے ایجاد کردہ راگ حسب ذیل دیے ہیں۔

ترانہ، چھند، پربند، گیت، قول، قلبانہ، نقش اور گل[1]

مکیش اکبر آبادی نے اپنے مضمون 'قوالی' میں خاں صاحب مشتاق حسین خاں کے حوالے سے لکھا ہے کہ خسرو کی ایجادوں میں مندرجہ ذیل راگنیاں بھی ہیں۔

سوہا، شہانہ، سگرئی، ہوا، ساز گیری، بسنت، بہار[2]

مولانا شبلی نے خسرو کی ایجادات راگ سے متعلق فقیر اللہ کی راگ درپن کے حوالے سے مذکورہ بالا فہرست دی ہے۔ محمد کرم امام نے اپنی کتاب معدن الموسیقی میں امیر خسرو کے اجتہاد کو اس طرح پیش کیا ہے۔

"امیر خسرو نے اول شعبۂ فخرداں چارگاہ شعبۂ مقام زنگولہ سے مرکب کیا ہے، اور

---

[1] بحوالہ امیر خسرو از وحید مرزا، ص ۲۲۹ فٹ نوٹ

[2] رسالہ آجکل بابت اگست ۱۹۵۶ء، ص ۲۲

فخر دان کو فخر بھی کہتے ہیں اور مقاموں میں مقام راست کے موجد ہوئے اور سنگت راگھاے
ہند سے بایں تشابہ دی ہے یعنی فخر دان اور چار گاہ مشابہ ٹوڑی سے کیا ہے اور عراق
مقام کو ساز گیری راگ ہندی سے تشابہ کیا ہے اور مقام عشاق کو راگنی سارنگ رکھا، اور
موافق گزشتہ کو مالسری سے مشابہ کیا اور ذو کاہ شعبہ کو دلوائی راگنی سے اور غم اور
عنم بھی کہتے ہیں۔ عنم صحیح ہے اور غم غلط ہے اور آوان پوربی سے اور قرغنہ مشابہ گورا
اور گن کلی سے اور صنم مشابہ کلیاں راگ ہندی سے کیا اور اس قدر یعنی چار شعبۂ اوّل
حور، دوم نہاوند، سیوم اصفہانک، چہارم مخالف۔ ان کو اگر شامل کیجیے تو اٹھائیس ہوئے اور
ایجاد کیے اور یہ پانچ گوشہ اوّل موافق دوم عنم سیوم آوان چہارم قرغنہ پنجم صنم اور ایجاد
کیے اور صنم کو نیریز بھی کہتے ہیں۔ مگر تحریر ایسی عطار دکی غلطی فاش پر ہے۔ امیر خسرو صاحب
نے دونوں نیریزوں یعنی صغیر و کبیر سے صنم کو علاحدہ نکالا۔ کجا نیریز کجا صنم۔ مشابہ کلیان سے
اور نیریز مشابہ ہیں بھیروی اور کانی سے اور نیشاپور شعبۂ اصفہان سے اور نیریز بھی شعبہ
ہے اور اصفہان کا اور مقام بستہ نگار اختراع کیا۔ آپ علم ہذا کے عالم باعمل تھے۔ خداوند
کارساز نے ایسا عارف پیدا نہیں کیا۔"

کئی ہندی اور ایرانی راگوں میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس مشابہت کو نایک
محمد کرم امام نے اس طرح پیش کیا ہے۔

آہنگ اور صوت اور نغمہ رکب اور غزال کا مشابہ ہے۔ کھٹ اور دھناسری راگھائے
ہندی سے اور ذوکا اور حسینی مقام اور لوروز سارنگ سے مشابہ ہے اور سہ گاہ اور چہار گاہ
اور مغلوب اور مقام زنگولہ مشابہ ہیں ٹوڑیوں سے اور زابل اور مخالف اور مقام عشاق مشابہ ہیں
گوری اور پوربی اور پوربا اور گورا اور آسا اور بھٹیال راگھائے ہندی سے اور مقام عراق
اور راوج شعبہ مجرنگ گن کلی اور مالسری راگ ہندی کے اور مقام اصفہان اور شعبہ
نیشاپور مشابہ زیلف اور بھیروی راگنی ہندی سے اور نیریز کبیر اور نیریز صغیر یہ شعبہ مشابہ ہیں۔[1]

---

[1] معدن الموسیقی ص ۲۲۴

یمن اور بھوپالی بہہاس اور جیت راگہائے ہندی سے ... وغیرہ

اسی طرح محمد کرم امام نے ایرانی مقامات (راگ) اور ہندی راگوں میں جو موافقت پائی جاتی ہے، اس کی تفصیلات اس طرح دی ہیں۔

مقام غزال[1] اور کھٹ ایک ہیں اور مخالف ورام کلی موافق ہے اور مقام نیریز وکلیان قریب تر۔ عشیراں[3] و بڑہنس راگ ہندی نزدیک ہے۔ مقام ذوگاہ[4] و سدھ ٹوڑی اقرب ہے۔ نوا[9] و سارنگ ایک ہے۔ مقام راست[6] ونٹ برابر۔ عراق[5] و پوریا دھناسری باہم نزدیک۔ مجادات[3] و نغمہ و بروا کا اصل اس کی بروہ ہے۔ نزدیک تر۔ مقام[1] شہ ناز اور سری راگ کہ اہل پنجاب اکثر گاتے ہیں۔ مشابہ درجۂ الم ہے اور معلوب[1] اور بسنت راگ باہم نزدیک[1]۔

مذکورہ بالا اقتباسات کو دیکھنے کے بعد یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ خسرو نے ہندی اور ایرانی راگوں کی مشابہت اور موافقت کے پیش نظر ایسی جدت دکھائی جو ایک غیر معمولی علم و فراست رکھنے والے شخص ہی کے بس کی بات تھی۔ اس موافقت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ہندی اور ایرانی موسیقی میں بڑی حد تک مناسبت موجود تھی اور جو الگ الگ رنگ ڈھنگ نظر آتے تھے۔ ان میں خسرو نے وحدت پیدا کر کے اپنے فطری رجحان اور یک جہتی و یگانگت کا ثبوت دیا۔

خسرو نے ہندی اور ایرانی راگوں کی آمیزش کر کے کثرت میں وحدت کے کرشمے دکھلائے ہیں۔ اس اجتہاد میں ان کا تصوفی نقطۂ نظر ہر پہلو سے نمایاں ہے۔ ان دھنوں کے لیے خسرو نے جو چیزیں (غنائی شاعری) تصنیف کی ہیں ان میں بھی ان کے ماحول و صحبت و قلبی و عقلی جذبات و رجحانات منعکس ہیں۔ قاعدوں کی حدود میں رہ کر مخلوط دھنیں بنانا کوئی آسان کام نہیں تھا اور وہ بھی دو چار راگوں کے نہیں بلکہ دو ملکوں کے مختلف فنون کو ایک کر دکھانا، ایک مجتہد ہی کا کام ہے۔ اس اجتہاد کی داد ماہرین فن ہی دے سکتے ہیں۔ ان راگوں

---

[1] معدن الموسیقی ص ۲۲۵

میں کسی سُر سپ بھُراؤ ہے۔ اور کون سا سُر اچٹتا ہوا لگتا ہے۔ اگر اس کو بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خسرو کیسی غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ خسرو نے موسیقی کی قدیم روایتوں کو توڑا ہی نہیں بلکہ قدیم و جدید رعایتوں کو بروئے کار لاکر ایک انوکھا ڈھنگ پیش کیا۔ بعض ہندی راگوں میں خسرو نے تھوڑا تھوڑا تصرف کر کے نئی نئی دھنیں اور راگنیاں پیش کیں۔ مثلاً۔ گونڈ ملہارا اور کانٹرا سے باگیری قوالی کے نام سے دھن بنائی۔ کانٹرا شاہانہ بھی اسی قسم کا ایک نمونہ ہے۔ اسی طرح دوسری راگنیاں یا دھنیں، توڑی براری، توڑی اساوری، پردیپ کلی وغیرہ بنائیں[1]۔

خسرو کا اجتہاد صرف راگنیوں کے سُروں میں تصرف کرنے پر ختم نہیں ہو جاتا۔ نئی راگنیوں اور دھنوں کے لیے انھیں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو بھی کام میں لانا پڑا۔ ان راگنیوں کے لیے خسرو نے بول بھی لکھے۔ انھوں نے ایسی ہزاروں چیزیں بنائی ہوں گی۔ جن میں سے صرف چند ہم تک پہنچی ہیں۔ اس جگہ جناب نقی محمد خاں خورجوی کے مضمون[2] سے راگنیوں کی چیزیں پیش کرتا ہوں۔ اگر یہ اچھی کی ہیں تو لسانی نقطۂ نظر سے بھی بہت ہی اہم ہیں۔

راگ مجیر:۔

"حضرت نظام الدین اولیا پیر مشائخ نور
آن پڑے دربار تہارے، خسرو پر کرپا
کرو برائے انبیا پیر مشائخ نور"

راگ سازگری:۔

چنگے کام ہوئے آسان۔ نت چین پر بیٹھے ہی۔ دربار ہوئے این آرام
اولیا کے چرن پر ہو وے شام نت چین مٹت دلدّر دہام

---

[1] امیر خسرو ماہر موسیقی کی حیثیت سے از غلام عباس نگار بابت اکتوبر ۱۹۳۷ء

[2] رسالہ آجکل امیر خسرو نمبر بابت نومبر ۱۹۷۴ء

راگ ایمن کلیان :

گنی جانو گنی پہچانو گنی ہیں سوگھڑ و گنی گنی نہ کر و چیت کر و دھیان کر و۔

مورکھ باورے ۔ جب کرتار کی مہر عنایت ہو۔ تب گنی لے سانچی تان

راگ عشاق :

سانچی د ہرن سانچی مورن ، سانچو راگ سانچی تان

جس کوئی گاوے تال سرن ہیں واکو گنی مان

تال سُرن بھید جانے کال اکالی پہچانے

جو آپ کو جانو خسرو واکو بڑ و گیان

راگ موافق :

بن کے پنچھی بھئے باورے ، ایسی بین بجائی سانورے

تار تار کی تان نرالی ، جھوم رہیں سب بن کی ڈالی

بن گھٹ کی پنہاری ٹھاڑی ، بھول گئیں خسرو پنہیا بھرن کو

راگ غنیم ۔

ارج سنو موری آج پیر مورے

چرن چھوئے کی لاج راکھو مورے پیارے ، ہتیں تو بندھاؤ ۔

دھیر مورے پیر

راگ زلیف ۔ ترانہ :

دِر دِر توم نادِر دِر توم نا دے رے ناتا

نادارے دانی تا آ توم تا نا نے تنے نانا ــــ نے دارے دانی

پائے سگ بوسیدہ مجنوں خلق پرسد کیستی

گفت ایں سگ گاہے گاہے کوئے لیلیٰ رفتہ بود

راگ زلیف ۔ خیال :

سب گھر آنند بدھاوا لاڑی مالنیا

پھولن دے سہرا، سب جگ ہیں بھیوا جیارا
جب حضرت جنم پایو سب منگل گایو
راگ فرغانہ :
جے جے نظام الدین جگ تارن، تا پہ ہیں پران کر وارن
خسرو کے پیہ بھو، احمد کے پوت تن من اور دھن کروں نثارن
راگ سرپردہ ۔ خیال :
سلطان جی صاحب نجام الدین اولیا تو ہے
بل بل جاؤں . مو ہے پیر تو سوں دیا چرن تیرے
گئے خسرو پا یا میں نے اپنا ایسو پیر مورے تم نجام الدین اولیا
راگ باغرہ ۔ خیال :
دل من دل من دل من ایں آوارہ، دل من
پارہ پارہ دل من، ایں بے چارہ، دل من
دل من دل من دل من ایں دیوانہ، دل من عاشق
جاناں دل من، ایں پروانہ، دل من
خسرو در عشق خراب، ہم چو ماہی بہ سراب سوئے
دل من بہ شتاب، ایں دیوانہ دل من
راگ صنم یا منم یا منم ۔ خیال ۱ :
اندھیری گھٹا کالی حسن چراغ علاج دل ما خسرو کنج باغ
خیال ۲ :
نجام الدین پیر اولیا نجام الدین شان انبیا خسرو
آن پڑے چرنن ہیں کر پا کر دو بھر کیبریا
راگ زنگولہ ۔ خیال :
من شمع جاں گدازم تو صبح دل کشائی ۔

سوزم گرت نہ بنیم میرم چو رخ نمائی

راگ زنگولہ۔ دھرپد:

بھوپ سکیری ل کا ہے، کوکرت تت تنی چورا جائی ڑرے۔ سات سکھی ل منگل گادیں

ہوویں چوک پرا پور جا پورے

انترہ سنچائی: تان سینؔ کے تم ہونا تک خسرو کرت استتی گن گا پورے[1]

من شمع جاں گدازم تو صبح دل کشائی سوزم گرت نہ بنیم میرم چو رخ نمائی

خسرو نے ایسے سیکڑوں بول لکھے ہوں گے جن میں سے معدودے چند ہم تک پہنچے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جن کی اصلیت مشتبہ ہے۔ خسرو کے ہندی کے صاحب دیوان ہونے کی دعوے کی ایسے کلام سے تصدیق ہو جاتی ہے۔ یقیناً انھوں نے معتد بہ کلام یادگار چھوڑا ہو گا جس کا بڑا حصّہ ہماری دست رس سے باہر ہے۔ نہ سپہر میں خسرو نے خود اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ انھوں نے ہندی کلام کو قابل اعتنا نہ سمجھا اور دوستوں میں تقسیم کر دیا۔

قول، قلبانہ، ترانہ، نقش، گل وغیرہ قوالی کے مختلف طریقے ہیں۔ قوالی نہایت مقبول طرزِ موسیقی ہے۔ عہد قدیم میں موجودہ دور کی سی قوالی کے انداز و مفہوم نہیں تھے۔ قوالی اور قوال کی وجہ تسمیہ محمد کرم امام نے معدن الموسیقی میں اس طرح بیان کی ہے کہ جب گوپال نایک سے خسرو کا مقابلہ ہوا اور گوپال کو خسرو کے شاگردوں نے قول قلبانہ وغیرہ سنایا تو وہ اس طرز کو سُن کر دنگ رہ گیا۔ جب یہ خبر بادشاہ کے کان تک پہنچی تو اس نے

"طفلان کو حضور خود طلب کر باستصواب رائے امیر خسرو بعطائے خلعت اور خطاب قوال مفتخر کیا اور بعد تقرری اذوقہ ان کو احضاری حضوری کے لیے حکم دیا، اس زمانے سے قوم قوال مشہور ہوئے"[2]

---

[1] یہ انترہ تان سین کا ہے جس میں وہ خسرو کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں۔

[2] ص ۲۳۲

اسی طرح ایک اور جگہ رقم طراز ہیں :

"اور وہ لڑکے حضوری امیر خسرو شاہ عصر سے بلقب قوال مفخر ہو کر مجرائے سلطانی ہوئے ۔"[1]

حضرت عظمت حسین لکھتے ہیں۔

حضرت امیر خسرو موسیقی میں جو نئی ایجاد کرتے تھے وہ اپنے پیر بھائیوں کو سکھا دیتے تھے اور اپنے پیر اور مرشد حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی کی خدمت میں پیش کر دیتے ۔ یہ لوگ خواجہ معین الدین چشتی کے مرید میاں ساتھی کی اولاد سے تھے[2] یہی پیر بھائی قوال بچے کہلائے جنھوں نے خسرو کے اس طرز نو کو آگے بڑھایا خسرو کے عہد میں صوفیوں کی مجالس میں سماع میں قوالیاں گائی جاتی تھیں ۔ صحیح معنوں میں اس طرز کا گانا صوفیہ نے سماع کے لیے ایجاد کیا گیا تھا ۔ صوفیہ سماع کے لیے آداب مقرر کیے ہیں ۔ مجلس سماع ایسے وقت میں مقرر کی جائے جو وقت دوسرے کسی قسم کے فرائض انجام دینے کا نہ ہو ۔ اس سے مراد یہی ہے کہ دنیوی اور دینی فرائض انجام دینے کے بعد مجلس سماع ہو ۔ دوسرے ، مجلس ایسی جگہ منعقد کی جائے جہاں ہر کس و ناکس نہ آنے پائے اور کسی کو اس سے تکلیف بھی نہ ہو ۔ تیسرے ، اس مجلس میں صوفیہ ہوں جو اللہ کی طرف رجوع کر کے دو زانو بیٹھیں تاکہ جمعیت خاطر میں فرق نہ آنے پائے ۔

قول ، قلبانہ میں کوئی حدیث یا قول ہوتا ہے جس میں ہندی الفاظ یا ترانہ کے الفاظ ملائے گئے ہیں ، قلبانہ کی مثال دیکھیے :

استھائی : صدق قولہ تعالیٰ ۔ بھیجو درود اور سلام

انترہ : امیر خسرو بل بل جاویں ۔ حضرت نظام الدین کے دربار ۔ گاویں قلبانہ[3]

---

[1] ص ۱۶۰ [2] آگرہ گھرانے کی گائکی از عظمت حسین رسالہ آجکل بابت اگست ۵۶ء

[3] معدن الموسیقی ص ۱۵۸

قول کی مثال دیکھیے:
استھائی: حق درد رتالا لاتے حسن ونظام الدین اولیا۔ دیم دیم دردر درتنا نا نا نانا
انترہ: فاینما تولوفتم وجہہ اللہ درتم درتم توم تنا نا نا نا
ہد ددے تلے تلے۔ درادرا جانم دیم دیم دردر درتلے تال تلے تنا نا نا نا[1]
دونوں میں استھائی اور انترہ میں تالیں مختلف ہوتی ہیں۔ چھند پربند میں بھی تالیں بدلتی ہیں۔
بسیط بھی خسرو کی اختراع ہے اس کو چھند کا نعم البدل کہنا چاہیئے۔
نقش میں ایک رباعی ہوتی ہے اور گل میں صرف ایک بیت ہوتی ہے۔ ان میں تالیں نہیں بدلتیں۔
ترانہ میں فارسی الفاظ یا شعر کے ساتھ تا تا تلی کے الفاظ ہوتے ہیں اس کی مثال دیکھیے درآ درآ درتم درآجان من درآ درآ
بہ تنگ آمدہ ام چند انتظار کشم بیا بیا کہ ترا تنگ درکنار کشم[2]
تلانہ میں عربی فارسی کسی قسم کے الفاظ نہیں ہوتے، اس میں تمام تا نا تلی ہوتا ہے اس تانا نا توم سے راگ کی شکل واضح کرکے مکمل کی جاتی ہے۔ جیسے: دے رے تانا نادے دے تادم وغیرہ
سوہلہ، شادی بیاہ کے گیت کی دھنیں ہیں۔
خسرو نے موسیقی میں جو تصرفات کیے ان کے پیش نظر اس کے سازوں میں بھی جدت طرازی لازم آئی۔ موسیقی میں تال اور لے کی اہمیت مسلّم ہے۔ دھرپد کے ساتھ پکھاوج بجتی ہے مگر خسرو کے ایجاد کردہ طریقہ موسیقی، خیال، اور قول، ترانہ وغیرہ کے ساتھ پکھاوج بے جوڑ مزامیر ثابت ہوتا ہے۔ پکھاوج کی گھن گرج سے خیال قول ترانہ کی لطافت ونزاکت مجروح ہوجاتی ہے لہٰذا خسرو نے پکھاوج کا نعم البدل

---

[1] معدن الموسیقی ص ۱۵۸ [2] معدن الموسیقی ص ۱۵۹

طبلہ اور ڈھولک اختراع کیے۔ لفظ طبلہ فارسی لفظ طبل (بڑا ڈھول) سے اخذ کیا گیا ہے سریانی زبان میں ڈھول کو طبلو کہتے ہیں، عبرانی میں اس کو طبلیہ اور عربی میں طبل کہتے ہیں[1]۔ کہتے ہیں کہ قابیل کی اولاد میں ایک شخص طوبال نامی نے طبل ایجاد کیا تھا[2]۔

خسرو نے طبلے اور ڈھولک کے لیے پکھاوج کے بولوں کے جیسے بول گت توڑے، قاعدے وغیرہ بنائے جو خیال کی لطافت کو ابھار سکیں۔ سب سے پہلے طبلہ ڈھولک کے لیے چار بول:

کرڑ، کرڑان، کٹ، جھا

ترتیب دیے۔ بعد میں ان بولوں میں اضافہ ہوتا گیا اور فارسی میں بحور و اوزان کو سامنے رکھ کر خسرو نے سترہ تالیں ترتیب دیں۔

خسروی تالیں یہ ہیں:

۱۔ پشتو
۲۔ ذو بحر
۳۔ قوالی
۴۔ سول فاختہ
۵۔ جت (ہوری)
۶۔ زلہ
۷۔ تال سواری
۸۔ آڑا چوتالہ
۹۔ جھومرا
۱۰۔ جھپ تال
۱۱۔ خمسہ
۱۲۔ فرودست
۱۳۔ پہلوان
۱۴۔ فید
۱۵۔ داستان
۱۶۔ پٹ تال
۱۷۔ چپک

سلطان حسین شرقی والیِ جون پور نے ان تالوں میں ایک اور تال سواری زنانی کا اضافہ کیا ہے[1]۔

---

[1] معدن الموسیقی ص ۱۹۷

ان تالوں میں جن بحور کا استعمال کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہیں۔

۱. ہزج	۱۰. ضرب الفتح
۲. ترکی	۱۱. فاختہ
۳. دوکک	۱۲. رمل
۴. دور	۱۳. اقارب
۵. ثقیل	۱۴. طویل
۶. خفیف	۱۵. ریختہ
۷. چارضرب	۱۶. کامل
۸. درافشاں	۱۷. بسیط
۹. ماہیں	وغیرہ[1]

ڈھولک بھی خسرو کی اجتہادی صلاحیتوں کا نمونہ ہے۔ ڈھول جس کو فارسی میں کوس کہتے ہیں، رزم کا باجا ہے۔ یہ عہد قدیم سے ایران میں موجود ہے۔ ہندی میں بھی کسی نہ کسی شکل میں اس کا وجود پایا جاتا ہے۔ کوس کے متعلق حضرت احمد علی ہاہی اپنے مقالہ[2] میں رقم طراز ہیں۔

"خمرہ ای شکل بودہ کہ آہن یا مس تا تنہ درخت درست می نمودند و دوسر آں را پوست می بستند و بوسیلہ چوب برآں دار دمی ساختند و مخصوص زماں جنگ بودہ۔"

فارسی اور اردو کے شاعروں نے لفظ کوس استعمال کیا ہے۔ فردوسی کہتا ہے:

برآمد دم نامی آواز کوس ہمی آسماں بر زمیں داد بوس

خسرو نے اسی کوس میں ترمیم کر کے ایک ہندی ساز بنا دیا۔ کوس لکڑی سے بجایا جاتا ہے۔ خسرو نے انگلیوں سے بجانے کی جدت پیدا کی۔ اس کے لیے بھی طبلے کے

---

[1] مقالہ پی ایچ۔ ڈی رابطہ شعبہ و موسیقی مخطوطہ ص ۱۷۱

بولوں کی طرح بول بنائے. یہ ساز قوالی میں سنگت کا باجا ہے. عورتوں کے گیتوں اور سوھیلوں کے ساتھ بھی ڈھولک ہی مزا دیتی ہے۔ قوالی کا تو ڈھولک کے بغیر کوئی لطف ہی نہیں آتا۔ اس کی تھاپ محلس کو گرما دیتی ہے اور دھنوں اور لفظوں کو ابھارتی ہے۔

کوس
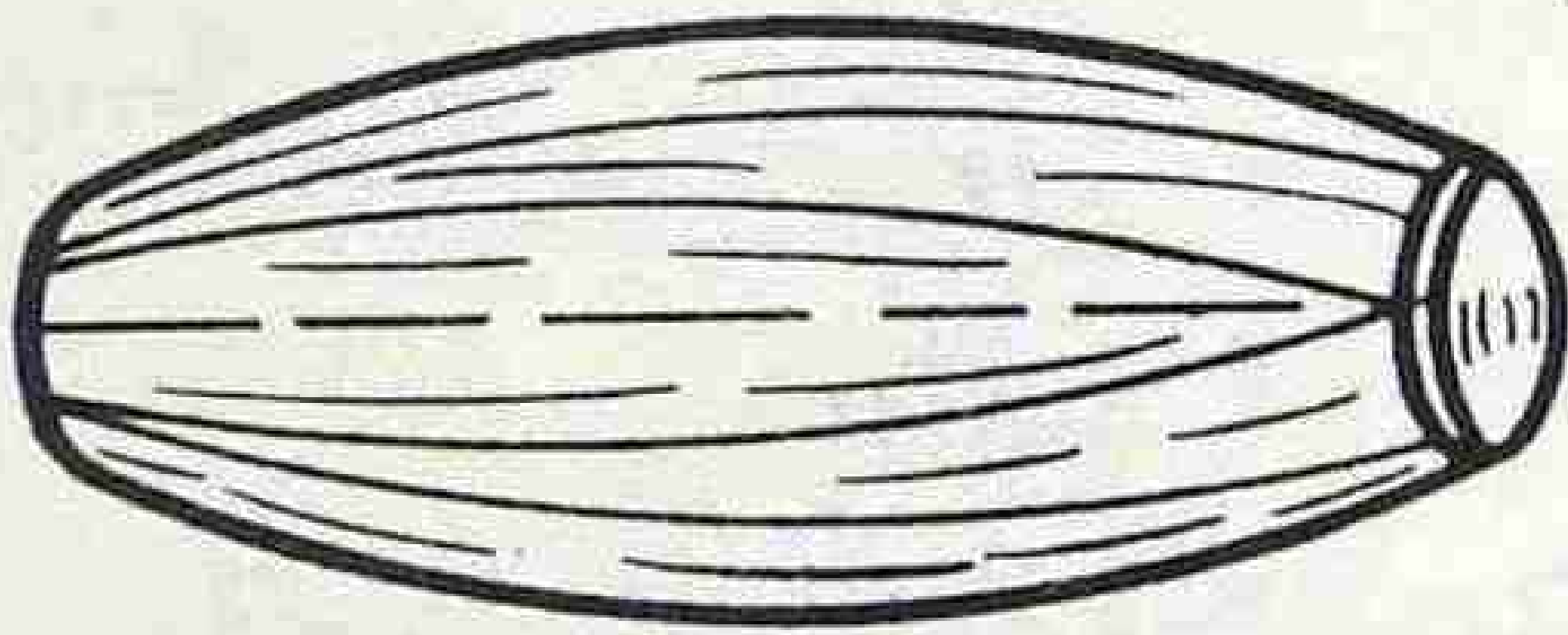
ڈھولک

تاروں کے ساز ستار کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ بھی امیر خسرو کی ایجاد پسند طبیعت کا ایک کرشمہ ہے۔ تار کا ساز عہد قدیم سے کسی نہ کسی شکل میں ہر ملک میں موجود رہا ہے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ ان کی شکل وصورت میں تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ یونان میں ایک قدیم ساز مانو کورڈ کے نام سے تھا یہ ایک تارا باجا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ فیثا غورث نے ہندوستان سے یونان لوٹ کر یہ ساز بنایا تھا[1]۔ ایک اور قدیم ساز لائر کے نام سے تھا۔ ایک مصری ساز کھتارا کے نام سے مشہور تھا۔ اس میں پندرہ یا اٹھارہ تار ہوتے تھے[2]۔ موجودہ دور کا گٹار اس کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ ہندوستان

---

[1] ہندوستانی موسیقی از فخرالاسلام

[2] مضمون از رغبت حسین رسالہ آجکل بابت اگست ۱۹۵۶ء

یں ویدوں کے زمانے سے کتابوں اور سنگ تراشی کے شہ کاروں میں سازوں کی شکلیں ملتی ہیں۔ ان میں بانسری، ڈھول، وینا وغیرہ اپنی ابتدائی شکلوں میں پائے جاتے ہیں وینا کے علاوہ تار کے دوسرے کئی سازوں کا پتا چلتا ہے۔ موجودہ دور میں یہ سرود، ستار، وچتر وینا، سارنگی وغیرہ کی شکلوں میں ہمارے سامنے ہیں۔ چین میں تاروں کا ساز عموماً انگلی کے ناخن سے بجایا جاتا ہے۔ مضراب سے دوطرف کی ضرب لگ سکتی ہے۔ اس کے برعکس ناخن سے صرف ایک ہی طرف کی ضرب لگتی ہے۔ استاد ولایت حسین خاں (ستاریے) نے ایک دفعہ بر سبیل تذکرہ بتایا کہ وہ کسی کلچرل مشن کے ساتھ ملک چین گئے تھے۔ وہاں انھوں نے چینیوں کو ناخن سے ساز بجاتے دیکھا تو مشورہ دیا کہ وہ لوگ تار کے ساز مضراب سے بجائیں۔ چینیوں نے پہلے مضرابیں بنانا خاں صاحب سے سیکھا اور پھر ہزار دو ہزار مضرابیں بنا ڈالیں۔ چینیوں کے سامنے اس کے نام کا مسئلہ تھا۔ مگر یہ بڑی آسانی سے طے ہوگیا۔ انھوں نے مضرابیں کا نام ولایت حسین رکھ دیا۔

اس موقعے پر ایران کے تاروں کے سازوں کا قدرے تفصیلی بیان ضروری معلوم ہوتا ہے۔ عہد قدیم سے کئی تاروں کے ساز ایران کی موسیقی میں مستعمل ہیں[1] مثلاً:

---

[1] تاروں کے سازوں کی تفصیلات اور تصاویر یہ ڈاکٹر احمد علی پناہی کے مقالے رابطۂ شعر و موسیقی سے ماخوذ ہیں۔

عود :

عود ابو نصر فارابی کی ایجادات سے ہے۔ اس ساز میں چار تار تھے لیکن بعد میں دس تار کر دیے گئے۔

عود
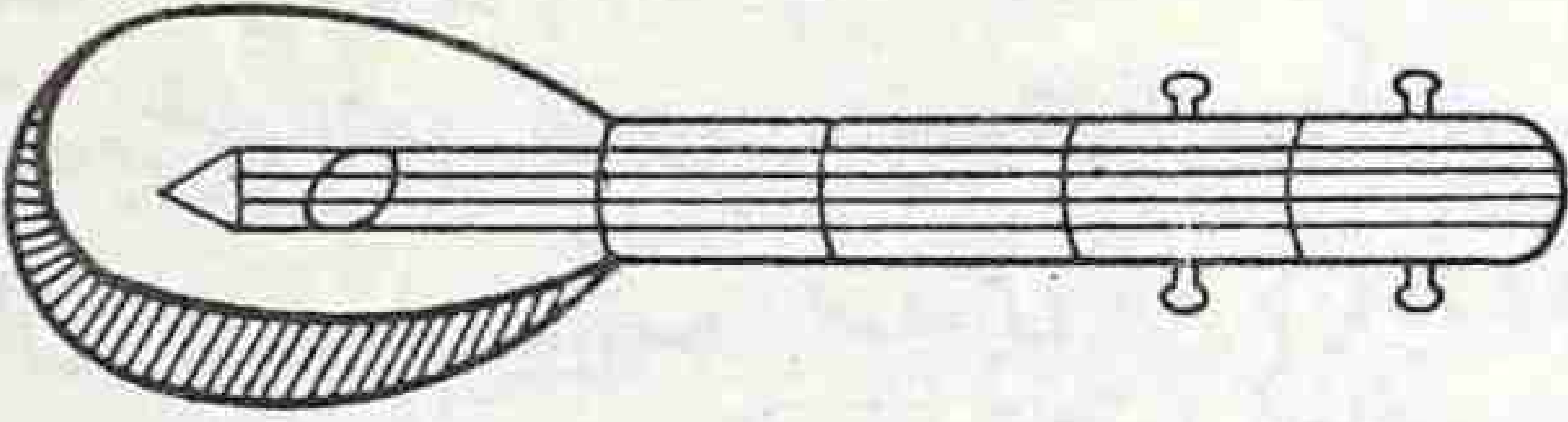
ششتائی :

یہ عود ہی کی شکل کا باجا ہے اس میں چھے تار ہوتے ہیں۔
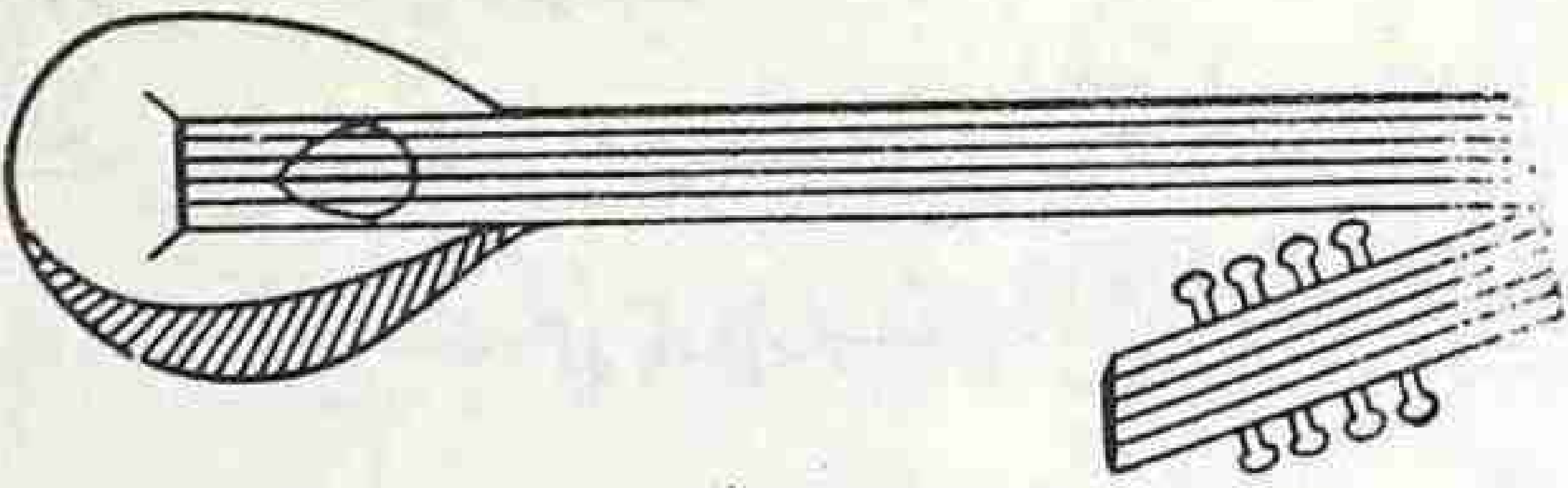
ششتائی

طرب رود :

اس میں ساٹھ تار ہوتے ہیں۔
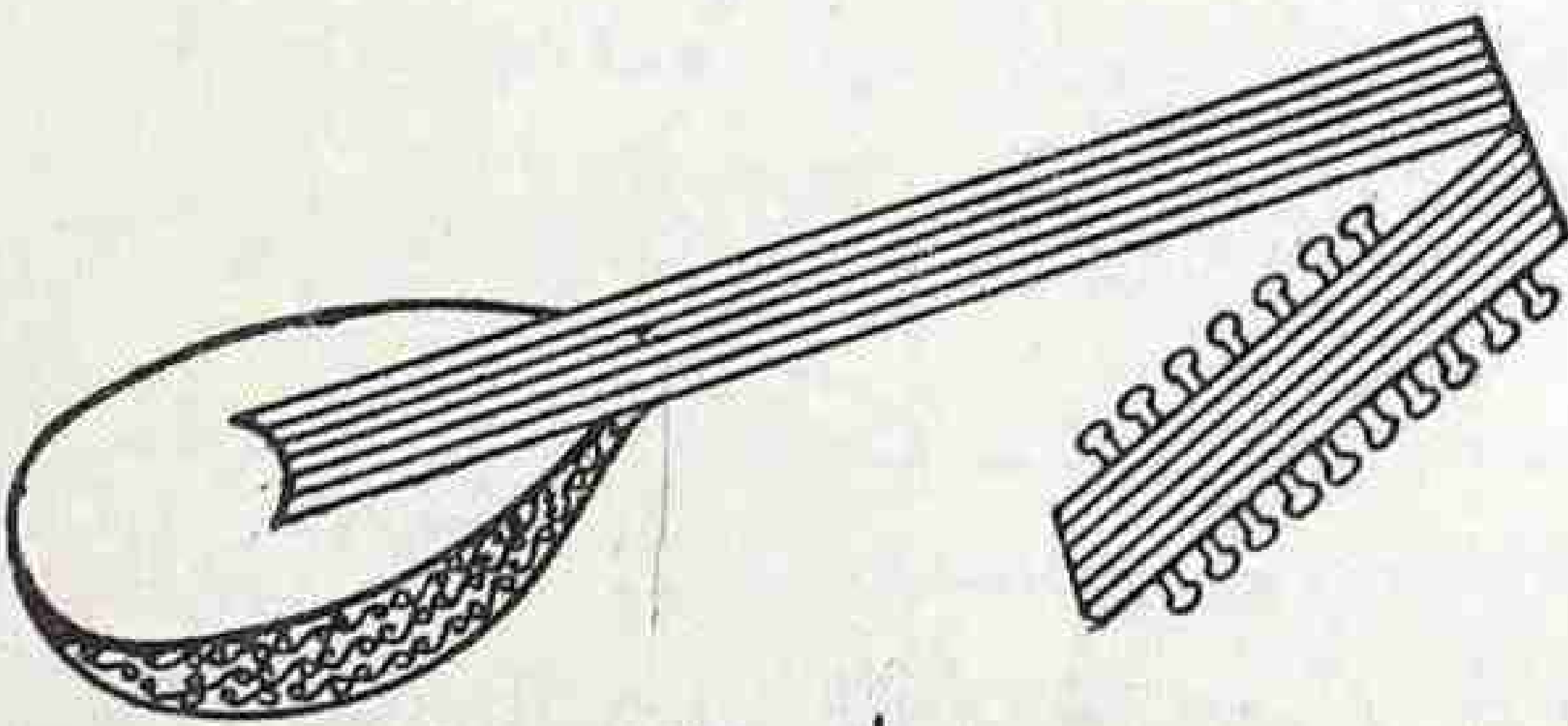
طرب رود

طنبور :

اس کو طنبور شروانیاں بھی کہتے ہیں۔ اس میں پانچ تار ہوتے ہیں۔ اس کے تونبے پر چمڑا لگایا جاتا ہے۔
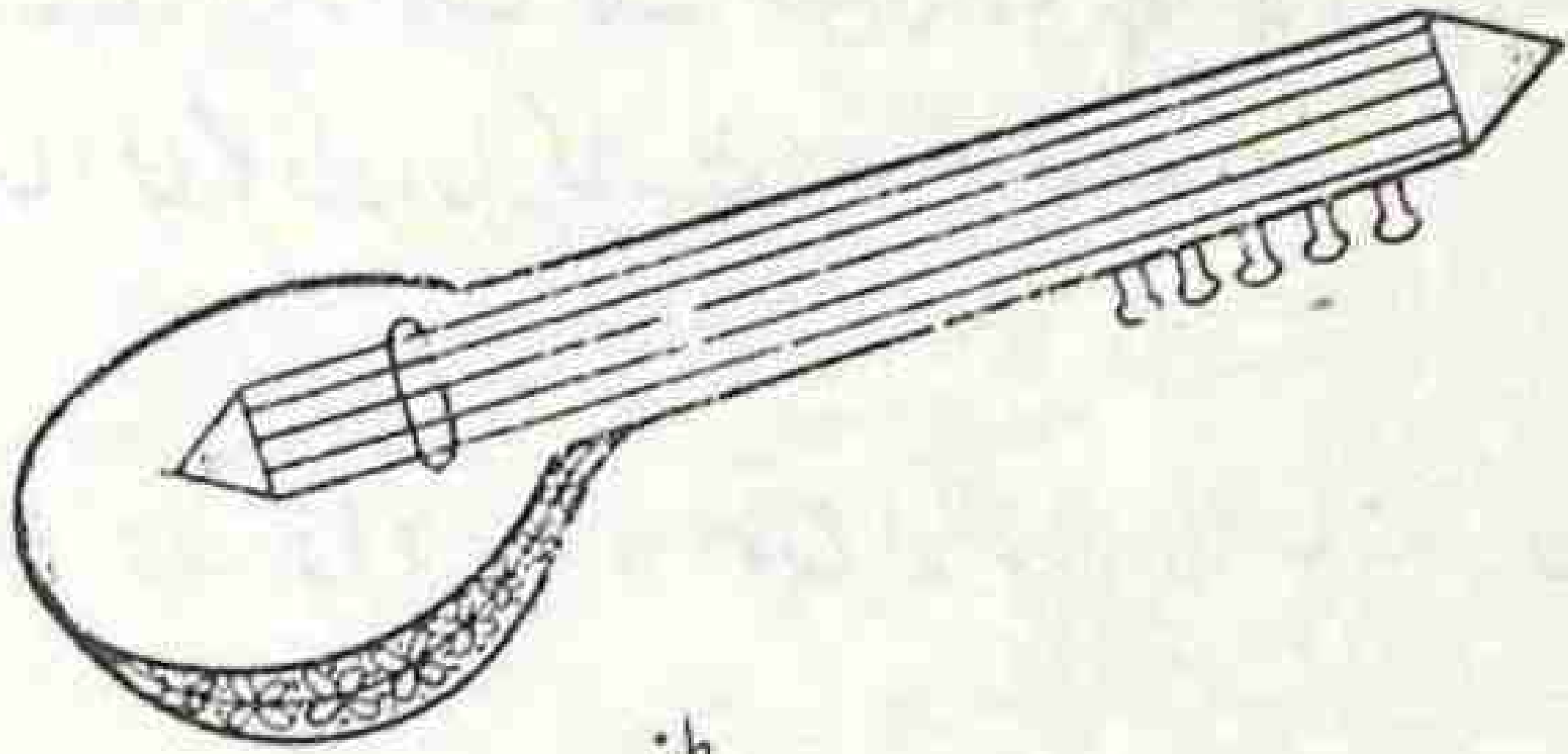
طنبور

طنبور ترکی :

اس میں تین تار ہوتے ہیں اور تونبے پر چمڑا کھنچا ہوا ہوتا ہے۔
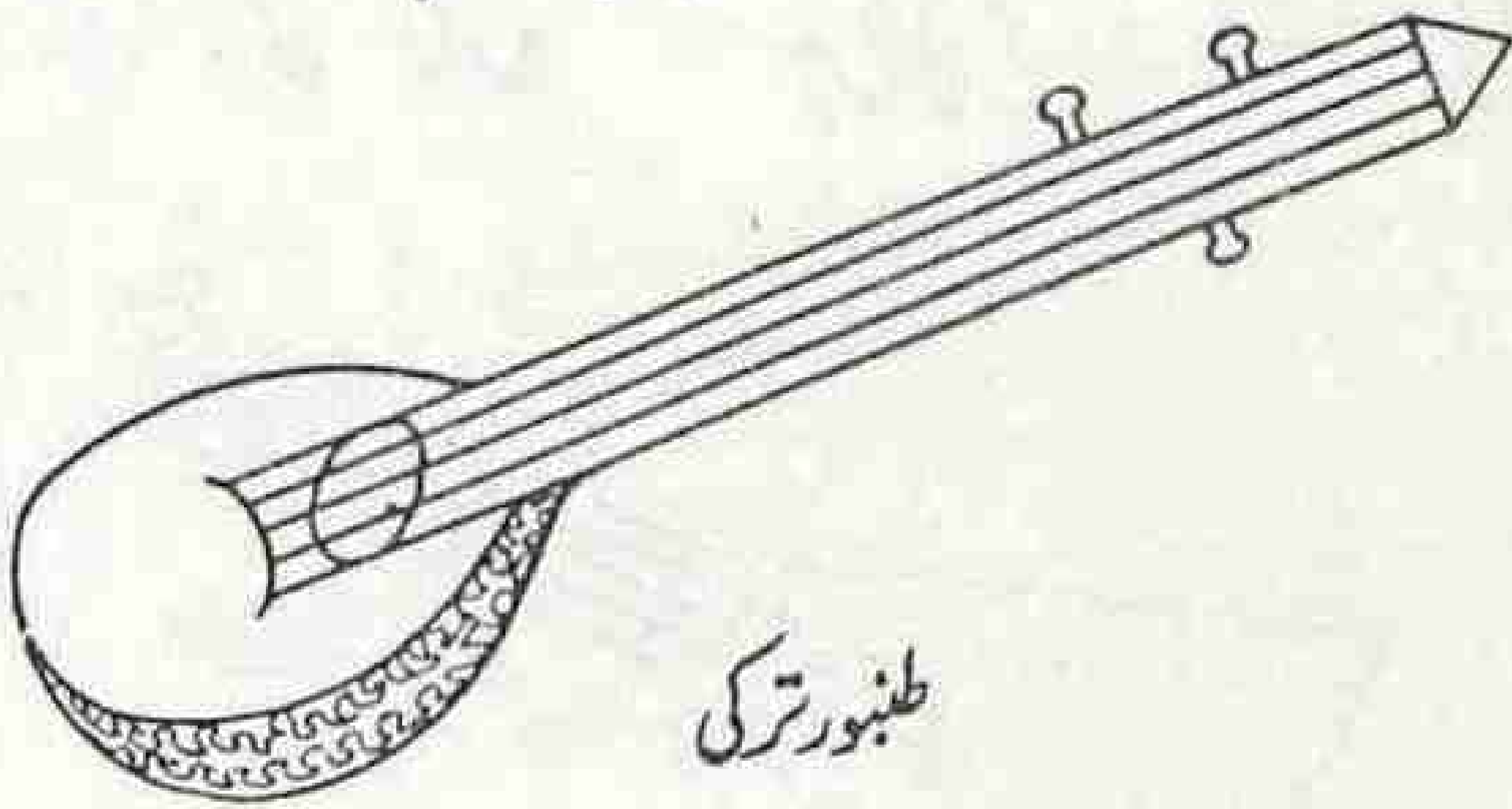
طنبور ترکی

روح افزا :

اس میں چھے تار ہوتے ہیں۔ اس کے تونبے میں سوراخ ہوتے ہیں۔
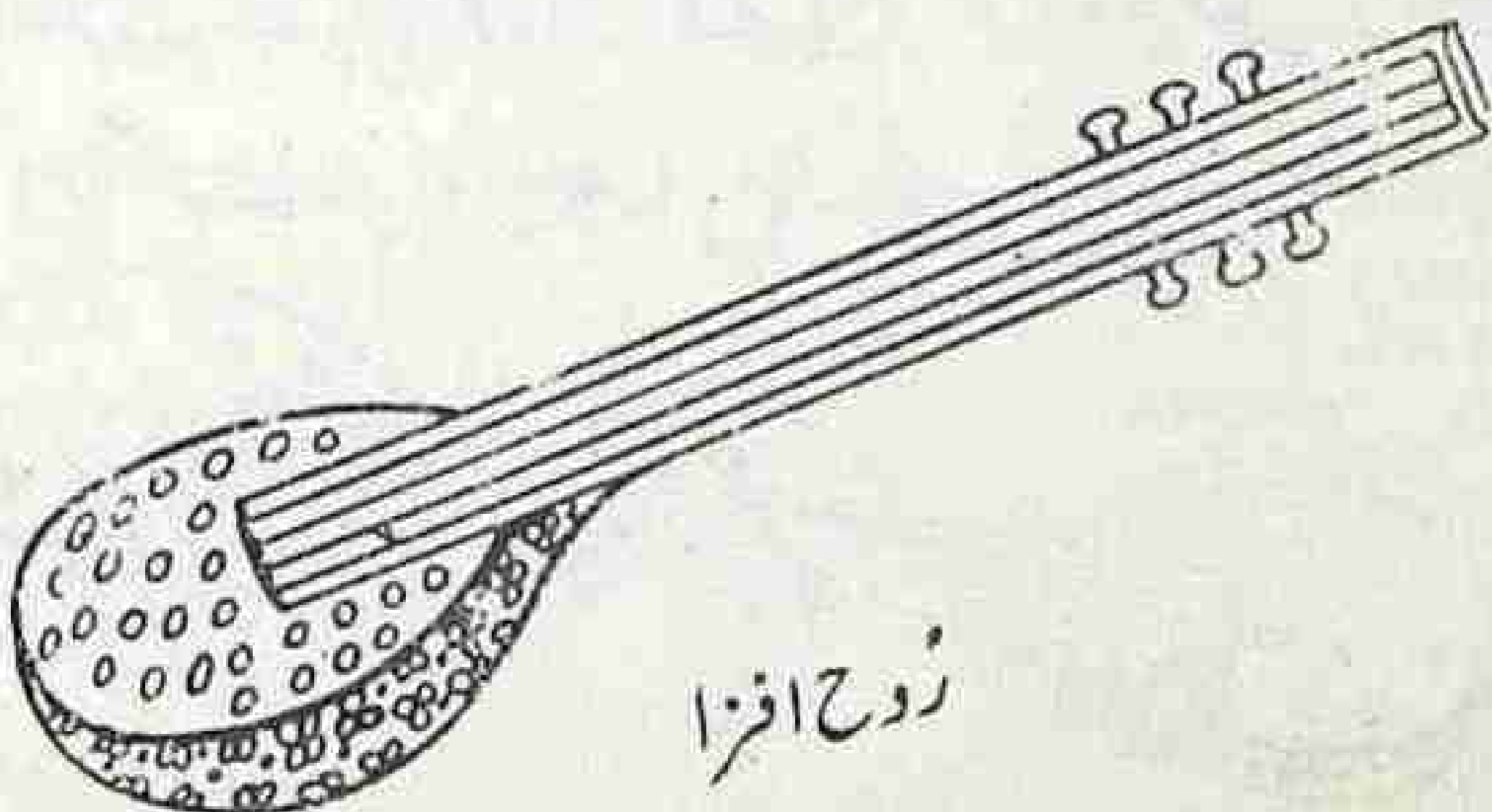
روح افزا

سہ تار:

اس ساز کو ستائی بھی کہتے ہیں۔ یہ عہد قدیم سے مقبول باجا بھی رہا ہے۔ اس میں تین تار ہوتے ہیں۔ جو جواہری (Bridge) پر ہوتے ہیں۔ اس کا تونبہ مثلث گھاٹ کا ہوتا ہے۔ ہر تار الگ الگ سُر میں ملایا ہوا ہوتا ہے۔ شعرا نے بھی اپنی تخلیقات میں اس کا ذکر بار بار کیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے۔

فردوسی:

ستا می بار بد آواز در داد   سماع ارغنوں را ساز در داد

خاقانی:

گاہ ولادتش ارواح خواند سورہ نور   ستارہ بست ستارہ سماع کرد سماع

منوچہری:

ہر طوطی کو بند قبائی دارد   ہر طاوسی دراز پائی دارد
ہر فاختہ ای ساختہ نامی دارد   ہر بلبلی کہ زیر و ستائی دارد
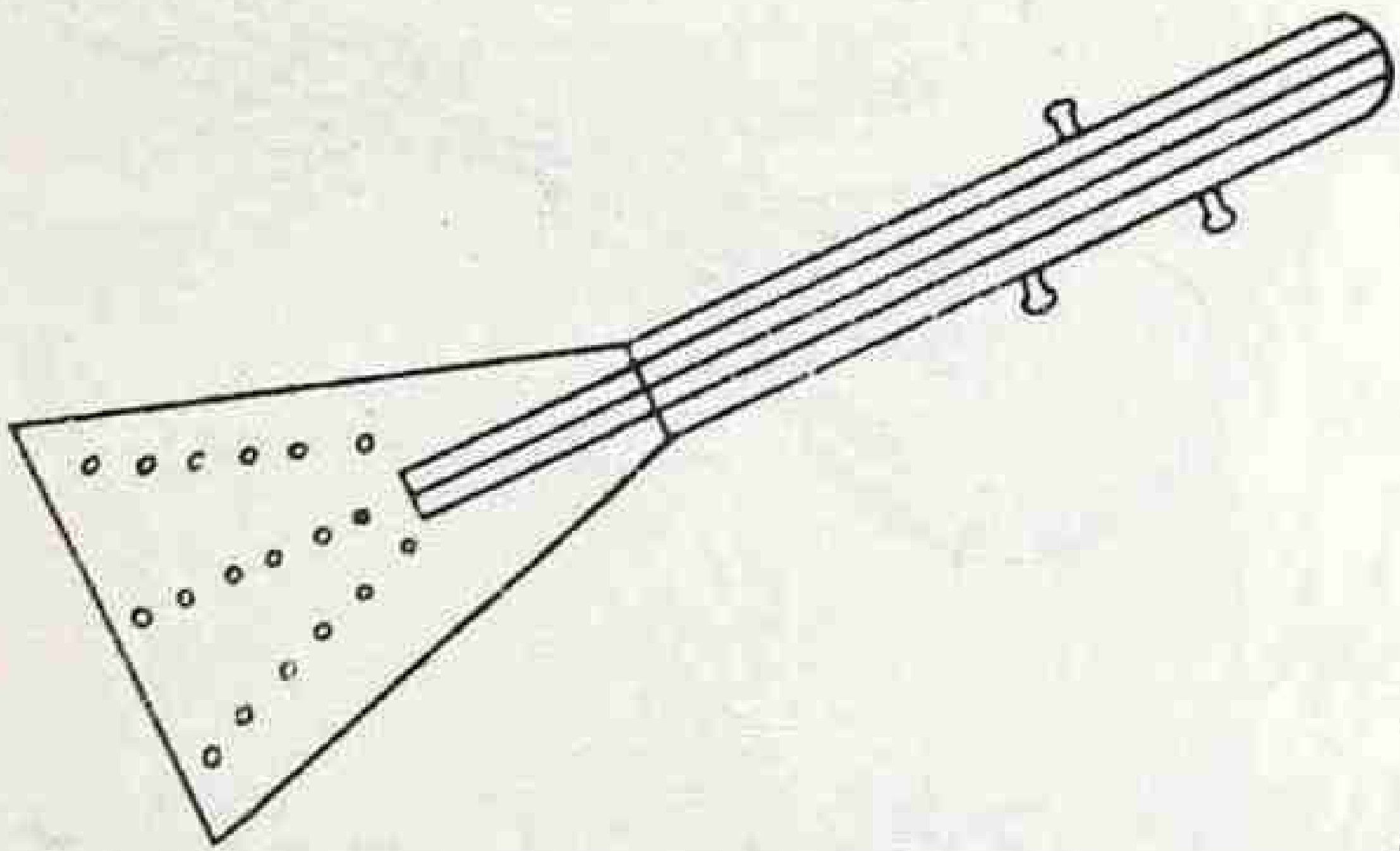
کنگرہ:

اس میں سات تار ہوتے ہیں اور اس کے بالن کو دو تونبوں پر نصب کیا جاتا ہے اس کو مضرابیں سے بجایا جاتا ہے۔ یہ ونیا جیسا باجا ہے۔
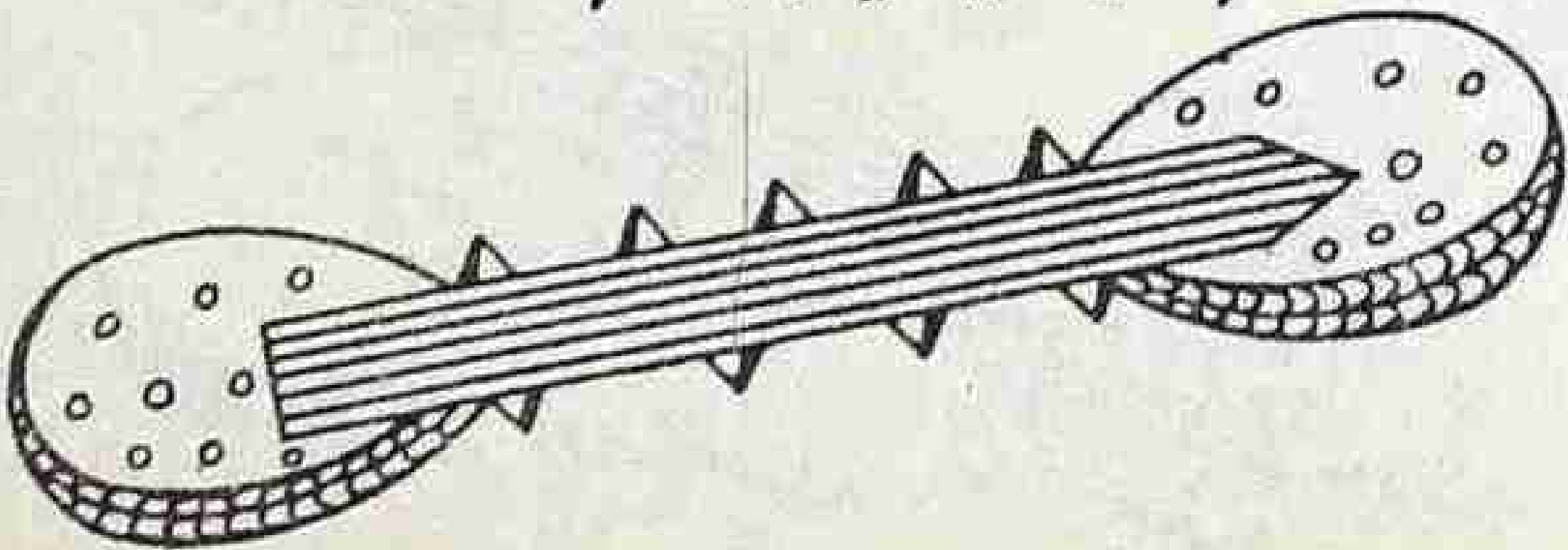
کمانچہ :

اس کا بانس، ناریل کی لکڑی کا ہوتا ہے۔ اس کے تار گھوڑے کے بال ہوتے ہیں۔ اس کو کمانچہ (گز) سے بجایا جاتا ہے۔
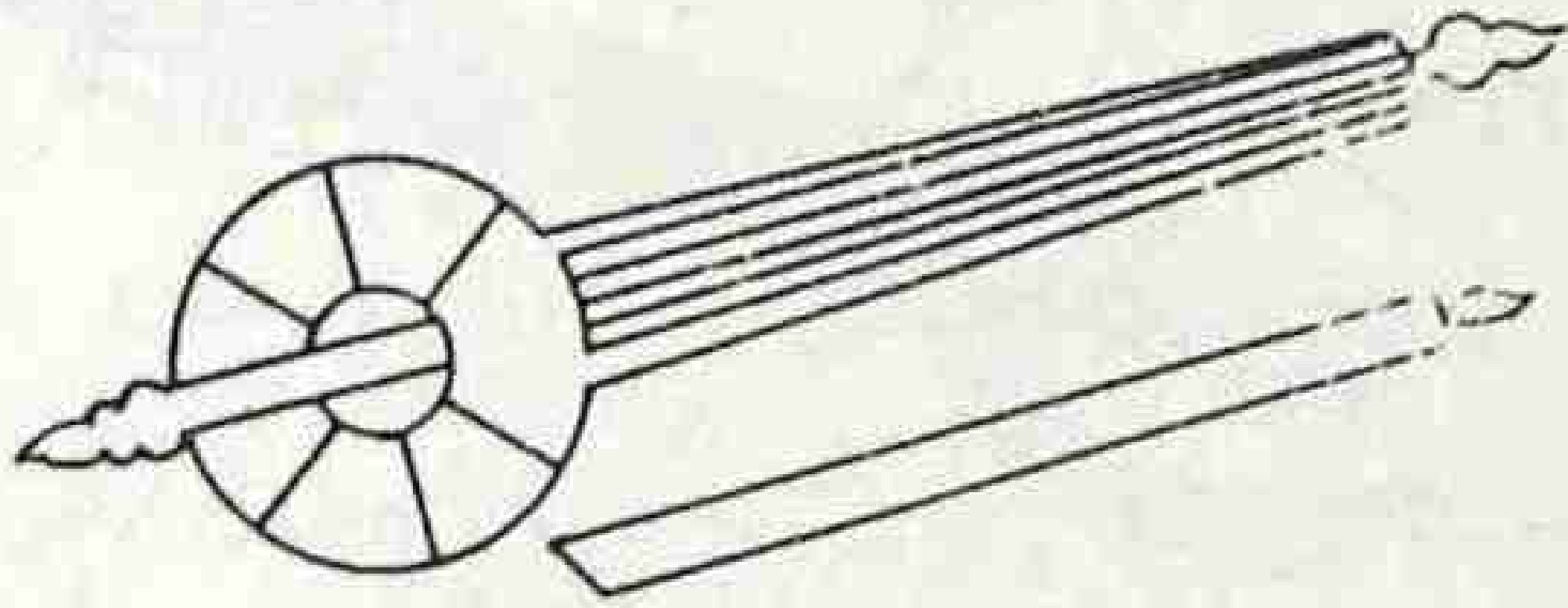
اس کا تونبہ، کمانچہ سے بڑا ہوتا ہے۔ اس میں دس تار اور تین کھونٹیاں ہوتی ہیں اس کو مضرابیں سے بجایا جاتا ہے۔

تار :
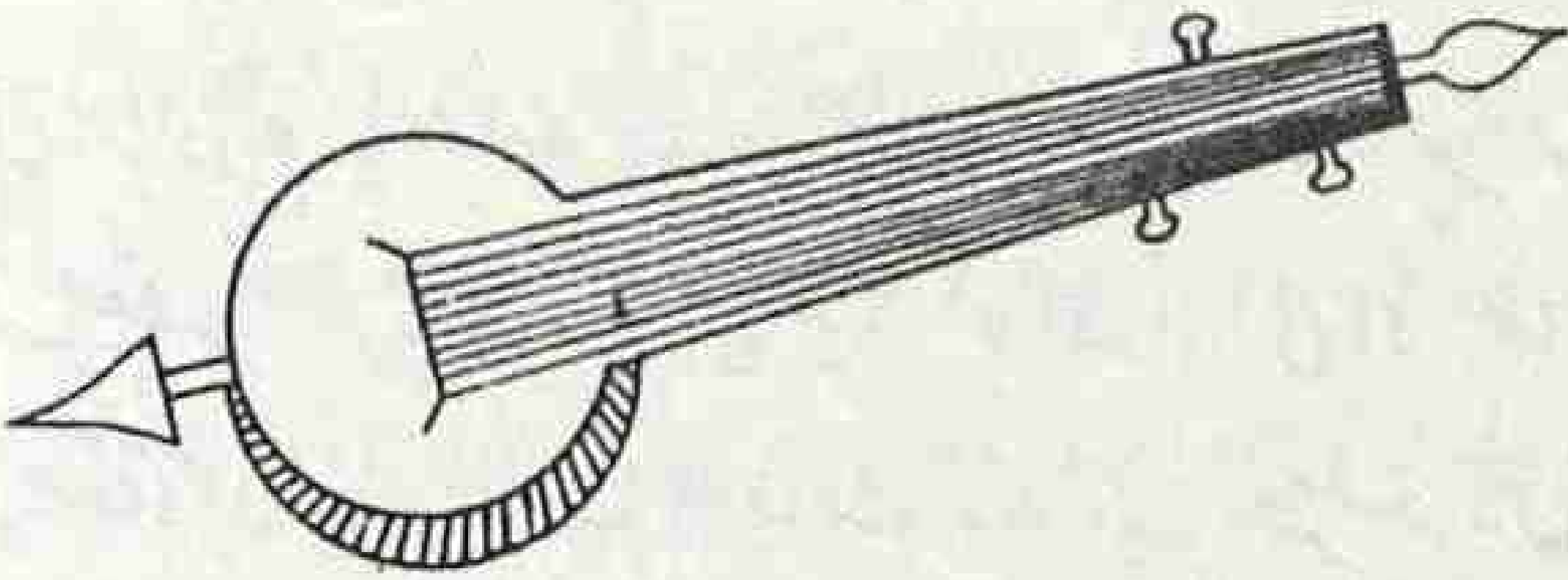
اس میں دو تونبے، پانچ تار، پانچ کھونٹیاں اور سولہ پردے (تار) ہوتے ہیں۔ اس کے تونبوں پر چمڑا مڑھا ہوا ہوتا ہے۔ یہ بھی بو نصر فارابی کی ایجادات سے ہے۔
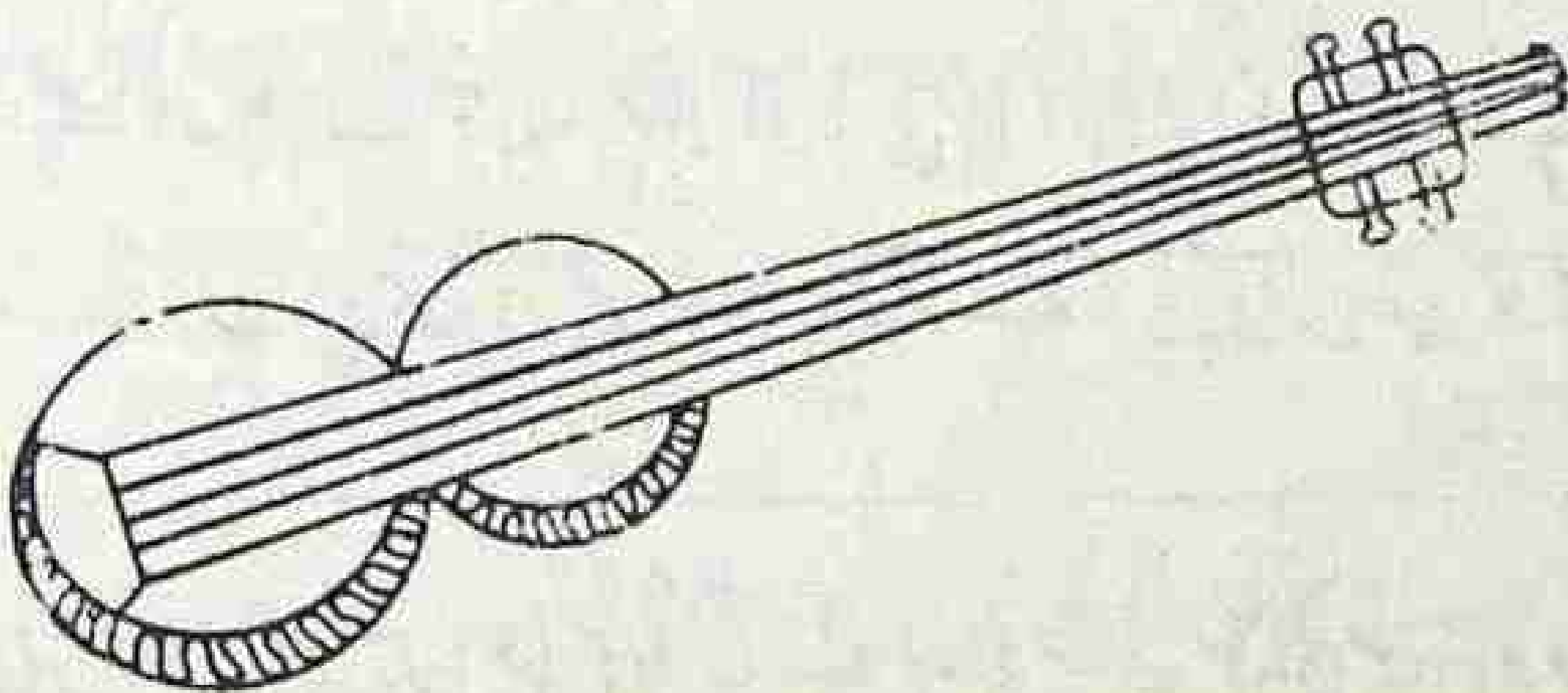
شہرود:

یہ عود کے مشابہ ہے۔ اس میں دس تار ہوتے ہیں۔
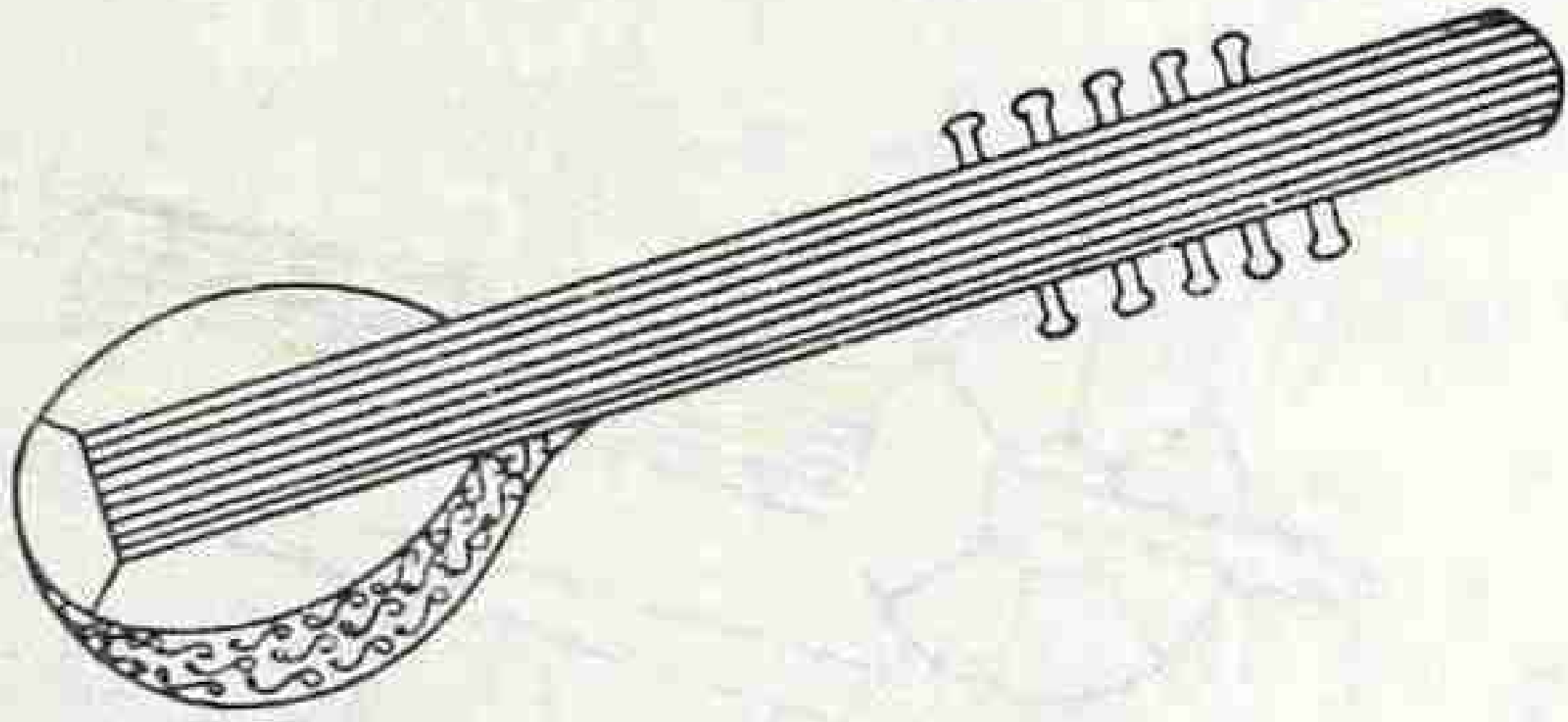
مذکورہ بالا بارہ ایرانی تار کے سازوں میں ایک ساز سہ تار یا سہ تال کے نام سے اپنی قدیم شکل میں موجود ہے۔ اس کا تونبہ مثلث ہے۔ اس میں تین تار ہیں جو جواہری پر سے گزر کر تونبے کے اندر بندھے ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض سازوں میں تین سے ساٹھ تک تار ہوتے ہیں۔ چھ تار کے ساز زیادہ مستعمل ہیں۔ تاروں کی تعداد کی کمی بیشی سے اہل ایران کا کیا مقصد تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ عربوں کے یہاں تار کی تعداد میں ایک مقصد مضمر ہے۔ بو علی سینا، ابو نصر فارابی اور صاحب اخوان الصفا کا بیان ہے کہ متقدمین نے قانون طبیعات کے پیش نظر ساز میں چار ساز رکھے تھے یہ تار کرۂ نار، کرہ ہوا، کرۂ ما اور کرۂ ارض کے طبیعی اثرات کی نمائندگی کرتے ہیں ان تاروں کے نغمے انسانی مزاجوں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثلاً: پہلا تار جس کو زیر کہتے ہیں اور جو کرۂ نار سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے نغمے یا سُر خلط صفرا کو قوی کرتے ہیں[1]۔

ہندوستانی تار کے سازوں میں تقریباً چھبیس ساز ہیں۔ ان میں وینا اور ستار مقبول ساز ہیں۔ ستار میں چھے تار ہوتے ہیں۔ پہلا تار باج کا تار فولادی ہوتا ہے۔ دو تار کھوج کے تار تانبے کے ہوتے ہیں۔ چوتھا تار پنچم کا تار ہوتا ہے، پانچواں لرز کا تار کہلاتا ہے اور

---

[1] بحوالۂ مضمون از مولانا محمد امین عباسی، کتاب ہندوستانی موسیقی ص ۷۲، ۷۱

چھٹا چکارا کہلاتا ہے۔ اس کا ایک تونبہ ہوتا ہے۔ اور تمام تار جواہری یا جواری پر سے گزر کر تونبے کی کنار پر ایک کیل میں ایک مخصوص گرہ سے اٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایرانی سازوں میں دو ایسے ہیں جن میں دو تونبے ہوتے ہیں، ان میں سے کنگرہ ہندوستانی ونیا کے مشابہ ہے۔

مذکورہ بالا تفصیلات کو دیکھنے کے بعد، یہ غور طلب امر سامنے آتا ہے کہ خسرو نے کس حد تک ہندی اور ایرانی سازوں کو پیش نظر رکھ کر ہندوستان کو ایک نیا ساز دیا۔ اس بارے میں غالب خیال یہ ہے کہ ستار خسرو کی اختراع پسند طبیعت کا ایک کرشمہ ہے۔ یعنی بین سے ایک تونبہ کم کر کے تین تار کا ساز ایجاد کیا جو سہ تار سے ستار ہو گیا۔ اس بارے میں محمد کرم امام نایک کہتے ہیں۔

"ستار امیر خسرو علیہ رحمتہ نے ایجاد کیا اور فقط تین تار ایک آہنی اور دو برنجی اور نصف تونبہ سے ہموزن بین کر دیا۔"[1]

کنور خالد محمود، عنایت الٰہی کا کہنا ہے کہ

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قدیم یونانی سِتھار، ایران سے ہوتا ہوا امیر خسرو کے دور میں ہندوستان پہنچا تو ستار کہلایا اور وقت اور مقام بدلنے سے اس کی شکل میں بھی ترمیم ہوتی چلی گئی۔ اس نظریے کے حامی حضرات نے اگر قدیم ترین ساز ونیا نہیں دیکھا تو وہ حق بجانب ہیں۔ . . . امیر خسرو نے اس پر تین تاریں باندھ کر اسے سہ تار کا نام دیا جو عوام تک پہنچتے پہنچتے ستار کہلایا۔ رفتہ رفتہ اس پر تاروں اور طربوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی . . . . . بعض لوگ چار تاریں، دو چکاریاں اور نو طربیں رکھتے ہیں۔ جب کہ پانچ تاروں، دو چکاریوں اور تیرہ طربوں کا بھی عام رواج ہے۔[2]

یہ بات صاف ہے کہ ستار کی قسم کے ساز ہند اور ایران دونوں ملکوں میں موجود

---

[1] معدن الموسیقی ص ۲۲۷

[2] کتاب سُر سنگیت۔ الجدید، لاہور ۱۹۶۱ء ص ۱۴۰-۱۴۳

تھے۔ نام ستار اپنی ابتدائی شکل سہ تار میں بھی موجود تھا۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایرانی سہ تار میں صرف تونبہ ہندی رکھ کر ساز تیار کر لیا۔ اس میں تین تار پہلے ہی سے موجود تھے۔ یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ بین میں ترمیم کر کے بین سے ایک ہلکا ساز تیار کر لیا گیا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایرانی سہ تار میں خسرو نے تین تار اور بڑھا کر چھے تار کر دیا ہو۔ جہاں تک اس کے نام کا تعلق ہے یہ سہ تار یا چھے تار کسی وجہ سے بھی گڑھ لیا گیا ہو۔ یہ زیادہ اہم نہیں۔ مگر اس بات سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ستار کے لیے بول ڈا، را ڈر خسرو ہی کی جودت طبع کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس سے پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ خسرو اتنے ذہین وطباع تھے کہ جس آواز کو چاہتے تھے بولوں میں باندھ لیتے تھے۔ خسرو نے بولوں کی تشکیل کر کے ان کو استعمال کرنے کا طریقہ بھی بتایا ہوگا۔ یہ جدت ستار کے نام اور تاروں کی تعداد سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ خسرو عالم، فاضل، شاعر، فنکار اور موسیقی کے نایک سبھی کچھ تھے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ کہ ہندی بین اور ایرانی سہ تار ان کے ذہن سے اوجھل نہ تھے۔ اسی کے پیش نظر خسرو نے ستار اختراع کیا ہوگا۔ لیکن اس کے بجانے کے طریقے اور قاعدے کسی سے مستعار نہیں لیے۔ لہٰذا ستار کو خسرو کی ایجاد کہنا غلط نہ ہوگا۔ جو شخص اجتہادی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر ہندی موسیقی میں ایک انقلاب برپا کرسکتا ہے اس کو ستار جیسے ساز کے موجد ہونے کے فخر سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔

سیاست میں انقلاب جلد بھی آتے ہیں اور بہ دیر بھی۔ لیکن سماج و ادب وغیرہ میں انقلاب صدیوں میں آتے ہیں۔ جب کبھی کسی شعبۂ حیات میں جمود آجاتا ہے تو ایسی غیر معمولی شخصیت کا ظہور ہوتا ہے۔ جو اپنی اجتہادی صلاحیتوں سے قدیم وجدید روایتوں میں وحدت پیدا کر کے جمود کو توڑ دیتا ہے۔ اس طرح مجتہد کی جدتوں کو قبولِ عام کا تمغا حاصل ہو جاتا ہے۔ جس کو نئے دور کے نام سے تعبیر

ے کتاب سُر سنگیت۔ الجدید، لاہور ۱۹۶۱ء ص ۱۴-۱۱۳

کیا جاتا ہے۔

خسرو کی شخصیت غیر معمولی تھی۔ یہ سیاست سے الگ نہیں رہے لیکن اس خارزار میں انھوں نے اپنا کوئی نقش نہیں چھوڑا لیکن فن وادب میں خسرو کی علمی، ادبی فنی، لسانی صلاحیتیں اور جدتیں ان میدانوں میں ایک انقلاب کی ذمے دار ہیں۔ ان کی ترقی پسندی سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس پر ہندوستان جتنا فخر کرے کم ہے۔ خسرو کو ہندوستانی ہونے پر بہت ناز تھا۔ انھوں نے اپنے رشحات قلم میں جس والہانہ انداز سے ہند کے زبان وادب پھل پھول، شجر حجر راگ رنگ وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ وہ ان کی ہندوستانیت کی دلیل ہے۔ خسرو صوفی نہیں، صوفی منش تھے انسانیت دوست بزرگ ہستیوں سے انھوں نے یک جہتی و یگانگت کا جو درس حاصل کیا تھا۔ وہ ان کی فطرت کا ایک اہم جزُ بن گیا تھا۔ فن موسیقی میں خسرو کا یہی فطری رجحان رُونما ہوا ہے۔ موسیقی میں ان کے رُوح پرور کرشمے رہتی دنیا تک قائم رہیں گے اور ہمیشہ اس عظیم المرتبت شخصیت کی خدمات کا شایانِ شایان اعتراف کیا جائے گا۔

کتابیات

۱۔ شعر العجم — مولانا شبلی نعمانی — جلد دوم ۱۹۴۶ء لاہور

۲۔ معدن الموسیقی — محمد کرم امام خاں نایک — ہندوستان پریس لکھنؤ ۱۹۲۵ء

۳۔ سُر سنگیت — کنور خالد محمود، عنایت الٰہی ملک — الجدید لاہور سنہ ۱۹۶۱ء

۴۔ ہماری موسیقی — ادارۂ مطبوعات پاکستان

۵۔ ہندوستانی موسیقی کی کشش — مسز مانی ساہوکار — تھیکر اینڈ کمپنی بمبئی ۱۹۴۴ء

۶۔ ہندوستانی موسیقی — مرتبہ۔ مفتی فخرالاسلام — ادارہ انیس اردو الہ آباد

۷۔ امیر خسرو اور موسیقی — مضمون: غلام عباس — رسالہ نگار اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء

۸۔ رسالہ آج کل — موسیقی نمبر — ستمبر سنہ ۱۹۵۶ء

۹۔ رسالہ آج کل — خسرو نمبر — نومبر سنہ ۱۹۷۴ء

۱۰۔ نہ سپہر — خسرو

۱۱۔ امیر خسرو — وحید مرزا

۱۲۔ امیر خسرو — شجاعت سندیلوی

۱۳۔ امیر خسرو — عرش ملسیانی

۱۴۔ قانون ستار — سید صفدر حسین خاں — سنہ ۱۸۷۰ء (سنہ ۱۲۸۷ھ)

۱۵۔ رسالہ آج کل — سنہ ۱۹۶۵ء

۱۶۔ رسالہ شاعر

گجرات کے اُمراء اور اردو ادب

۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء سو سال کی مدّت میں سیاسی لوٹ کھسوٹ نے ہندوستان کا نقشہ ہی بدل ڈالا۔ مغل شہنشاہیت کا زوال درحقیقت ہندوستان کا زوال تھا۔ انگریز گھات میں بیٹھا تھا۔ ہندوستان کی مقتدر قوموں میں اتحاد مفقود تھا۔ نفاق کا بول بالا تھا۔ جعفر بنگال اور صادق دکن جیسے بیسیوں ننگِ وطن میدانِ سیاست میں رواں دواں تھے۔ مرکزی حکومت کی کمزوری کے پیشِ نظر بعض اصحابِ اقتدار نے مرکز سے رشتہ ناتا توڑ کر خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس طرح ملک میں رجواڑوں، نوابیوں اور زمین داریوں کا جال بچھ گیا۔ ان میں پرانی ریاستوں کے ساتھ نئی ریاستیں بھی شمار قطار میں آ گئیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ان کے طمطراق میں اضافہ ہو گیا۔ کیوں کہ یہ سب حکومت برطانیہ کے نمک خوار، قصیدہ خواں خدّام قرار پا گئے مگر ۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد ان سب کا عدم وجود برابر ہو گیا۔ گجرات میں ایسی کئی ریاستیں اور زمین داریاں تھیں۔ ان ریاستوں میں سے مسلم ریاستیں، جونا گڈھ، بالاسینور، رادھن پور، پالن پور، مانگرول، کھمبائت، سورت بھروچ، سچین، مانا ودر وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بعض ریاستوں کے رئیسوں اور امیروں کے خاندانوں میں اردو ادب ایک تہذیبی روایت کا درجہ رکھتا

تھا۔ ان لوگوں کی اردو دوستی اور سرپرستی کی وجہ سے ادبی محفلوں میں اردو کا چراغ روشن رہا۔ اگلے وقتوں کے ان بزرگوں کی ادبی خدمات کا اعتراف نہ کرنا احسان ناشناسی ہوگی۔

سچین

ریاست سچین کے بیشتر نواب زادوں کو شعر و سخن سے شغف تھا۔ یہ ریاست سورت سے چند میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس کے بانی حبشی بحری سرداروں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ خاندان کے کئی بزرگ احمد نگر، بیجاپور، سورت میں بحری بیڑوں کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ بمبئی سے قریب جنجیرا (جزیرہ) اسی خاندان کی خود مختار حکومت تھی۔ جنجیرا میں سید عبدالکریم خاں اور ان کے بھائی میں جانشینی کے لیے تنازعہ ہوا۔ سیدی عبدالکریم مرہٹوں سے کمک حاصل کرنے کے ارادہ سے پونا گئے۔ پونا میں پیشوا نانا فرد نویس نے مصلحتاً سیدی عبدالکریم کو اپنے قبضہ کے چند گاؤں دے کر ایک نئی ریاست قائم کردی۔ اس طرح ۱۷۹۱ء میں ریاست سچین کا قیام عمل میں آیا اور سیدی عبدالکریم عرف نواب یالو ریاست کے پہلے نواب قرار پائے۔

نواب یالو نے ۱۸۰۲ء میں انتقال کیا۔ موصوف کو شعر و سخن میں بھی دخل تھا۔ کریم تخلص کرتے تھے۔ نواب یالو کے بعد ان کے فرزند اکبر سیدی ابراہیم خاں جانشین ہوئے۔ نواب ابراہیم خاں بہت ہی فیاض اور غریب پرور نواب تھے۔ ۱۸۵۲ء میں بعمر سو سال انتقال کیا۔ شاعری میں درک رکھتے تھے۔ محب تخلص تھا۔ یوسف زلیخا کا اردو میں اور مثنوی سحرالبیان کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ ہر ہفتہ در دولت پر محفل مشاعرہ منعقد ہوتی جس میں سورت کے نامی گرامی شعرا شرکت کرتے تھے۔ نواب سیدی ابراہیم خاں محب کے بعد ان کے بیٹے سیدی عبدالکریم خاں دوم جانشین ہوئے۔ نواب صاحب شاعر تو نہیں تھے لیکن شعر فہم ضرور تھے۔ ان کے تین بھائی سیدی عبدالرحیم اخلاص سیدی عبدالغنی سالار و غنی اور فرحت شاعری سے شغف رکھتے تھے۔ اخلاص علم دوست و ادب پرور شخص تھے۔ ان کا دربار شعرا سے بھرا رہتا تھا۔ سورت کے استاد شاعر میاں سمجھو سے ان کے گہرے مراسم تھے

جرأت کے شاگرد مہجور بھی ان کی سرکار سے منسلک تھے۔ سید عبدالغنی غنیؔ نہایت پرگو شاعر تھے میاں داد خاں سیاح ان کے احباب میں سے تھے۔ غنیؔ نے بمبئی میں مستقل اقامت اختیار کرلی تھی۔ موصوف نے ۱۸۸۴ء میں انتقال کیا۔ وفات سے ایک روز قبل احباب سے مفارقت کے بارے میں ایک طویل نظم لکھی تھی۔ نواب سیدی عبدالکریم دوم کے بعد سیدی ابراہیم خاں دوم نواب مقرر ہوئے اور ۱۸۷۳ء میں ان کے بعد تین نواب یکے بعد دیگرے ریاست کے نواب گذرے لیکن انھیں اردو ادب سے دلچسپی نہیں تھی۔ آخری نواب سیدی حیدر خان انگریزی ادب اور تاریخ میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ موصوف کا بہت وسیع مطالعہ تھا۔ ان کا کتب خانہ بھی قابلِ قدر تھا۔ نہ جانے اس کا کیا حشر ہوا۔

سورت

سورت کی سیاست میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا بہت زیادہ عمل دخل تھا۔ کمپنی کا صدر مقام سورت تھا۔ اسی شہر میں مغربی اقوام کی کوٹھیاں واقع تھیں۔ سورت کے لیے دہلی سے متصدی قلعہ دار وغیرہ کا تقرر ہوتا تھا۔ ۱۷۲۷ء میں ایک امیر تیغ بیگ خاں نے کمپنی کے بل بوتے پر متصدی سہراب خاں کو بہانے تراش کر نکال باہر کیا اور خود نواب کا لقب اختیار کرکے حاکم بن بیٹھا۔ اور کمپنی بہادر کو آقائے ولی نعمت مان لیا۔ اسی طرح دہلی سے تعلقات منقطع ہوگئے۔ تیغ بیگ خاں نے ۱۷۴۶ء میں انتقال کیا۔ اس کے بعد ۱۸۲۱ء تک چار نواب مسند پر متمکن ہوئے۔ سورت کے آخری نواب میر افضل الدین خاں کے اولاد نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے ۱۸۲۱ء میں نواب کی وفات پر سورت شہر اور مضافات وغیرہ کا انتظامیہ اور عدلیہ وغیرہ کو کمپنی نے اپنے اختیار میں لے لیا اور نواب کے داماد میر جعفر علی خاں بن میر سرفراز علی کو وظیفہ خوار جانشین مقرر کر دیا۔ میر جعفر علی خاں کے بھی اولاد نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے ۱۸۶۳ء میں ان کے انتقال کے بعد ان کے داماد میر غلام بابا کو جانشین مقرر کیا گیا۔

غلام بابا

نواب میر غلام بابا خاں غالب کے گجراتی محب کی حیثیت سے متعارف ہیں۔ ان کے نام غالب کے خطوط موجود ہیں۔ غلام بابا سورت کے قاضی خاندان کے چشم وچراغ

تھے۔ قاضی خاندان کے ایک بزرگ سید شرف الدین ترمذی ۔ورنہ منصب قاضی القضاۃ پہ فائز تھے۔ سورت ۔کے ایک جید عالم دصوفی خواجہ سید جمال الدین متوفی ۱۰۱۶ھ بن سید بادشاہ پردہ پوش کے خاندان کی عزیزداری تھی۔ خواجہ صاحب کے خاندان میں اولاد نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے خانقاہِ خواجہ صاحب کی سجادگی بھی قاضی خاندان میں منتقل ہوگئی تھی۔

غلام بابا نے اکتساب علم اپنے خاندان کے بزرگوں سے کیا تھا۔ ۱۸۵۹ء میں نواب میر جعفر علی کی چھوٹی بیٹی رحیم النساء سے شادی ہوئی تھی۔ غلام بابا نے ۱۸۹۳ء میں انتقال کیا۔ غلام بابا علم دوست نواب تھے۔ انھیں رفاہِ عام سے بہت دلچسپی تھی۔ بہت منکسرالمزاج شخص تھے۔ اہل سورت میں بہت مقبول تھے۔ منشی میاں داد خاں سیاح ان کے مصاحبین میں سے تھے۔ انھیں کے توسط سے نواب صاحب کے غالب سے دوستانہ تعلقات قائم ہوئے تھے۔ غالب نے غلام بابا کے بیٹے مظہر جیین کی ولادت ۱۸۶۶ء میں اور بیٹی بسم اللہ بیگم کی تقریب بسم اللہ پر قطعات لکھ بھیجے تھے۔ اس تقریب میں منشی نول کشور نے بھی شرکت کی تھی۔ غلام بابا نے کیمیائے سعادت کا اردو ترجمہ کرایا تھا۔ نواب موصوف خود تو شاعر نہیں تھے لیکن شعرا کے قدرداں تھے۔ کئی شاعروں کو اس سرکار سے وظیفے دیے جاتے تھے۔

شیخ خاندان

سورت کا شیخ خاندان علوم و فنون اور شعر و سخن کے سلسلہ میں خصوصیت رکھتا تھا۔ یہ خاندان صدیوں تک علم و ادب ،سیم و زر اور عز و اقتدار کی دولت سے مالا مال رہا۔ اس خاندان کے ایک بزرگ قاضی بغداد شیخ عبداللطیف عبیدی ۱۳۱۷ء میں گجرات آئے تھے۔ سلاطین گجرات شاہانِ مغلیہ اور کمپنی کے دوروں میں خاندان کے بعض بزرگ اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ایک بزرگ شیخ صفی (سیف خاں) جہانگیر کے عہد میں گجرات کے صوبیدار تھے۔ اور اُن کے فرزند شیخ محمد امین شاہجہاں کے زمانے میں دو دفعہ سورت کے متصدی مقرر کیے گئے تھے۔ ابتدا سے تجارت ان کا پیشہ تھا۔ کئی جہاز دں

کے مالک تھے۔ شاہانِ (گورنر) مغلیہ کی جانب سے خطاب عمدۃ التجار عنایت کیا گیا تھا۔

اس خاندان میں شیخ محمد فاضل بن شیخ محمد حامد بڑے عالم و فاضل گزرے ہیں۔ فاضل کئی عربی تصانیف کے مصنف تھے۔ موصوف نے تیس لاکھ روپیہ کے صرف سے چالیس ہزار مخطوطے جمع کیے تھے۔ دنیا کے دور دور کے ملکوں میں ان کے کاتب جاتے اور کتابوں کی نقلیں لاتے۔ عربی، فارسی اردو گجراتی میں بھی شعر کہتے تھے۔ ۱۷۱۶ء میں انتقال کیا۔ فاضل کے ایک فرزند شیخ محمود بھی شاعر تھے۔ محمود تخلص تھا۔ ان کا سنہ وفات ۱۷۷۰ء ہے۔ شیخ محمود کے پوتے شیخ حامد بن شیخ بہادر کو شعر و سخن سے بہت شغف تھا۔ کمپنی کے عہد میں سورت میں کمشنر کے عہدہ پر فائز تھے۔ حامد نے ۱۹۲۹ء میں وفات پائی۔ شیخ حامد کے بیٹے شیخ رضی الدین عرف بخشو میاں مورخ گذرے ہیں۔ چار سو کتب تواریخ کے مطالعہ کے بعد تاریخ کی دو کتابیں حدیقہ احمدی اور حدیقۃ الہند مرتب کیں۔ بخشو میاں کو اردو ادب سے دلچسپی تھی۔ شاعر بھی تھے۔ بخشش تخلص کرتے تھے۔ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ شیفتہ نے تاریخ وفات کہی ہے

(سنہ وفات ۱۲۶۵ھ ۱۸۴۸ء)

بخشو میاں بہ نور جو برساشب وصال

سال وفات آگیا میرے خیال میں

بخشو میاں بخشش کے چھوٹے بھائی شیخ فاضل عرف ڈوسو میاں بھی شاعر تھے۔ فاضل تخلص تھا۔ میاں سجھو سورتی سے مشورۂ سخن کرنے سے ایک مدت تک بھڑوچ میں عہدۂ منصف پر فائز رہے۔ ان کا سنہ وفات ۱۸۶۱ء کے آس پاس ہے۔ بخشو میاں کے فرزند شیخ بہادر بھی اپنے والد کی طرح انگریزوں کی ملازمت میں اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ چند سال کے بعد وہ سندھ چلے گئے تھے۔ اور واپسی پر سرکار گائکواڑ میں نائب صوبہ کے عہدہ پر خدمت انجام دیتے رہے۔ موصوف نے ۱۸۹۲ء میں انتقال کیا۔ بہادر کو علم و ادب کا ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ بہادر تخلص تھا۔ گھر پر شعر و سخن کی محفلیں منعقد ہوتی رہتی تھیں۔

ملّا خاندان

اس خاندان کے ایک بزرگ عبدالغفور بن ابوبکر ۱۶۸۸ء میں تجارت کی غرض سے نہروالا پٹن (گجرات) سے سورت آئے تھے۔ ملّا صاحب کو اللہ والوں کی خدمت کا بہت شوق تھا۔ ایک دفعہ ایک مجذوب ان کے مہمان رہے۔ اور جاتے وقت ندی کے کنارے پرانیس کشتیاں ریت بھر کر ملّا صاحب کو دیں۔ ملّا صاحب نے ریت کنارے پر پھینک دی اور گھر چلے آئے۔ کئی روز کے بعد ملّا صاحب نے کسٹم ہاؤس سے نیلام میں کھجور کے بستے خرید لیے۔ ایک بستہ میں انھیں ہیرے جواہرات مل گئے۔ اس دولت سے ملّا صاحب نے بڑے پیمانے پر تجارت شروع کی اور قلیل عرصہ میں اتنی دولت حاصل کرلی کہ ۱۹ جہازوں کے مالک ہو گئے۔ جب کبھی نیا جہاز بنواتے تو ایک ڈوب جاتا۔ انھیں بھی عمدۃ التجار کا خطاب خلعت، مراعات وغیرہ عطا ہوئے تھے۔ ملّا صاحب نے ۱۷۱۸ء میں انتقال کیا۔ اس زمانہ میں سورت میں تین مسلم کروڑپتی (۱) شیخ خاندان (۲) ملّا خاندان (۳) چلپی خاندان تھے ملّا عبدالغفور کے پوتے ملّا محمد علی بن عبدالحی سورت کی سیاست میں نمایاں تھے۔ بہراب خاں متصدّی کو ہٹانے میں تیغ بیگ خاں کی انھوں نے بڑی مدد کی تھی لیکن بعد میں ان سے بگڑ گئی اور تیغ بیگ خاں نے قید کر کے زہر دیدیا۔ سنہ وفات (شہادت) ۱۷۳۰ء ہے۔ اس سانحہ کے بعد محمد علی کے ایک بیٹے محمد حسین جدّہ چلے گئے اور ملّا فخرالدین نے آصف خاں کے ہاں پناہ لی۔ چند سال کے بعد یعنی تیغ بیگ خاں کے انتقال کے بعد فخرالدین سورت لوٹ آئے لیکن تیغ بیگ کے داماد سید اچھن (جو تیغ بیگ خاں کے جانشین تھے) نے فخرالدین کو قید کرلیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک افسر مسٹر لیمب (LAMB) جو فخرالدین کے دوست تھے۔ چھڑا لائے اور انھیں بمبئی بھجوادیا۔ فخرالدین نے آصف جاہ کو شکایت لکھ بھیجی۔ آصف جاہ نے جواب میں ایک شعر لکھ بھیجا۔

یا نہ تو نے گل کیا بلبل نہ تو نے باغباں اپنا
چمن میں کس بھروسے باندھتی ہے آشیاں اپنا

فخرالدین شاید آصف جاہ کی مرضی کے خلاف سورت آگئے تھے۔ فخرالدین نے

جواب الجواب میں لکھا۔

بلبل بے کس کی گنجائش چمن میں کیوں کہ ہو
ایک تو صیاد تھا اور باغباں دشمن ہوا

حالات سازگار ہونے کے بعد فخرالدین بمبئی سے سورت لوٹ آئے۔ ۱۷۸۷ء میں انتقال کیا۔ فخرالدین کو شاعری سے شغف تھا۔ مضطر تخلص کرتے تھے۔ ان کا دیوان احمد آباد کے کتب خانہ پیر محمد شاہ میں محفوظ ہے۔ دیوان کے سرورق پر شیخ بہادر کی مہر ہے۔ اور قطعۂ تاریخ وفات مضطر بھی تحریر ہے۔

فخرالدین مضطر کے پوتے قطب الدین بن مجیدالدین ابوالفتح شاعر تھے قطب تخلص تھا۔ ایک شاعر اختر حیدرآبادی قطب کے ملازمین میں سے تھے۔ قطب کی غزلوں کا ایک ردیف دار مجموعہ راقم کے پاس ہے۔ قطب نے خوب عیش و عشرت میں زندگی گذاری۔ ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا۔

بھڑوچ کا نواب خاندان

۱۷۲۳ء میں مرزا عبداللہ بیگ بھروچ کا متصدی تھا۔ آصف جاہ کے گجرات چھوڑ کر جانے کے موقع پر عبداللہ بیگ نے مغلیہ سرکار سے سبک دوشی کا خیال ظاہر کیا۔ آصف جاہ نے اپنی جاگیر کا علاقہ بھروچ عبداللہ بیگ کو دے کر ایک خود مختار ریاست قائم کردی۔ اس طرح عبداللہ بیگ نیک عالم کے خطاب کے ساتھ پہلا نواب قرار پایا۔ ۱۷۳۸ء میں عبداللہ بیگ کے بعد اس کا بیٹا محمد بیگ نیک عالم دوم مسند نشین ہوا اور ۱۷۵۴ء میں عبداللہ بیگ کا پوتا مرزا حامد بیگ رفیع الدولہ جانشین ہوا۔ حامد بیگ عالموں اور ادیبوں کا قدر دان تھا۔ اس کو شعر و سخن سے بھی شغف تھا۔ صاحب تخلص کرتا تھا۔ حامد بیگ نے ۱۷۶۷ء میں انتقال کیا۔ حامد بیگ کے بعد ان کا بیٹا مرزا معز بیگ جانشین ہوا۔ معز بیگ کا واجب الادا رقم پر کمپنی سے تنازعہ ہوا۔ بات طول پکڑ گئی اور فیصلہ میدان جنگ میں ہوا جنگ میں نواب صاحب کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا اور بھڑوچ کا علاقہ کمپنی کے تصرف میں چلا گیا۔ دربار کے شاعر عباس نے اس جنگ کا احوال مثنوی میں قلم بند کیا ہے مثنوی

کا تاریخی نام جنگ غمگین ۱۱۹۳ ہے۔ نواب معزبیگ کے بیٹے مرزا امیرالدین کو شعر وسخن سے شغف تھا۔ تخلص ضاحکؔ تھا۔ ضاحک نے ۱۸۳۳ء میں وفات پائی۔

میر صاحب کا خاندان۔ بڑودہ

بڑودہ کے دو خاندان اپنی اردو دوستی کے لیے خصوصیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک میر صاحب کا خاندان ہے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ میر سرفراز علی سہسوان ضلع بدایوں سے بڑودہ آئے تھے۔ اور اپنی فوجی لیاقت کی وجہ سے سرکار گائکواڑ میں منصب اسلحہ دار سردار حاصل کر لیا تھا۔ کئی بار کمپنی اور سرکار گائکواڑ کے درمیان سفارتی خدمات بھی انجام دی تھیں ان کے تین بیٹے تھے۔ ان میں سے میر اکبر علی اور میر جعفر علی سورت کے نواب میر افضل الدین کے داماد تھے۔ میر جعفر علی سورت میں نواب افضل الدین متوفی ۱۸۴۳ء کے جب جانشین مقرر کیے گئے چوں کہ اولاد نرینہ نہیں تھی۔ میر اکبر علی کو ان کے والد کے بعد منصب اسلحہ دار سردار عطا ہوا۔ میر اکبر علی نے ۱۸۶۰ء میں انتقال کیا اور ان کے بیٹے میر ابراہیم علی جانشین ہوئے۔

میر ابراہیم کی تعلیم سورت میں ہوئی تھی۔ سورت کے ایک عالم منشی لطف اللہ فرندی ان کے اتالیق تھے۔ لطف اللہ شاہ کمال مالوی کی اولاد سے تھے۔ انگریزی زبان وادب پر قدرت حاصل تھی۔ ان کی خود نوشتہ سوانح عمری ان کے ایک شاگرد کپتان ایسٹ وک نے لندن سے ۱۸۵۰ء میں شائع کی تھی۔ میر ابراہیم کو شاعری میں دخل تھا۔ وفاؔ تخلص کرتے تھے۔ وفا اور ان کے بھائی عالم علی غالبؔ سے شرف تلامذ رکھتے تھے۔ ہر ماہ اپنے در دولت پر مجلس میلاد ومحفل مشاعرہ منعقد کرتے تھے۔ وفا نے ۱۸۸۵ء میں انتقال کیا۔ وفا کے بیٹے میر احتشام علی صاحب بھی صاحب دیوان شاعر گذرے ہیں۔ تخلص جادؔو تھا۔ حکیم سید احمد مودودی میر صاحب کے عزیزوں میں سے تھے۔ فداؔ تخلص تھا۔ یہ بھی غالبؔ کے شاگرد تھے۔ ۱۳۰۳ھ میں وفات پائی۔ ان کے فرزند محمود حسن افسر ظہر دہلوی کے شاگرد تھے۔

نواب خاندان۔ بڑودہ

اس خاندان کے ایک بزرگ سید عبید اللہ ۱۵۰۰ء میں ہرات سے ہند آئے تھے۔

ان کی پانچویں پشت میں سید نورالدین حسین خاں متوفی ۱۷۹۹ء کو دہلی میں اعلیٰ منصب حاصل تھا۔ بڑودہ میں نواب خاندان کے پہلے شخص یہی تھے۔ سید نورالدین اپنے بزرگوں کی طرح علم وفضل میں درک رکھتے تھے۔ ان کی تصانیف برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں۔ مغلیہ سلطنت میں نواب موصوف کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ انھیں نواب بہادر اور خان کے خطابات بھی عنایات کیے گیے تھے۔ ۱۷۸۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے انھیں سفارتی خدمات کے لیے مخصوص کیا تھا۔ مہاراج گائکواڑ بھی ان کے قدر دانوں میں سے تھے۔ سرکار گائکواڑ نے ان کے ایک بیٹے میر کمال الدین اول کو بڑودہ کے نواب کا درجہ دیا تھا۔ نورالدین کے سات بیٹے تھے۔ جو سرکار گائکواڑ کے علاوہ بھونسلے (ناگپور) حیدرآباد نظام، کمپنی وغیرہ میں منصب دار تھے۔

نواب صاحب کے ایک بیٹے نظام الدولہ نواب میر صدرالدین حسین خاں نظام نواز جنگ اورنگ آباد کے صوبیدار تھے۔ اور پرینڈا اور نلدرگ کی قلعہ داری بھی حاصل تھی۔ موصوف شاعر تھے۔ ان کے پوتے صدرالدین وجیہہ الدین بھی شاعر گذرے ہیں۔ صدؔر تخلص کرتے تھے۔ صدؔر کا زمانۂ حیات ۱۸۷۶ء تا ۱۹۲۲ء تھا۔ بڑودہ کے یہ جانشین نواب قرار پائے تھے۔ صدؔر سچے اور ہمدرد مسلمان تھے۔ مسلمانوں کی ابتر حالت دیکھ کر انھیں بہت افسوس ہوتا تھا۔ یہ حالی اسکول کے نمائندے تھے۔ اپنی قوم کی اصلاح و فلاح کے لیے تقریباً ۷ چھوٹے بڑے رسالے لکھے تھے۔ اردو نثر و نظم دونوں کے ذریعہ انھوں نے اہم خدمات انجام دی ہیں۔ صدؔر بہت بڑے ذاتی کتب خانے کے مالک تھے۔ مولانا شبلی اور حکیم اجمل خاں صاحب نے کتب خانہ کی تعریف کی ہے۔ بڑودہ میں اردو فارسی کا پہلا مدرسہ قائم کرنے کا سہرا ان کے سر ہے۔

مانگرول کا نواب خاندان

مانگرول کاٹھیاواڑ کی ایک قدیم بندرگاہ ہے۔ ایک زمانہ میں یہ تجارتی مرکز تھا باربوسا نے اس کی تعریف کی ہے۔ ۱۳۷۳-۷۵ء میں تغلق حکومت کے ایک صوبیدار

عزالدین آدم شاہ نے یہاں جامع مسجد تعمیر کرائی تھی۔ مانگرول بارہ سال ۱۷۴۸ء تک پیشوا کے قبضہ میں رہا۔ دو بھائی شہاب الدین اور فخرالدین نے مرہٹوں کو شکست دے کر اسے حاصل کیا اور خود مختار حکومت قائم کرلی۔ اس وقت سے چار نواب فخرالدین، شیخ میاں، بدرالدین، باپو میاں ۱۸۸۰ء تک اس کے حاکم رہے۔ ۱۸۸۰ء میں نواب حسین میاں بن باپو میاں کے جانشین ہوئے۔ ۱۹۰۸ء میں حسین میاں کے بھائی جہانگیر میاں نامزد کیے گئے۔ ان کے بعد عبدالخالق اور ناصر میاں نواب ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں ناصر میاں پاکستان ہجرت کر گئے۔

ابتدائی عہد کے نوابوں کے ذوق و شوق کا پتہ نہ چلا۔ حسین میاں صاحبِ ذوق نواب تھے۔ یہ علم موسیقی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ شاعر تو نہیں تھے لیکن شاعروں کے قدردان تھے۔ مرزا داغ دہلوی، جلیل اور دوسرے نامی گرامی شعرا مانگرول کو زینت بخش چکے ہیں ایک شاعر مشتاق رامپوری قسمت آزمائی کے لیے ادھر آ گئے لیکن رسائی نہیں ہو رہی تھی۔ ایک شام مشتاق درِ دولت پر پہنچ گئے۔ نواب صاحب باغ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دربان ان کی پرچی پہنچانے کو تیار نہ تھا۔ اتفاقاً سے نواب کے پانچ چھ بھانجے کھیلتے ہوئے دربان کے قریب آ گئے۔ دربان نے اشارہ کیا کہ پرچی انھیں دے دی جائے۔ بھانجے شیخ احمد میاں پرچی نواب صاحب کے پاس لے گئے۔ لکھا تھا۔

چھوڑ کر دارالسّرور رامپور
آ گیا مشتاق پابوسِ حضور
دیر سے حاضر بہ خانہ زاد ہے
اے سلیماں جاہ کیا ارشاد ہے

نواب صاحب نے پڑھتے ہی باریابی کا حکم دیا۔

جہانگیر میاں ریونیو میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ بھائی کے انتقال کے بعد انھیں نامزد کیا گیا۔ جہانگیر میاں کو شعر و سخن سے دلچسپی نہیں تھی۔ قوم کے بچوں کی تعلیم ان کا مطمح نظر تھا۔ اپنے ذاتی جیب خرچ سے یہ بچوں کو وظیفہ دیتے تھے۔ ایک صنعتی اسکول بھی قائم کیا تھا۔ اصلاحِ قوم اور رفاہِ عام کے لیے ہر ممکن طریقہ پر کوشش کرتے رہے۔ ۱۹۴۲ء میں

انتقال کیا۔

مذکورہ بالا رئیسوں اور امیروں کے علاوہ گجرات کے کئی اور معزز خاندان ایسے ہیں جنھوں نے اردو کی ادبی ولسانی روایات کو قائم رکھا ہے۔ اس مضمون میں طوالت کے خوف سے ان کا ذکر نظر انداز کیا گیا ہے۔

سید حمید الدین مدنی حشمت

حشمت کے بزرگ بیجاپور اور مرہٹہ فوجوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ سید ولی ۱۷۱۹ء میں پلاجی راؤ کے ہمرکاب گجرات آئے تھے۔ ریاست گائکواڑ کے قیام کے بعد ان کے پوتے سید محمد فوج میں اسلحہ دار سردار کے عہدہ پر فائز تھے ۱۸۱۳ء میں ان کے فرزند سید فخر الدین اسلحہ دار مقرر کیے گئے۔ سید فخر الدین کے نانا سید عبدالقادر بھی اسلحہ دار سردار تھے (عبدالقادر شاہ وجیہہ الدین علوی کے بھائی کی اولاد سے تھے) ۱۸۵۹ء میں سید فخر الدین کے بیٹے سید نصیر الدین کو یہ اسامی عنایت کی گئی کیونکہ ان کے بڑے بھائی کمال الدین نے صوفی طریق اختیار کر لیا تھا۔ حیدر آباد کے نواب افضل الدین نظام خامس ان کے بہت معتقد تھے۔ نصیر الدین سر سید احمد خاں کی تحریکوں سے بہت متاثر تھے۔ مگر انگریزوں کے سخت مخالف تھے۔ موصوف نے سورت میں قابل قدر سماجی و اصلاحی خدمات انجام دی ہیں۔

حشمت نصیر الدین کے منجھلے بیٹے ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے۔ میٹریکیولیشن تک تعلیم حاصل کی۔ موسیقی میں درک رکھتے تھے۔ کشتی پہلوانی کا شوق تھا۔ شاعری سے شغف تھا۔ منشی میاں داد خاں سیاح (شاگرد غالب) سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ یہ شوق ۱۹۲۱ تک ہی قائم رہا۔ ۱۹۲۱ء میں جنگ آزادی کی تحریکوں میں حصہ لیتے رہے۔ ۱۹۲۵ء میں میونسپل کاؤنسلر منتخب کیے گئے تھے۔ ان کا نصب العین خدمت الناس تھا۔ عمر بھر سیاسی، سماجی، اصلاحی کام کرتے رہے۔ انھیں تعلیم اور اردو زبان سے والہانہ شغف تھا۔ برسوں انتھک جدوجہد کے بعد سورت میں مسلم ایجوکیشن سوسائٹی اور انگلو اردو اسکول قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ شہر کی تقریباً تمام موقر انجمنوں کے سکریٹری کی حیثیت سے

برسوں خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۹۵۲ء میں انتقال ہوا۔

بخشی میر معین الدین شوکت

۱۷۴۶ء میں سورت کے نواب تیغ بیگ خاں کی وفات کے بعد ان کے داماد سید اچھن جانشین ہوئے۔ اچھن نے اپنے بھائی سید مٹھن بیٹے میر نجم الدین کو منصب بخشی گری عطا کیا۔ نجم الدین کے بعد ان کے فرزند میر صدر الدین اور ان کے بعد میر معین الدین اس منصب پر فائز رہے۔ معین الدین کے بعد یہ منصب ان کے بھائی میر کمال الدین کے خاندان میں منتقل ہوگیا۔ کمال الدین کی وفات پر ان کے بھائی عظیم الدین جانشین ہوئے۔ کیونکہ کمال الدین کے بیٹے امین الدین نے فقر اختیار کر لیا تھا۔ عظیم الدین کے بعد میر صدر الدین بخشی ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں صدر الدین کے انتقال پر ان کے بیٹے میر تیغ بر خاں جانشین مقرر کیے گئے۔ تیغ بر خاں نے ۱۹۵۴ میں وفات پائی۔

میر معین الدین شوکت بخشی میر کمال الدین کے بھائی میر ضیاء الدین کے پوتے ہیں والد کا نام افضل الدین تھا شوکت معاشی فکر سے آزاد تھے۔ سیر و شکار اور شعر و سخن مشغلے تھے۔ نظم، قصیدہ، واقعہ نویسی، تاریخ گوئی کی طرف طبیعت زیادہ مائل تھی۔ آغا شاعر دہلی سورت تشریف لائے تھے۔ انھیں آغا صاحب سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ حمید الدین حشمت نے شوکت کی غزلوں، نظموں، قصیدہ وغیرہ کا ایک مختصر مجموعہ مرتب کر کے شائع کیا تھا۔

نرمد ـــــ گجرات کا ایک عظیم المرتبت مصلح شاعر

نرمدا شنکر ۲۴ راگست ۱۸۳۲ء کو بوقت صبح بمقام سورت پیدا ہوئے۔ ان کے والد لال شنکر دوے قوم کے ناگر برہمن تھے۔ لوگ انھیں بڑی عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ لال شنکر وید اور سنسکرت کے عالم تو نہیں تھے لیکن ان علوم میں کافی دسترس حاصل تھی۔ ان کا ذریعہ معاش موروثی پیشہ خوشنویسی تھا اور بمبئی کے چھاپے خانے میں ملازم تھے۔ لیکن تھوڑے عرصے کے بعد اس پیشہ کو ترک کر کے بمبئی کے ہائی کورٹ میں ۱۵ سے ۳۰ روپے ماہوار پر عمر تمام کر دی۔

نرمد کے بچپن کا زمانہ ختم ہوا۔ پانچ سال کی عمر ہوتے ہی خانگی مدرسے میں بٹھا دیا گیا۔ یہاں کچھ عرصے پڑھنے کے بعد سرکاری اسکول میں بٹھایا۔ یہاں ساڑھے تین سال میں گجراتی کی تعلیم ختم کر چکے تو ثانوی تعلیم کے لیے بمبئی کے الفنسٹن اسکول میں بھیجے گئے۔

نرمد چونکہ بہت ذہین و فہیم تھے۔ ابتدائی مدارج بہت جلد طے کرتے ہوئے چلے آرہے تھے۔ لہٰذا اُن کے اساتذہ ان کو بہت عزیز رکھتے تھے اور نرمد بھی اپنے اساتذہ کی بہت عزت و حرمت کرتے تھے۔ نرمد کو ادب اور علم حساب سے خاص شغف تھا خود لکھتے ہیں: "مجھے انگریزی کتابیں پڑھنے میں اور اقلیدس کی مشقیں حل کرنے میں بے حد

لطف آتا تھا۔" اسی وجہ سے ان کے استاذ مسٹر گریہام نرمد کو جامیٹریشن (مہندس) کے نام سے یاد کرتے تھے۔

پانچ سال میں ہائی اسکول کی تعلیم ختم کر کے کالج میں داخلے کے لیے انٹرنس کا امتحان دیا جس میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہو کر دس روپے کا وظیفہ حاصل کیا۔

کالج میں ابھی آٹھ ماہ گذرے ہوں گے۔ کہ نرمد کو اپنی پڑھائی ترک کر کے بمبئی کو خیر باد کہنا پڑا۔ نرمد بچپن ہی میں مسلک ازدواج سے منسلک ہو چکے تھے اور جب دلہن سنِ بلوغ کو پہنچی تو نرمد کے خسر نے لال شنکر کو لکھا۔" دونوں بچے سن شعور کو پہنچ گئے ہیں اور میرا خیال ہے کہ اب نرمد سورت آکر اپنے گھر بار کی طرف توجہ مبذول کریں تو بہتر ہوگا۔ لال شنکر نے خیال کیا کہ بہو کو بمبئی بلالیں تاکہ نرمد کی پڑھائی میں خلل نہ آئے۔ اور اثناء میں نرمد کی والدہ کا انتقال بھی ہو چکا تھا لہذا نرمد کو سورت میں تنہا بھی رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن چند مجبوریوں کی وجہ سے نرمد کو بمبئی چھوڑنا ہی پڑا۔

۱۸۵۱ء میں نرمد سورت آئے اس وقت ان کی عمر صرف ۱۷ سال تھی۔ پاؤں میں زنجیر پڑ چکی تھی۔ فکرِ معاش دامنگیر ہوئی۔ خوش قسمتی سے چند روز ہی میں سورت سے تین میل دور قصبہ راندیر میں ایک پرائمری اسکول میں مدرس کی جگہ مل گئی۔ اور اس کے چند روز بعد ہی سورت کے ایک پرائمری اسکول میں پندرہ روپے ماہوار پر تقرر ہو گیا۔

سورت آنے کے بعد سلسلۂ تعلیم منقطع ہو گیا۔ نرمد اپنا بیشتر وقت یا تو دوستوں کی گرم صحبتوں میں گزارتے یا بھنگ بیکر خیالات کے سمندر میں غوطے لگایا کرتے خود لکھتے ہیں۔ "ان دنوں ایک دھن سمائی تھی کہ عالموں کے شایان شان کوئی ایسا کام کیا جائے تاکہ شہرتِ عام اور بقائے دوام حاصل ہو۔" اس کی داغ بیل تو بمبئی ہی میں پڑ چکی تھی۔ کالج کے زمانۂ تعلیم میں اصلاحِ قوم کے لیے ایک انجمن قائم کی تھی جس کے صدر خود تھے۔ سورت آنے کے بعد بھی یہ جوش و ولولہ کم نہ ہوا۔ یہاں بھی ایک انجمن قائم کی جس کے تحت ایک اخبار "گیان ساگر" شائع ہوتا تھا۔ نرمد اب تک خیالات کی دنیا میں تھے۔ نرمد نے قیام سورت میں نہ تو اس اخبار کے لیے کوئی مضمون لکھا نہ کسی انگریزی یا گجراتی کتاب کا مطالعہ کیا۔

شادی کو ابھی تین سال نہ ہوئے تھے کہ اس قید سے نجات ملی۔ اسقاط حمل سے بیوی راہیٔ عدم ہوئی۔ بیوی کی وفات نے نرمد کو عالم خیال سے میدانِ عمل میں ڈھکیل دیا۔ سورت میں رہنے کی اب کوئی وجہ نہ رہی۔ پھر کالج یاد آیا اور بمبئی کا قصد کیا۔

۱۸۵۴ء میں نرمد بمبئی گئے دوبارہ کالج میں داخلہ لیا اور ساتھ ساتھ جیوراج بابو کے بچوں کے اتالیق بھی ہو گئے۔ کالج کے شش ماہی امتحان میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہو کر پندرہ روپے کا وظیفہ حاصل کیا۔ لیکن یہ سب تین سال کی رنگ رلیوں کا کفارہ تھا کیونکہ اس کے بعد نرمد کا دل پڑھائی سے پھر ہٹ گیا۔

نرمد کا بیان ہے: "جب دوسرے طلبا امتحان کی تیاری میں مشغول رہتے تو اس وقت میں ولایت جانے کے رنگین خواب دیکھتا۔ یہاں مجھے اتنا یاد ہے کہ میں نے انگریزی کے قریب سو شعر موزوں کر کے پروفیسر ریڈ کے سامنے پیش کیے اور انھوں نے ہنس کر ٹال دیا۔ یہ سال زندگی کے پہلے دور کا آخری سال تھا۔ پہلے دور کے اختتام اور نئے دور کے آغاز میں جنگ ہو رہی تھی۔ خیالات میں کشمکش کی وجہ سے طبیعت پریشان رہتی تھی۔ ایک طرف تین سال کی رنگ رلیاں آنکھوں کے سامنے رقص کرتیں تو دوسری طرف شہرت حاصل کرنے کا خیال چین سے بیٹھنے نہ دیتا تھا۔ مزاج میں بھی پورا استقلال پیدا نہیں ہوا تھا۔ اور خشک طبعی رنگین مزاجی کو کچل رہی تھی۔ اسی کشمکش میں یہ سال بیکار گیا اور امتحان میں ناکامی ہوئی اب پڑھائی کا سلسلہ ترک کر کے ملازمت کی ادھیڑ بن میں پڑ گئے۔ اور بڑی کوششوں کے بعد الفنسٹن اسکول میں ٹیچری کی جگہ پر فائز ہوئے۔

۲۲ سال کی عمر تک نرمد نے گجراتی کی دو چار سے زیادہ نظمیں نہ پڑھی ہونگی۔ نہ کبھی شعر گوئی کی طرف طبیعت راغب ہوئی۔ ۱۸۵۵ء کے اواخر میں نرمد کا رجحان اس طرف ہوا۔ خود لکھتے ہیں: "اس سال کے ستمبر میں ڈھیرا بھگت کی دو چار نظمیں نظر سے گذریں۔ اس کے چار پانچ روز بعد مجھے شعر کہنے کے شوق نے گدگدایا۔ ایک نظم اسی بحر میں موزوں کی اور دوسرے ہی روز ایک اور نظم کہی۔ دل میں خیال آیا کہ اگر میں اس طرح شعر کی مشق کرتا رہوں تو شاعر ہو سکتا ہوں تحصیل علم ملازمت، شادی وغیرہ سب میرے لیے سامان عیش و طرب ہیں اور شاعری سے

بھی مجھے کیف و سرور حاصل ہوتا ہے تو پھر یہ بھی کیوں نہ کروں؟ پیٹ بھرنے کے لیے روٹی کا ٹکڑا کہیں سے بھی مل جائے گا۔"

نرمد اپنی شاعری کا آغاز ۱۲ رستمبر سے کرتے ہیں۔ کیونکہ یہی دن اُن کی سالگرہ کا تھا۔

نرمد شاعروں کی صف میں تو بیٹھ گئے، قلیل عرصے میں شاعری کی ہر صنف سے کم و بیش واقفیت بھی حاصل کرلی لیکن علم عروض سے نابلد تھے۔ اس کمی سے نرمد کو سخت کوفت ہوتی تھی۔ لہٰذا اس کے شوق میں سورت آئے۔ یہاں ایک دوست کے پاس عروض پر قلمی نسخہ پایا۔ اس دوست نے یہ شرط لگائی کہ نرمد مکان پر آکر نقل کرلیں۔ نرمد نے یہ قبول کیا اور قریب ڈیڑھ ماہ میں یہ کام ختم کرکے واپس بمبئی چلے گئے۔ جب اس ایک کتاب سے کام چلتا نظر نہ آیا تو بمبئی میں کسی پنڈت سے علم عروض سیکھنا شروع کیا اور اس طریقہ کو بھی تسلی بخش نہ پایا تو پونا جاکر کسی عروض داں سے یہ علم سیکھا۔ بہت ہی قلیل عرصے میں اس علم پر اس قدر مہارت حاصل کرلی کہ جب ان کے والد نے عروض پر ایک رسالہ لکھنے کو کہا تو نرمد نے چند ہی دنوں میں ایک مختصر رسالہ لکھ کر اپنے والد کی خواہش پوری کردی۔

نرمد اس قدر پر گو تھے کہ ۱۸۵۸ء تک تین چار مجموعۂ کلام اور دو تین چھوٹی تصانیف بھی شائع ہو چکی تھیں۔ اب ملازمت میں کوئی دلبستگی نہ رہی قلم کو ذریعۂ معاش ٹھہرا کر ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔ جس روز استعفیٰ دے کر مکان آئے۔ اور قلم پر نگاہ پڑی تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس کو خوب ٹکٹکی باندھ کر دیکھا اور کہا "اے قلم اب میں تیرے سہارے ہوں۔"

اس وقت نرمد ستارہ بیزی کر رہے تھے۔ ہر جگہ انھیں کا چرچا ہونے لگا۔ اُن کی نظموں پر تنقیدیں نکلنا شروع ہو گئیں۔ ان کے کلام کی عوام میں مقبولیت ہونے لگی۔ قدامت پسندوں کے دلوں میں تخریب کا خوف پیدا ہو رہا تھا۔ اور ریفارمرز (Reformers) پھولے نہیں سماتے تھے۔

۱۸۵۶ء میں ڈاہی گوری نام کی ایک بیوہ سے دوبارہ عقد کیا لیکن یہ بیوی کم عمر ہونے کی وجہ سے نرمد کے مکان پر ۱۸۶۰ء میں آئیں۔ اس قدیم سماجی رسم کو توڑنے میں نرمد

پر پہاڑ ٹوٹے لیکن نرمد نے کچھ پروا نہ کی۔ اس کے بعد ۱۸۶۳ء میں نرمد کے والد ۵۶ سال کی عمر میں اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ یہ نرمد کے عروج کا زمانہ تھا۔ ۱۸۶۳ء میں نرمد نے اپنا سات سال کا کلام کتابی صورت میں شائع کیا اور اس کے بعد قریب قریب ہر سال کلام کا مجموعہ شائع ہوتا رہا۔ قوم کی اصلاح پر قلم چل چکا تھا۔ اپنے خیالات کو عوام تک پہنچانے کے لیے ۱۸۶۴ء میں ڈانڈیو (منادی) نامی ہفتہ وار پرچے کا اجرا کیا اور اس میں مزاحیہ مضامین لکھ لکھ کر ہند و سوسائٹی کی خرابیوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔

والد کی وفات کے بعد نرمد نے محلہ آملی ران۔ سورت میں اپنے مکان کے سامنے ایک خوبصورت بنگلہ تعمیر کرایا اور اس کا نام سرسوتی مندر رکھا۔ اس بنگلے میں علمی و ادبی مجالس منعقد ہوتی تھیں۔ یہی ان کا کتب خانہ تھا۔ اور یہی دفتر بھی۔ زمانہ عروج میں اس دفتر میں کئی کارکن بھی ملازم تھے۔

اس تعمیر میں نرمد کا کافی روپیہ خرچ ہو گیا۔ مکان کے مصارف بھی حدِ اعتدال سے متجاوز تھے۔ روزانہ روپیہ ڈیڑھ روپیہ تو فقط خاطر مدارات میں صرف ہو جاتا تھا۔ ادھر تصانیف کی فروخت کم ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں نرمد پر دس بارہ ہزار کا قرض ہو گیا۔

چند سال تو عزت میں گزار دیے لیکن آخر تنگ آکر ۱۸۷۶ء میں پھر بمبئی گئے، اور تھیٹروں کے لیے ڈرامے لکھنا شروع کیے۔ بمبئی میں بھی تنگ دستی کی یہ حد تھی کہ نرمد جیسے شاہی ٹھاٹ سے رہنے والے شخص کو بعض مرتبہ کھانا تک نصیب نہ ہوتا تھا۔ جب ڈراموں سے بھی کچھ کام چلتا نظر نہ آیا تو آخر کار بادل ناخواستہ اپنا عہد توڑا اور گوکل داس تیج پال چیرٹی فنڈ کے دفتر میں سو روپیہ ماہوار پر سکریٹری کی جگہ (جس کا انہی کے بہی خواہوں نے مخفی طور پر انتظام کر رکھا تھا) دوستوں کے اصرار پر قبول کر لی۔

۲۷ جنوری کو جب پہلے روز دفتر جانے کو تھے ان کے مکان پر عمداً چند دوست گئے اور نرمد کو تیاری کرتے دیکھ کر مسکرائے۔ نرمد نے اس وقت اپنے دوستوں سے پردرد لہجے میں کہا "ہنستے کیا ہو چوبیسویں سال عہد شکنی کروائی"۔ یہ کہتے ہوئے سر جھکائے زینہ سے اُتر گئے۔ اس ملازمت میں صرف ساڑھے تین سال گزرے ہوں گے کہ سخت علالت

کی وجہ سے سورت آنا پڑا۔ یہاں سات آٹھ ماہ بیماری کی تکلیفیں اٹھانے کے بعد ۱۸۸۶ء ۲۵ فروری کو داعئ اجل کو لبیک کہا۔

۱۹۳۳ء کی ۲۴ اگست کو بمقام سورت نرمد میموریل کمیٹی کے تحت میں ازروئے قدرشناسی و خدمات جلیلہ بہت اعلیٰ پیمانے پر صد سالہ برسی منائی گئی اور بطور یادگار سورت کے وکٹوریہ گارڈن میں نرمد کا مجسمہ نصب کیا گیا جس کو دیکھ کر ہر ہندو شرمندہ احسان ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نرمد کا مکان "سرسوتی مندر" بھی نرمد میموریل کمیٹی نے خرید لیا ہے۔

نرمد کی پانچ چھ تصانیف ہیں سے "نرم پدھ" "نرم گدھ" اور "نرم کوش" زیادہ قابل ذکر ہیں۔ "نرم پدھ" مجموعہ نظم ہے۔ یہ قومی نظموں، عشق و محبت، جذبات فطرت اور مناظر قدرت، کا بے بہا خزانہ ہے "نرم گدھ" حصہ نثر ہے اس میں علمی ادبی اصلاحی اور مزاحیہ مضامین ہیں۔ خطوط اور ڈرامے بھی اس میں شامل ہیں۔ "نرم کوش" ایک بے نظیر لغت اور ادب میں مایۂ ناز اضافہ ہے۔ جس کے لیے گجراتی ادب ہمیشہ مرہون منت رہے گا۔

نرمد کی چند خصوصیات

نرمد نسلاً برہمن تھے لیکن فطرتاً شتری تھے اپنی قوم کے ایک مایہ ناز سپاہی تھے۔ ایک نظم میں لکھتے ہیں "نرمد شیر سپاہی ہے" نرمد نے اس مصرع میں اپنی زندگی کا ایک پہلو پیش کر دیا ہے۔ ان کو پہلے سے سکھ چین کی زندگی سے نفرت تھی۔ کیونکہ ان کو دنیا ایک میدان کارزار نظر آتی تھی۔ ہر جگہ نرمد بہادر جواں ہمت اور جواں مردوں کو پکارتے نظر آتے تھے۔ ایک بہادر سپاہی کی طرح نرمد ہر کام میں اپنے قدم گاڑ دیتے تھے کہ پھر دنیا کی کوئی طاقت ان کے خیالات میں تذبذب پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ صدہا سال کی بدعتوں کو توڑنا آسان کام نہ تھا۔ ایک طرف تمام قوم اور دوسری طرف تنہا نرمد تھے۔ نرمد دشمنوں کی جس قدر کثرت دیکھتے تھے اسی قدر انھیں جوش آتا تھا۔

ملک پر غیر قوم کا تسلّط دیکھ کر نرمد جیسا مرد کب خاموش بیٹھ سکتا تھا۔ ایک بہادر سورما کی طرح شمشیر بکف میدان میں کھڑے ہو کر للکار رہے ہیں؛

"آہ! حکومت نے ہتھیار چھین لیے۔ تُف ہے ایسی زندگی پر"

نرمد کو خانگی زندگی میں بھی بے شمار مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ ۱۸۶۳ء سے دم واپسیں تک نرمد نے بڑی عسرت میں بسر کی۔ صدہا مواقع ایسے آئے کہ اچھے اچھوں کے بھی چھکے چھوٹ جاتے لیکن نرمد نے ہر وقت صبر و استقلال کے ساتھ بخندہ پیشانی ان مصیبتوں کا خیر مقدم کیا۔

حق گوئی اور بے باکی نرمد کے اوصاف حمیدہ میں سے تھے۔ ٹالسٹائے کی طرح نرمد بھی یہ کہنے کی جرأت کر سکتے تھے۔ Truth is the hero of my tale. نرمد کی زبان سے ہر وقت یہ سنا گیا: "سچ کہنے میں کیا خوف ہو سکتا ہے؟" ایک دفعہ بمبئی میں اُن کے ہمعصر حریف، شاعر "دلپت رام" کو دعوت طعام میں مدعو کیا۔ طعام سے فارغ ہونے کے بعد بہ سبیل تذکرہ نرمد نے دلپت رام سے ان کے کلام کی خصوصیات کے متعلق دریافت کیا دلپت رام نے جو کچھ کہا وہ نرمد کے گلے سے نہیں اترا۔ نرمد نے سب سن لینے کے بعد کہا "دلپت بھائی! آپ نے جو کچھ فرمایا اس میں سے تو ایک بھی چیز آپ کے کلام میں نہیں پاتا"۔

نرمد زندگی بھر سچ کہنے میں بے باک رہے۔ اپنے اخبار ڈانڈیہ (منادی) میں وہ کسی کی رو رعایت نہیں کرتے تھے۔ گورنمنٹ کے بڑے بڑے عہدیداروں پر بھی وہ بے باکانہ طریقہ پر ہاتھ صاف کرتے تھے۔ ایک وقت سورت کے ڈپٹی کلکٹر صاحب سے کسی بات پر چھڑ گئی۔ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو دب کر بیٹھ جاتا لیکن نرمد نے گوری چمڑی کے سب کس بل نکال دیے۔ لوگ اکثر کہتے تھے "کہ کوئی ٹوپ والوں سے بھی نہیں ڈرتا"۔

حق گوئی و بے باکی کی وجہ سے نرمد کو اکثر بڑے بڑے نقصانات برداشت کرنے پڑے لیکن نرمد نے نہ کبھی اپنی رَوِش کو چھوڑا نہ اصولوں کو۔ "نرم کوش" کو طبع کرانے کے لیے روپے کی بہت ضرورت تھی۔ جب سورت میں اس کا کوئی انتظام نہ ہو سکا تو بھاؤ نگر (کاٹھیاواڑ میں ایک ریاست ہے) کے ایک متمول شخص نے اس کا ذمہ لیا۔

نرم کوش بھاؤ نگر کے کسی چھاپے خانے کو دے دیا گیا تھا لیکن اسی دوران بھاؤ نگر کے ڈیسائی قوم کے خلاف ڈانڈیو میں نزمد کا ایک مضمون شائع ہوا۔ وہاں کے ڈیسائی بگڑ گئے۔ اور نرم کوش کی چھپائی کا کام رکوا دیا۔

نزمد عہد پر ثابت قدم رہنے کو جواں مردی تصور کرتے تھے۔ نزمد میں یہ صفت بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ اس کی وہ بڑی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ نزمد کا اصول تھا کہ جان جائے لیکن عزت نہ جائے لیکن آسمان ٹوٹے یا زمین پھٹے لیکن عہد نہ ٹوٹے۔ دل میں جو بات ٹھان لی پھر اس میں فرق نہ آئے۔ گھر بھر بیمار۔ سر پر قرض کا انبار۔ گھر کا تمام اثاثہ صرف ایک روپیہ وہ بھی کسی کے دکھ میں کام آگیا۔ لیکن تیس سال کا عہد کہ نوکری نہ کروں گا۔ نہ ٹوٹا۔ یہ دنیا کے کھیل ہیں۔ ہر آفت کو برداشت کرنا بہادری ہے۔

نزمد نے نرم کوش اپنے دوست "کرسنداس" کے نام معنون کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس زمانے میں نزمد بہت تنگدستی میں تھے۔ کرسنداس کا بھی خیال تھا کہ اس کی چھپائی کا خرچ وہ برداشت کریں گے۔ بدقسمتی سے شیر بازار سرد ہوا اور کرسنداس تباہ و برباد ہو گئے۔ نزمد کے دوستوں نے نزمد کو صلاح دی کہ "نرم کوش" کسی دوسرے شخص کے نام معنون کر دیں لیکن نزمد اپنی زبان بدلنے کو گناہ سمجھتے تھے۔ سب کو ایک ہی جواب دیتے: "میں اپنا خیال بدلنے سے قاصر ہوں"!

نزمد کی دریا دلی اور فیاضی کا ذکر نہ کیا جائے تو ان کے اوصاف حمیدہ میں خلا ہو جائے گا۔ آسودہ حالی میں تو شاہانہ تمکنت سے بسر ہوتی ہی تھی لیکن زمانۂ عسرت میں بھی فیاضی کا یہ عالم تھا تنگدستی اس وصف پر غالب نہ آسکی۔

ایک روز صبح کا وقت تھا جاڑے کی ابتدا تھی۔ سردی اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ نزمد چائے پی کر کشمیری شال اوڑھے دالان میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک استادِ موسیقی جا دھمکے۔ تعارف کے بعد استاد نے گانا شروع کیا۔ تھوڑی دیر گانا سننے کے بعد نزمد نے استاد کو ایک روپیہ دیا۔ اس روز گھر کی تمام دولت یہی ایک روپیہ تھی اور خدا معلوم کتنے روز اس ایک روپیہ پر بسر ہونے والے تھے۔ استاد ایک روپے سے سیر نہ ہوئے۔ کہنے لگے: کوی مہاراج میں

آپ کا نام نامی سن کر حاضر ہوا ہوں۔ آپ اور ایک روپیہ عنایت فرمائیں! یہ آپ کے شایانِ
شان نہیں اور نہ میں اس ایک روپے سے خوش ہو سکتا ہوں"
نرمد نے فوراً پچاس پچھتر روپے کی شال جو اوڑھے ہوئے تھے استاد کو نذر
کردی۔ اور استاد کو مایوس نہ جانے دیا۔

ایک روز صبح کو قریب نو بجے نرمد اپنے کام میں مشغول تھے کہ ایک ضعیف
کاٹھیاواڑی سفارشی خط لے کر آیا۔ نرمد نے مطلب معلوم کرلیا اور اپنے کارکن نربھے رام
کو بلایا اور کہا کہ اس شخص کے لیے ایک سو روپے کا انتظام کردو۔ نربھے رام اس بوڑھے کو اپنے
کمرے میں لے گئے اور اس سے تین چار روز کا وعدہ کیا۔ نربھے رام گھر میں پیسوں کو
دیکھتے ہیں تو صرف چھ سات روپے، وہ ہی دو تین روز کا خرچ کہیں سے قرض
ملنے کی امید نہیں، لہٰذا اس بوڑھے سے تین چار روز کا وعدہ کردیا۔

یہ بخشش اس وقت تک ہو رہی تھی کہ جب مکان میں کھانے کو بھی نہیں تھا
آخر تین چار روز میں چھ سات روپے ختم ہو گئے۔ اِدھر اس بوڑھے کے آنے کی فکر اُدھر
نرمد کا گزر کہیں باورچی خانے میں ہوا تو دیکھا کہ باورچی خانہ سرد پڑا ہے۔ نرمد نے نربھے رام
کو بلایا اور وجہ دریافت کی۔ نربھے رام نے کہا آج صرف چار آنے ہیں۔ نرمد نے یہ سنکر
بڑی خندہ پیشانی سے کہا" اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بازار جاؤ اور دودھ اور مرمرے
لے آؤ۔ آج اسی پر اکتفا کریں گے۔

اصلاحات

۱۸۵۵ء میں جو حالت مسلمانوں کی تھی ویسی ہی ہندوؤں کی بھی تھی۔ اس زمانے میں
گجرات پر جہالت کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ ہندو قوم مسلمانوں کی طرح رسم ورواج کی
زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ قوم پرستی مذہب کا جزو لاینفک بن چکی تھی۔ فرقہ بندی کی
آگ جگہ جگہ بھڑک رہی تھی اور انگریزوں کی غلامی کا طوق گردن میں پڑ چکا تھا۔ ایسے
زمانے میں ہندو قوم کے لیے ایک مصلح و مشیر کی ضرورت تھی اور یہ قرعۂ فال نرمد کے نام پڑا۔

زمانۂ طالب علمی ہی میں نرمد کے ہاتھوں اصلاحِ قوم کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ نرمد اپنے مقصد کی طرف غیر ارادی طور پر جا رہے تھے۔ جو انجمنیں نرمد نے صرف ناموری حاصل کرنے کے لیے قائم کی تھیں اور جو اخبار اپنی شہرت کی بنا پر جاری کیا تھا وہی آگے چل کر اصلاحِ قوم کے لیے زبردست آرگن ثابت ہوئے۔ نرمد کے دل میں پہلے صرف جذبات کا تلاطم ہی تھا لیکن جب مزاج میں استقلال پیدا ہوا اور طریقۂ کار سمجھ میں آگیا تو میدان عمل میں جا کودے۔ نرمد کے خلوص اور قوم سے ہمدردی کی وجہ سے نرمد کے بہت سے ہم خیال پیدا ہو گئے۔ اور یہی ان کا لشکر صف شکن تھا۔ جس کے بغیر شاید نرمد کبھی کامیاب نہ ہو سکتے تھے۔"

بمبئی میں بُدھی وَرْدھک سبھا کے کارپردازوں نے سماج و مذہب کی تخریب اور تعلیم کی اہمیت پر دھوئیں دار تقریریں کرنا شروع کیں۔ جن کے چرچے بمبئی سے نکل کر قرب و جوار میں بھی ہونے لگے اور لوگوں میں بہت دلچسپی پیدا ہونے لگی۔

قوم کی تمام خرابیوں میں سے یہاں تین خرابیاں زیادہ قابل ذکر ہیں۔ ہندو قوم بچپن کی شادی کو اپنا فرض سمجھتی اور بیوہ کا نکاح قوم و ملت کی بڑی ذلت سمجھتی تھی۔ لوگ اس قدر فرقہ پرست تھے کہ سماجی ضروریات میں سخت حرج پیدا ہوتا تھا۔ ایک دوسرے کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے اور انتہا یہ تھی کہ اسی کمتر کے ساتھ خورد و نوش بھی ٹھیک سمجھتے تھے۔ یہ عمل جاری تھا۔ نرمد نے ۱۸۵۶ء میں ڈاہی گوری نام کی ایک بیوہ سے عقدِ ثانی کر کے برہمنوں کو ایک تازیانہ مارا۔ اپنے گھر کی مستورات کو کمتر فرقے کے لوگوں کے ساتھ کھانے کھلوائے اور صدیوں سے جو رسم و رواج چلے آ رہے تھے ان کے خلاف جہاد کیا۔ ایک طرف عمل پر کاربند تھے تو دوسری طرف تقریروں کا سلسلہ جاری تھا۔ اِدھر اخبار "ڈانڈیو (منادی) میں رسم و رواج توہم پرستی، تعلیم نسواں پر مضامین لکھ کر لوگوں کے جذبات کو مشتعل کر رہے تھے۔ بڑے بڑے مہاراج اور مذہب کے ستون، جو ہندوؤں کے دیوتا اور مذہب کے محافظ بنے

بیٹھے تھے۔ اور قوم کی جہالت سے ناجائز فائدہ اٹھارہے تھے۔ انھیں سامنے رکھ کر ان کی بد اخلاقیوں کے راز فاش کیے۔ اس آگ کے شعلے اس قدر بلند ہوئے کہ ان سفید پوشوں کو عدالت کا منھ دیکھنا پڑا۔ جہاں روشن خیالوں نے ان کی بنی بنائی ساکھ بھی خاک میں ملادی۔

اگر بنظر عمیق دیکھا جائے تو نرمد کی یہ تمام کوششیں صرف اصلاح قوم کی تمہید تھیں۔ نرمد کی پچیس سال کی انتھک کوششوں کا نتیجہ خوشگوار آج تک نظر آرہا ہے۔ پہلے پہل نرمد قوم کی لعنت، ملامت کا شکار بنے۔ برہمنوں نے ان کے خاندان کے ساتھ مذہبی اور معاشرتی تمام تعلقات توڑ دیے۔ جس دعوت میں نرمد کے گھر والے شریک ہوتے اس دعوت میں سے قدامت پسند چلے جاتے۔ نرمد جس جگہ اور جس مکان میں بیٹھ کر قوم کی خرابیوں پر اظہار خیال کرتے وہ جگہ ان کے جانے کے بعد پاک کی جاتی تھی۔ ان تمام باتوں کے باوجود نرمد اپنے مقصد سے ذرا علیحدہ نہیں ہوئے اور اسی استقلال کی وجہ سے آخرکار بڑے بڑے دقیانوسی بھی نرمد کے زمرے میں داخل ہو گئے۔ پچیس سال کی کوششوں کے بعد بھی عمل کا فقدان تھا۔ اتنا ضرور ہوا کہ جو لوگ نرمد سے ایک لفظ سننے کو تیار نہیں تھے وہ نرمد کے اصلاحی مضامین شوق سے پڑھتے تھے۔ اپنے قومی جلسوں میں جوق درجوق آنے لگے اور نرمد کیا کہتے تھے۔ اس پر غور وخوض کرنے لگے۔ مرد اور عورت کے حقوق پر بحثیں ہونے لگیں۔ فرقہ بندیوں کی تلخیاں کم ہونے لگیں۔

نرمد اور نثر

گجراتی نثر میں نرمد کے رجحانات کا موازنہ و مقابلہ اگر اردو نثر میں سرسید کے رجحانات سے کیا جائے تو قریب قریب ایک ہی پائے جاتے ہیں۔ سرسید کی طرز تحریر سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے ان کی عبارتوں میں تصنع نہیں پایا جاتا۔ انھوں نے عام فہم الفاظ استعمال کر کے زبان کو آسان بنایا۔ ان کے خیالات لفظوں کی تراش خراش میں گم ہو گئے ان کی نثر خیالات کو صحیح طور پر پیش کرتی ہے۔ نرمد نے تشبیہوں اور استعاروں سے زیادہ کام نہیں لیا۔ اسی طرح نرمد بھی ایک طرزِ نو کے موجد ہیں۔ ان کی عبارتوں میں تصنع نہیں پایا جاتا۔ زبان کی سلاست ان کی نثر کی جان ہے۔ نثر میں عوام کی فہم و دانش کا بہت

خیال رکھتے تھے۔ نرمد نے الفاظ کو خیالات پر کبھی ترجیح نہیں دی۔

ابتدا کی نثر میں استعارے اور رنگینی پائی جاتی ہے لیکن جیسے جیسے نثر پختہ ہوتی گئی استعارے بھی کم ہوتے گئے۔ ابتدائی تحریروں میں مذکورہ بالا خصوصیات پائی جاتی ہیں لیکن بعد کی تحریروں اور تقریروں میں واعظانہ طرز جھلکتی ہے۔ ان کی نثر میں اوّل تا آخر اگر کوئی چیز قائم رہی تو وہ جوش وخروش ہے۔ ابتدا میں گنجلک بھی پائی جاتی تھی لیکن یہ عیب بہت جلد نکل گیا۔

نرمد کے قلم سے شاید ہی کوئی موضوع بچ سکا ہوگا۔ ان کا قلم سوانح حیات، مذہب، قوم، اصلاح۔ علم وادب، تاریخ۔ سیاست۔ معاشرت۔ ظرافت۔ غرضیکہ ہرایک پر برابر چلا ہے۔ ان کے نرم گدھ (نثر) میں جو مضامین ہیں ان میں سے چند ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

گجرات اور گجراتی۔ گجرات کی عورتیں۔ وطنیت۔ شجاعت گجرات کی عزّت، مشاہیر عالم کے نام، مذہب کے محافظوں کا مذہب، تعلیم نسواں۔ شکوہ بیوہ۔ گجراتی زبان۔ ادب۔ شاعری۔ اسی میں چند خطوط اور ڈرامے بھی ہیں۔ ڈرامے بہت سطحی ہیں۔

نرمد کی نثر عوام میں بہت مقبول ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نرمد کی نثر آسان اور عام فہم ہے۔ اس میں خلوص و محبّت پائے جاتے ہیں۔ ان کی نثر کے موضوع یا اصلاح قوم کے گرم مسائل ہوتے تھے۔ یا علمی تحقیقات یا کسی کے کچّے چٹھے۔ المختصر جدید طرز میں جدید خیالات عوام کی دل کشی کا سامان تھے۔ خاص وعام نرمد کے مضامین نہایت شوق سے پڑھتے تھے۔ اور آئندہ تصانیف واشاعتوں کے بہت بے چینی سے منتظر رہتے تھے۔

نرمد اور ادب

نرمد کی ادبی خدمات قومی اور ملکی خدمات سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ نرمد سے پہلے لوگ شاعری سے بے بہرہ تھے۔ نثر میں بھی چند کتابیں دستیاب ہوسکتی تھیں گجراتی میں ڈراما جیسی کوئی چیز نہیں تھی۔ تاریخ میں چند اوراق پارینہ پائے جاتے تھے۔ لیکن نرمد

نے ان تمام پر خامہ فرسائی کر کے ادب، بی، ہالیڈے، دی۔ الغرض نرمد کی نظم و نثر کے آغاز
سے گجراتی ادب میں ایک نیا دور آیا اور ان کے انوکھے اسلوب بیان اور قومی نظموں
نے ادب کو مالا مال کر دیا۔ ۱۸۵۵ء سے قبل گجراتی ادب کا وہی حال تھا جو اردو ادب
کا تھا۔ ادق زبان ادبی شان سمجھی جاتی تھی۔ اور سنسکرت الفاظ کی بھرمار ادبیت کا کمال
سمجھا جاتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت تک گجراتی زبان کے پاس الفاظ کا بھی پورا
سرمایہ نہیں تھا۔ اور یہ مسئلہ نرمد ہی نے حل کیا۔ نرمد کی دوربیں آنکھوں نے یہ معلوم
کر لیا کہ مروجہ اسلوب بیان زبان کی ترقی واشاعت کا سدِ باب ہے۔ زبان کبھی پھل
پھول نہیں سکتی۔ نیز اس کے ذریعہ سے خیالات کو عوام تک پہنچانا مشکل ہے لہذا زبان کو
آسان بنانے کی کوشش شروع کی۔ خود لکھتے ہیں۔ "زبان وہ اچھی جو جیسی بولی جائے
ویسی لکھی جائے"۔ نرمد نے انگریزی زبان سے ترقی کا گُر معلوم کر لیا۔ خود لکھتے ہیں "انگریزی
زبان جو آج مکمل زبان کہلاتی ہے۔ کئی زبانوں سے بنی ہوئی ہے اور ہماری گجراتی کو بھی پایہ
تکمیل کو پہنچنے کے لیے دوسری زبانوں کی مدد کی سخت ضرورت ہے"۔ نرمد سب سے بڑی
مدد جو دوسری زبانوں سے چاہتے تھے وہ الفاظ کی تھی۔ لکھتے ہیں: "جب ہماری نظر
ادب پر پڑتی ہے۔ تو افسوس ہوتا ہے کہ خیالات کو ادا کرنے کے لیے ابھی الفاظ بھی نہیں ہیں
اس لیے ہم کو لازم ہے کہ ہم خیالات کی مناسبت میں الفاظ پسند کریں خواہ وہ سنسکرت
ہوں، فارسی ہوں یا انگریزی"۔ نرمد نے زبان میں سوز و گداز اور شستگی پیدا کرنے کے
لیے فارسی زبان سے خاص کام لیا۔ نرمد نے فارسی کی چند درسی کتابیں پڑھی تھیں۔
وہ اس سے اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ نظم و نثر میں زیب بغل، عشق، عاشق معشوق
خدا، دعا، محبوب، جنگ، آزار، عبارت، خاک، انبار وغیرہ صدہا الفاظ بے تکلف استعمال
کیے ہیں۔ نرمد نے پہلے اس طرح زبان کو سلیس بنا دیا، پھر لوگوں کو نثر کی طرف رغبت
دلائی کہ وہ ہر شعبے میں کتابیں لکھتے چلے جائیں اور گجراتی کی قواعد وغیرہ بعد میں بنائی جائے
نرمد سے پہلے گجراتی شاعری کا انحصار صرف تین موضوعات تعلیم، مذہب اور
اخلاق پر تھا لیکن نرمد نے اس صنف میں عشق و محبت کی داستانیں اور قومی نظمیں لکھ کر

نئی نئی راہیں کھول دیں. عشق و محبت کی داستانیں قلمبند کرنے کے لیے زبان بھی ویسی ہی لطیف ہونی چاہیے تھی. لہٰذا اردو فارسی الفاظ استعمال کر کے سوز و گداز پیدا ضرور کیا لیکن اسوقت پورے کمال کو نہیں پہنچ سکی. اسوقت گجراتی زبان میں غزلیں لکھی جاتی ہیں جو واقعی کسی قابل ہیں. اس خدمت کا اعزاز جناب سید عظیم الدین صاحب منادی "مدیر مسلم" گجرات (ایک ہفتہ وار گجراتی پرچہ) کو حاصل ہے. یہ گجراتی ادب کے ماہر ہیں اور گجراتی ادب میں ان کا ایک علیحدہ اسکول ہے. ان کے ہم خیال ادیبوں کا سب سے بڑا اصول — گجراتی زبان میں اردو الفاظ کو رواج دینا اور ان کو اس زبان میں صحیح ادا کرنا ہے. زبدنے آزادی. حب وطن اور شجاعت پر نظمیں لکھ کر زبان کو اس قابل بنادیا کہ وہ دوسری زبانوں کے مقابلہ میں رکھی جاسکے. اور جن کے مطالعہ سے ہمارے دلوں میں جذبات کا ایک تلاطم برپا ہو جاتا ہے.

زبد کی سب سے زیادہ قابل قدر ادب کی خدمت ان کا "نرم کوش" ہے. یہ لغت گجراتی ادب میں ایک بے بہا خزانہ ہے جو ادب میں زبد کا نام زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے

زبد کی ادبی قومی اور ملکی خدمات کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ زبد آسمان ادب کے آفتاب، ہندؤں کے حالی اور ملک کے غازی تھے. زبدنے گلشن ادب سے خس و خاشاک کو صاف کر کے اُسے سرسبز، شاداب کیا نثر میں ایک طرز نو اور شاعری میں قومی نغموں کی داغ بیل ڈالنے کا سہرا انھیں کے سر ہے.

حالی کی طرح زبدنے اپنی قوم کے شانے ہلا ہلا کر خواب غفلت سے بیدار کیا. ہندو مذہب و ملت پیوند خاک ہو رہے تھے. تعصب نے ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیے تھے. لوگ اپنے اسلاف کے کارناموں سے دل کو بھلا چکے تھے. ایسے وقت میں پستی سے اُبھارنے کے لیے ایک مصلح و مشیر کی ضرورت تھی. اور یہ ذمّہ داری زبدنے اپنے اوڑلی.

جب حکومت کی باگ ڈور غیر قوم کے ہاتھوں میں جا پڑی. ملک کی جاہ و ثروت اور شان و شوکت کا خاتمہ ہو گیا اور ستارۂ اقبال گردش میں آگیا تو قانونِ قدرت کے مطابق لوگوں کی عقلیں زائل ہو گئیں. ذہنیتیں پست ہو چلیں اور غلامی آزادی کی انتہا نظر آنے لگی. اس وقت زبد ملکیوں کی غیرت کو حرکت میں لائے. ماضی کا ماتم کیا لیکن آخر میں

امید بھی دلائی راہ بتلائی اور حوصلہ افزائی کی۔ یہ واضح رہے کہ نرمد آزادی کے پرستار تھے۔ ان کو انگریز قوم سے کوئی پرخاش اور تعصب نہیں تھا کیونکہ یہی نرمد ایک طرف غیر قوم کی حکومت سے آزاد ہونا چاہتے تھے۔ اور دوسری طرف یورپ کی خوبیوں سے فائدہ اٹھانے کی تلقین کرتے تھے۔

نرمد کی تیس سال کی کاوشوں کے نتیجوں پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں۔ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نرمد نے قید فرنگ اور قید برہمن سے آزاد ہونے کی صرف تمہید شروع کی تھی۔ نرمد نے اپنے خون سے سینچ سینچ کر جو نہالِ آزادی سرسبز کیا وہ پچاس سال کے بعد ثمر لایا اور قوم کے لیے نرمد کی چیخ پکار اگر سنی گئی تو پچاس سال کے بعد نرمد کو اپنی محنت کے نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی امید نہیں تھی۔ اور نہ ان کی یہ خواہش تھی کہ قوم و ملک بے موقع و محل حکومت کے خلاف آزادی کی جنگ چھیڑ کر خود کو تباہ و برباد کر دے۔ ہر وقت وہ یہ کہتے تھے کہ موقع کے منتظر رہو اور یہی ان کی دانشمندی تھی۔ اصلاحِ قوم کی انتھک کوششوں کے نتائج آج نظر آتے ہیں۔ بیوہ کے نکاح کو روشن خیال طبقہ آج رواج دے رہا ہے۔ آج اچھوت کے ساتھ مساوات پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ آج ملک غلامی کی زنجیریں کھڑکھڑا رہا ہے۔ نرمد نے جو کچھ کیا وہ ایک جملے میں اس طرح ادا ہو سکتا ہے "mistief thou was afoot" اور شرارت تو عمل میں آئی۔ ہندو قوم نے نرمد کے مفید مجوزہ خیالات کو محفوظ رکھا اور ان کی نسلوں نے اس پر عمل کیا۔ بنظرِ غائر دیکھا جائے تو نرمد کے خیالات کو گاندھی جی نے عملی جامہ پہنایا۔ اپنی قوم کو آزادی کی طرف مائل کیا۔

ہمیں یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ نرمد جیسا حبِ وطن کا دیوانہ شمع آزادی کا پروانہ اور قوم کا فرزانہ صرف گجرات ہی سے وابستہ رہا۔ گجرات ہی اس کا میدان عمل تھا جو تمام لوگوں کا کردار بن سکتا تھا۔

نرمد اور شاعری

نرمد کے کلام کو اگر شاعری کے اُصولوں پر جانچا جائے تو شاید وہ پورا نہ اُترے۔ کلام میں فنی اعتبار سے شاعرانہ لغزشیں ضرور پائی جاتی ہیں تاہم نرمد شاعروں کی صفِ اوّل میں

ٹھلائے جاتے ہیں۔ زند نے خیالات کو زبان پر ترجیح دی اور اسی لیے زند کی شاعری ان کے جذبات کا صحیح مرقع ہے۔ اگر زند کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک طرف یارانِ بزم ہیں ساغر و مینا سے کھیل رہے ہیں۔ کہیں محبوب کے سامنے کلیجہ تھامے کھڑے ہوئے ہیں، تو دوسری طرف میدانِ رزم میں آزادی کا پرچم لہرا رہے ہیں کہیں سپاہی کی صف میں کھڑے ہیں تو کہیں سرداری کی حیثیت سے فرضِ سرداری انجام دے رہے ہیں۔ غرضکہ زند اپنے پہلو میں دل لائے تھے اور اُس دل میں محبّت کا سمندر اُمنڈ رہا تھا اور یہ محبت کہیں حسن و عشق شمع و پروانہ بن کر جلوہ گر ہوئی تو کہیں اس نے وطنیت اور اصلاحِ قوم و ملّت کی صورت اختیار کرلی اور جب ملک و قوم کی محبت کی آگ کے شعلے بلند ہوئے تو اس میں سے آزادی کے شرارے نکلے۔ لہٰذا زند کی شاعری کے دو پہلو ہیں ایک محبت اور دُوسرا شجاعت اور خود زند نے اپنی شاعری کو پریم اور شوریہ (محبّت اور شجاعت) سے تعبیر کیا ہے۔ اسی (پریم اور شوریہ) محبت اور شجاعت کی بدولت زند کا نام گجراتی ادب میں زندہ ہے۔

زند کا میدانِ فکر بہت وسیع تھا، محبت، شجاعت، وطنیت، مناظرِ قدرت وغیرہ ان کی جولانگاہیں تھیں، یہاں چند نظموں کے عنوانات درج کیے دیتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ ہر عنوان محبّت اور شجاعت پر مبنی ہے۔

محبت: پریم کی بانسری۔ موہنی۔ میں ہاری۔ مجھ کو کیا چھوڑ دیگا؟ دلدار کو سلام وغیرہ۔

شجاعت و وطنیت: بہادر کہاں ہیں؟ بہادر۔ حیف اس غلامی پر رونے سے کیا فائدہ حق طلب کرو۔ چلو بھیّا۔ قدم بڑھاؤ۔ نہیں ہٹنا۔ چلو چلو۔ کیا دیر لگاتے ہو۔ محبّت سے محبت ہے۔

اصلاح قوم و مذہب: تو ہمات کا کوٹ۔ دنیا بھوتوں کی۔ اندھیر۔ شکوۂ بیوہ۔ ہری کی جُستجو۔ ذرّے ذرّے میں تو رام۔ نیّا پار اتار وغیرہ۔

مناظرِ قدرت: برسات۔ چندا۔ جنگل۔ کبیر وڑ۔ مدگھرا۔ باراماسا وغیرہ۔

زند نے جہاں حسن و محبّت میں قلبی واردات قلم بند کیے ہیں وہاں وہ کچھ کچھ اردو غزل کے قریب نظر آتے ہیں۔ ان کے اس حصّہ کلام کی خصوصیات درد اور سوز و گداز ہیں۔ ایک،

جگہ خود لکھتے ہیں: "اے مکو د! اگر تو شعر کہے تو اس میں اپنا دردِ دل نمایاں کر۔"

زمد نے عشق و محبت میں جو مشاہدات و محسوسات پیش کیے ہیں وہ حقیقت پر مبنی ہیں۔ زمد ابتدا سے سچی محبت کی تلاش میں تھے اور محبت میں ہی وہ سکھ چین دیکھتے تھے۔ خود لکھتے ہیں: "زندگی میں میری سب سے بڑی کوشش سچی محبت کی تلاش رہی اور میں ایسا خیال کرتا ہوں کہ محبت کے لیے عورت موزوں ہے اور اگر اپنی بیوی سے محبت کی جائے تو اس سے بہتر اور موزوں کوئی نہیں ہوسکتا۔ ۔ ۔ ۔ اور اسی لیے میں حلقۂ احباب کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اور ہر وقت کوشش کرتا تھا کہ دوستوں میں باہم محبت بڑھے۔"

زمد کی شاعری کا دوسرا پہلو شجاعت ہے۔ ان کی قومی نظموں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمد نے ماحول کی ترجمانی کی ہے۔ حالی و اکبر کی طرح زمد بھی ماحول سے بہت متاثر ہوئے۔ ابھی زمد کے کانوں میں ۱۸۵۷ء کا شورِ محشر گونج رہا تھا۔ ان کی آنکھوں نے سورت کے نواب کا تخت اجڑتے دیکھا تھا۔ قوم کی ہمت پست ہوتی جارہی تھی۔ ہندوؤں کے تنزل کا منظر آنکھوں میں پھر رہا تھا۔ مذہب کی درگت بن رہی تھی اور سب سے زیادہ غیرت دلانے والی چیز قوم کی اطاعت تھی۔ ان تمام باتوں کو دیکھ کر زمد جیسا غیرت مند شخص کب خاموش رہ سکتا تھا! زمد کے جذبات کا دریا موج زن ہوا تو وہ بے ساختہ پکار اٹھے۔

"افسوس حکومت نے ہم سے ہتھیار چھین لیے۔ تف ہے ایسی زندگی پر۔"

حالی کی طرح زمد نے ماضی کا ماتم کیا اور لوگوں کو غیرت دلائی۔ سورت کی جاہ و ثروت اور شان و شوکت پر آنسو بہائے۔ اس نظم کا مطلع ہے۔

"اے سورت سونے کی مورت تیری کیا حالت ہوگئی۔ سورت کی بے رونق
صورت اور بری حالت ہنستے ہنستے ردی رونی ہوگئی۔ کل کندن میں تیری
نشست تھی اور تو چمک رہی تھی آج ماند پڑ گئی۔"

اسی طرح "ہندوؤں کا تنزل" ایک طویل نظم لکھی جس میں ہندو قوم کی ترقی کا مرقعہ کھینچا ہے۔ اور تنزل کے اسباب بیان کیے ہیں۔ آخر اس آشا (امید) کی سرخی کی تحت میں

چند شعر لکھے ہیں۔ جس میں تلقین کی ہے اور اچھے دلوں کی امید دلائی ہے۔ یہ نظم گجراتی ادب میں ہندؤں کے لیے مسدّس حالی کے برابر ہے۔ اس نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

"جیسے جیسے صنعت، وحرفت ترقی کریں گے وطن میں دولت بڑھے گی اور وطن کے لوگ سکھ سے رہیں گے۔"

"علم کا طالب رہنا اچھی صحبت سے مستفید ہونا یہ ترقی کا زینہ ہے اور اسی میں سکھ چین ہے۔"

"بچپن میں شادی نہ ہو اور شادی ہو تو سو لمبُر سے ہو۔ دانشمند عورتیں اپنے بچّہ کی اچھی تربیت کر سکیں گی۔"

"جیسے جیسے فرقہ بندی ٹوٹے گی تو لوگ آپس میں مل جل کر دعوتوں میں شریک ہونگے اور جس قدر میل ملاپ بڑھے گا اتنا ہی لوگوں میں اتّفاق و اتّحاد قائم رہے گا۔"

نرمد کا نصب العین آزادی تھا پھر وہ ملکی یا قومی آزادی قید فرنگ سے ہو یا قید برہمن سے۔ نرمد بچپن سے آزادی کے دلدادہ اور غلامی سے متنفر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ملازمت کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ اپنی ایک نظم میں آزادی کے متعلّق اظہار خیال اس طرح کرتے ہیں۔

"انسانی حقوق تو ان گنت ہیں لیکن آزادی انسان کا سب سے بڑا حق ہے اس میں کوئی شک نہیں۔"

نرمد کا زمانہ وہ تھا کہ سنہ ۱۸۵۷ء کے سیلاب نے لوگوں کو پست ہمّت اور ڈرپوک بنا دیا تھا۔ ان کی بلند ہمتی کا خون ہو چکا تھا ان کی حق تلفی ہو رہی تھی لیکن زبان سے ایک لفظ نہ نکلتا تھا۔ وہ اپنی ہتک گوارا کرتے تھے۔ یہ دیکھ کر نرمد کو کہنا پڑا۔

"سب اٹھ بیٹھو بستر خواب غفلت جلد چھوڑدو۔ آدمی ہو کر جو اپنا حق نہ سمجھے وہ جانور ہے۔ جانور بھی اپنے ظالم سے کیسا انتقام لیتا ہے۔"

ایک اور جگہ اس طرح غیرت دلائی ہے۔

"زبوں فطرت غلام دنیا میں لعنت کا مستحق ہے جو زخم کھاتا ہے خلقِ خدا اس

کی عزت کرتی ہے۔"

اس زمانہ میں لوگوں کی آنکھیں امن وسکون ڈھونڈھ رہی تھیں۔ اور مصیبتوں سے بچنے کے لیے پناہ کی متلاشی تھیں لیکن پناہ بھی تو درندے کے غار میں۔ انگریز کی حکومت ان کو آزادی کا منتہا نظر آنے لگی۔ نرمد کے ایک ہمعصر شاعر کوی دلپت رام انگریز کی حکومت اور انصاف کے گن گاتے تھے کہ انگریز کی حکومت میں کسی شخص کی مجال نہیں کہ راستہ چلتی بکری کا کان تک پکڑ سکے۔ لیکن نرمد کو ہر طرف جبر واستبداد نظر آتا تھا، انھوں نے اصل راز کو پالیا۔ ان کو آزادی کا خواب سراب نظر آتا تھا۔ وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے۔

"نرمد کہہ رہا ہے اے شاعر بھائیو! سب مل کر حب الوطنی کے جذبات ابھارو۔"

اور آزادی کے گیت گا کر دیس میں شجاعت اور وطن کی خدمت کا احساس پیدا کرو۔"

نرمد نے ملک وقوم کو خواب غفلت سے بیدار کیا انکی کمزوریوں کو طشت ازبام کیا ان کو ہمت دلائی، اور آزادی کی طرف مائل کیا اور اس کے بعد حصولِ آزادی کے لیے شجاعت وبہادری پر نظمیں لکھ کر لوگوں کو گرمادیا اور میدانِ کارزار کا نقشہ بھی کھینچ دیا۔

نرمد قدرت کے عاشق تھے نرمد نے مناظرِ قدرت کی عریاں تصویریں کھینچی ہیں جن سے ان کے مشاہدات کا پتہ چلتا ہے اس کاروباری دنیا سے جب کبھی جی گھبراتا تو قدرت سے دل بہلاتے اور اپنا غم غلط کرتے تھے لکھتے ہیں:۔

قدرت سے میرا یارانہ ہے۔ اس سے میرا بہت لین دین ہے۔ قدرت میری معشوق ہے اور اس سے مجھے سکھ ملتا ہے۔"

جب دنیا سے بہت گھبرا جاتا ہوں تو تنہائی میں جاکر بیٹھ جاتا ہوں۔" قدرت کے مطالعہ میں غرق ہوجاتا ہوں اور تمام دکھ بھول جاتا ہوں۔"

نرمد کے زمانہ میں ورڈزورتھ، شیلے بائرن جیسے شاعر قدرت کی پرستش کر رہے تھے۔ نرمد نے بھی ان سے روحانی فیض حاصل کیا۔ اور گجراتی ادب میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ نرمد کی نظم "جنگل" اور "کبیر وڈ" شہ پارے ہیں۔ نرمد نے قدرت کو جس انداز میں پایا اسی انداز میں پیش کردیا۔ ان تمام نظموں میں اس قدر جاذبیت ہے کہ پڑھنے والا بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے۔" کس

قدر سلیس اور پراثر ہیں۔"

زند نے چند انگریزی نظموں کا ترجمہ بھی کیا ہے لیکن وہ معمولی ترجمہ ہے۔
We are seven   Lucy Grey کو انھوں نے للیتا نام دیا ہے
کو وجی Quality of mercy کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ ان سب ترجموں میں کوئی خاص خوبی نہیں پائی جاتی۔

زند ایک پکّے محبّ وطن تھے وہ صرف وطن کے گلی کوچوں اور باغ و بازار سے ہی محبت نہیں کرتے تھے۔ وہ وطنیوں کو خوش دیکھ کر بھی خوش ہوتے تھے اور ان کو دکھ میں دیکھ کر خود بھی تکلیف محسوس کرتے تھے۔ ایک نظم میں لکھتے ہیں۔

"وطن بہت بڑی مصیبت میں مبتلا ہے اُسے دیکھ کر زند کا دل جلتا ہے۔
پردیسی کو دیس میں سکھی دیکھ کر زند کا دل دکھتا ہے۔"

زند کو اپنے ملک پر بہت فخر تھا۔ گجراتی ادب کو لفظ "سو دلیتا بھیان" (ملکی فخر) سے منسوب کیا کرتے تھے۔ زند کے کلام میں "سورت"، جیہ جیہ گروی گجرات" "کسکی ہے گجرات" اور حبّ وطن کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔

شہر برہانپور کی علمی وادبی قدروں کا جائزہ

برہانپور عہد قدیم میں سلاطین فاروقیہ، مغلیہ اور آصفیہ کے جاہ وسطوت اور شان وشوکت کا ایک مثالی شہر تھا۔ اس شہر کو سیاسی، تہذیبی، علمی، ادبی نقطۂ نظر سے اہمیت حاصل تھی۔ اس کو کلید دکن کہا جاتا تھا۔ دولت کی فراوانی اور عیش وعشرت کی سروسامانی کی وجہ سے شاہجہاں نے اپنی فتح دکن کا جشن بہاراں برہانپور میں منایا تھا اور اس کو دارالسرور نام دیا تھا۔ یہ شہر نفوش قدسیہ کا ملجا وماوی تھا۔ اس کو عالموں ادیبوں، شاعروں کے اہم مرکز ہونے کا فخر حاصل ہے۔ نامی گرامی مدرسوں سے اس شہر کی عزت ووقعت دہ چند تھی۔ اس شہر کو لوگوں نے مختلف عینکوں سے دیکھا ہے۔ کسی نے اس کو باغوں کا شہر کہا ہے۔ شاہی باغات اور امرائیاں اسی شہر میں تھیں۔ اگر فصلوں کی کیفیت وکمیت میں فرق آجاتا تو اورنگ زیب بازپرس کرتا تھا۔ کپڑوں کی کئی نادر قسمیں یہاں کی خصوصیت تھیں۔ موجودہ دور میں بھی کپڑے کی صنعت کے لیے برہانپور کو اہمیت حاصل ہے۔ اِس شہر کے آثار قدیمہ میں سلاطین فاروقیہ کے مقبرے، شاہ نواز خاں اور بیگم شجاع کے مقبرے، شہزادگان کے محلات آہوخانہ، راجہ جسونت سنگھ کا محل، محل گل آرا، حمام، مساجد، خانقاہیں، سرائیں وغیرہ

وہ لوٹی ہوئی طنابیں اور خاک کے ڈھیر ہیں جو اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ جہاں سے کئی قافلے گذر چکے ہیں جن کی خزاں سے ان کی بہار کا تصوّر دل کو ہلا دیتا ہے۔

۱۹۴۰ یا ۴۱ میں مرحوم احسان دانش برہانپور تشریف لائے تھے۔ انھوں نے کھنڈرات کو دیکھ کر کہا تھا "آج یہ حکمراں قبروں میں ابدی نیند سو رہے ہیں لیکن آج بھی ان کے جاہ و جلال کا سکّہ ہمارے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے"۔

فاروقیوں کے مقبروں کے گنبد صنعت کاروں کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ شاہنواز خاں عبدالرحیم خان خاناں کا بیٹا ہے۔ شہزادوں کے محلات زین آباد میں واقع تھے آہو خانہ بھی زین آباد میں ہے۔ گجرات کے ایک سلطان نے بھی ایک آہو خانہ بنوایا تھا۔ شہر میں دو تین حمام تو اس وقت بھی موجود ہیں۔ ایک حمام قلعہ ارک سے متصل ہے۔ اس میں تین درّے ہیں۔ ان میں پچی کاری باقی ہے۔ حوض اور فوّارے بھی اصلی حالت میں ہیں۔ تاہم قدیم شان کا صرف تصوّر ہی ہو سکتا ہے۔ بے شمار مسجدیں ہیں۔ ان میں جامع مسجد، بی بی کی مسجد، کالی مسجد، مقبرہ فاروقیوں کی یادگار ہیں۔ جامع مسجد کو کالی مسجد بھی کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہ کالے سنگِ موسیٰ سے تعمیر کی گئی ہے۔ یہ مسجد فاروقی سلطان عینا عادل شاہ نے ۱۵۸۳ء میں تعمیر کرائی تھی۔ اس کا جماعت خانہ ۱۶۰ فٹ طول میں اور عرض میں ۶۰ فٹ ہے۔ اندر تقریباً ۱۵۰۰ آدمی نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اسی طرح اس کا صحن بھی وسیع ہے۔ جہاں ہزاروں آدمی ایک ساتھ نماز پڑھ سکتے ہیں۔ شہر میں جہانگیری سرا ہے۔ اور اکبری سرائے کے نام سے دو سرائیں بھی ہیں۔ اکبری سرائے عبدالرحیم خان خاناں نے تعمیر کرائی تھی۔ شاہ نواز خاں عبدالرحیم خان خاناں کا بیٹا تھا۔ اس کا مقبرہ بھی مغل تہذیب کا ایک نمونہ ہے۔ اس شہر کی سیاسی و تہذیبی اہمیت اتنی تھی کہ اہم شخصیتوں، سیاحوں وغیرہ کے شرفِ نزول کا فخر اس کو حاصل ہے

سنہ ۱۴۰۶ء میں خاندیس کے حکمراں نصیر خاں نے اپنے مرشد حضرت زین الدین کی خواہش پر زین آباد تاپی ندی کے ایک کنارے پر اور دوسرے پر برہانپور ایسے دو شہر آباد کیے تھے۔ زین الدین کے مرشد حضرت برہان الدین غریب

جب اپنے مرشد سلطان الاولیا حضرت نظام الدینؒ کے حکم پر صوفیا کے ہمراہ دکن جا رہے تھے لوتالی کے کنارے پر قیام کیا تھا اور دعا مانگی تھی کہ یہاں ایک پرفضا شہر آباد ہو۔ اسی کے پیش نظر زین الدین نے نصیر خاں سے شہر آباد کرنے کے لیے فرمایا تھا۔

۱۴۰۶ تا ۱۶۰۱ء والیان خاندیس فاروقیوں کے قبض و تصرف میں رہا۔ ۱۶۰۱ میں اکبر نے آسیر اور برہان پور کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد نظام، مرہٹوں اور انگریزوں کی عملداری رہی۔

برہانپور اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے مقناطیسی کشش رکھتا تھا۔ علماء، صوفیا، شعرا، ادبا اور اہل فن و کمال یہاں کھنچے چلے آتے تھے۔ برہانپور علم و ادب میں خاص مقام رکھتا تھا علوم و فنون کا مرکز ہونے کے علاوہ برہانپور روحانی فیوض کا بھی سرچشمہ رہا ہے۔ یہ نفوسِ قدسیہ علم کے سمندر تھے۔ برہانپور کے بعض صوفی علماء کے رشحاتِ قلم عالم اسلام میں آپ اپنی نظیر ہیں۔

تفسیر و حدیث کے جن بے نظیر کارناموں پر علمائے اسلام نے مہرِ تصدیق ثبت کی ہے ان میں علم حدیث سے تعلق رکھنے والی کتاب کنزالاعمال ہے۔ اس کے مصنف شیخ علی متقی برہانپوری ہیں۔ شیخ علی کی یہ تصنیف ادارہ دائرۃ المعارف سے چھپ چکی ہے[1]۔ موصوف کی ایک تصنیف جامع الکلم ہے۔ اس کتاب کا اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے[2]۔ مذکورہ کتاب علم اخلاق سے تعلق رکھتی ہے۔ آپ کی کتابیں عربی زبان میں ہیں۔ ان کے علاوہ فارسی میں ایک تصنیف شیخ عبدالقادر جیلانی کے حالات سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ ادارۂ ادبیات میں محفوظ ہے[3]۔ شیخ علی تقریباً ایک سو کتابوں کے مصنف ہیں۔

شیخ علی متقی کے بزرگوں کا اصل وطن جونپور تھا۔ یہ خاندان برہانپور اٹھ آیا تھا

---

[1] [2] سلک گہر از جاوید انصاری [3] فہرست ادارۂ ادبیات

شیخ علی برہانپور میں پیدا ہوئے تھے۔ آٹھ سال کی عمر میں ان کو شاہ باجن کے سامنے بٹھلا دیا گیا تھا۔ آپ نے ایک مدت تک مکہ میں درس حدیث دیا اور مکہ ہی میں وفات پائی۔ "شیخ مکہ" سے تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے۔ موصوف نے ۹۷۵ھ میں وفات پائی شیخ علی کے فرزند شیخ عبدالوہاب متقی نے بھی علم حدیث کے سلسلہ میں قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔

شیخ علی متقی کے تربیت یافتہ مولانا طاہر یوسف کی تصنیف تفسیر میں مجمع البحار چند نادر کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ حضرت طاہر پٹنی کو تیس ہزار حدیثیں یاد تھیں۔ موصوف کی قابل قدر ایک اور خدمت یہ ہے کہ موصوف نے گجرات میں تبلیغ اسلام کا کام کیا۔ ان کے معتقدین کی جماعت پٹنی جماعت کہلاتی ہے جس کے بیشتر افراد بڑے تاجر ہیں۔ ہر پٹنی کے خاندان میں چند افراد موجود ہیں۔ ایک بزرگ سے ملاقات کا شرف راقم کو بھی حاصل ہے۔

برہانپور کی دوسری غیر معمولی شخصیت حضرت عیسٰی جند اللہ ہیں۔ موصوف سے کئی کتابیں یادگار ہیں۔ ان میں سے تتمیم شرح مائۃ عامل، عربی نحو سے تعلق رکھتی ہے دوسری غیر معمولی تصنیف تفسیر انوار الاسرار ہے[1]

شاہ صاحب خاندان کا اصل وطن سندھ تھا۔ ہمایوں دور میں خاندان ایلیچ پور اٹھ آیا اور وہاں خلفشار برپا ہونے کی وجہ سے برہانپور آکر مستقل اقامت اختیار کر لی تھی شاہ جند اللہ کے چچا مولانا طاہر یوسف محدث خاندان کے افراد کو برہانپور لے آئے تھے۔ عبدالرحیم خان خاناں شاہ جند اللہ کا معتقد تھا۔ آپ کے مدرسہ اور ہاسٹل کا خرچہ وہی برداشت کرتا تھا۔ شاہ عیسٰی جند اللہ کی حیات و خدمات پر ڈاکٹر شیخ فریدی کی تصنیف موجود ہے۔ شاہ عیسٰی کا انتقال ۱۰۳۱ھ میں ہوا۔

عربی میں ایک شاہکار تفسیر کی کتاب حضرت جلال الدین اللہ دالے کے فرزند

---

[1] برہانپور از مولوی معین الدین مارواڑی

حضرت نصیر الدین عرف عبید اللہ برہانپوری کی یادگار تصنیف ہے۔[1]

شاہ جند اللہ کے ایک استاد شیخ عثمان نے بخاری شریف کی شرح لکھی ہے۔ اس کا نام توضیح ہے۔ یہ عربی میں ہے۔ شاہ صاحب کے دوسرے استاذ شیخ طیب نے ترمذی شریف کی عربی میں شرح لکھی ہے۔ اس کو بھی بلند درجہ کارنامہ مانا گیا ہے۔

برہانپور کے بعض علماء کو شاہی خاندان میں اتالیق واستاد ہونے کا بھی فخر حاصل ہے۔ مولانا عبداللطیف کو اپنے علمی تبحر کی وجہ سے اورنگ زیب کے استاد ہونے کا فخر حاصل تھا۔ مولانا شاہ قطب برہانپوری شہزادہ اعظم کے اتالیق تھے۔ ایک اور عالم شیخ نظام الدین فتاوئے عالمگیری کی مجلس مشاورت کے صدر نشین تھے۔

برہانپور میں نفوس قدسیہ کے قدموں کی برکتیں بکھری ہوئی تھیں۔ سیکڑوں کی تعداد میں صوفیا آئے۔ اپنے روحانی فیوض سے خاص وعام کو نوازا اور یہیں پیوند خاک بھی ہوئے۔ شیخ باجن، شیخ علی متقی، شاہ عیسیٰ جند اللہ کے علاوہ کئی نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔ شاہ باجن کے فرزند شاہ عبدالحکیم وہ بزرگ تھے جن سے شیخ علی متقی نے شاہ باجن کے بعد خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا۔ شیخ علی کے فرزند شیخ عبدالوہاب بھی بلند درجہ رکھتے تھے۔ شیخ محمد بن فضل اللہ بھی شیخ علی کے تربیت یافتہ تھے۔ آپ سنتِ رسولؐ کے اتنے سخت پابند تھے کہ آپ کو نائب رسولؐ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ آپ نے ۱۰۲۹ھ میں وفات پائی۔ شاہ جند اللہ کے فرزند فتح محمد محدث بھی عالم و صوفی تھے۔ آپ نے مکہ معظمہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ اور وہیں وفات پائی۔ فاروقی دور کے ایک بزرگ شیخ نظام الدین بھکاری رحمتہ اللہ علیہ بھی پائے کے صوفی گذرے ہیں۔ جس جگہ آپ نے قیام کیا تھا وہاں سے ایک ندی یا سوتا بہتا تھا لیکن وہ زیادہ وقت خشک ہی رہتا تھا۔ آپ کے وضو کے لیے دور سے پانی لانا ہوتا تھا۔ ایک روز آپ اپنے چند معتقدین کے ہمراہ اس کے خشک پٹے پر گئے اور ایک عصا زمین پہ مارا تو پانی بہتا ہوگیا۔ آپ لوٹ رہے تھے تو پانی تیزی سے بہنے لگا۔ اس وقت آپ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے "اتاولی مکن" یعنی جلدی نہ کر۔ اس طرح اس

---

[1] معین الدین

کا نام 'اناولی' عام ہوگیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اُردو بولی کی حیثیت سے ہر جگہ زبان کا روپ دھار رہی تھی۔ حضرت شاہ بھکاری نے ۱۰۵۰ھ میں وفات پائی۔ شاہ بھکاری کے ایک خلیفہ شاہ منصور تھے۔ آپ عینا عادل شاہ کے عہد میں عہدہ وزارت پر فائز تھے لیکن آپ کا رجحان طبع تصوّف کی طرف تھا لہٰذا آپ نے فقر اختیار کرلیا۔ آپ نے ۹۵۸ھ میں وفات پائی۔ خواجہ ہاشم کشمی صوفی، عالم اور شاعر تھے۔ خواجہ مرزا شاہ رخ والیٔ بدخشاں کے خاندان سے تعلّق رکھتے تھے[1] خواجہ نقشبندی خانوادہ سے عقیدت رکھتے تھے۔ آپ نے دو سال مجدد الف ثانی امام ربّانی کی صحبت و خدمت سے فیوض اٹھایا اور خلیفہ کا درجہ پایا۔ خواجہ نے امام ربّانی کے مکتوبات کو مرتب کیا۔ آپ کی دوسری تصنیف زبدۃ المقامات ہے۔ اس میں اپنے مرشد امام ربّانی اور باقی باللہ کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ خواجہ کا کلیات نظم فارسی کا مخطوطہ جو میر قطب الدین عرف منجھلے شاہ سورتی کے ایما پر شاہ پیران محمد کے لیے لکھا گیا تھا۔ اس کا کاتب کوئی محمد فقیر اللہ ہے اور ۱۱۵۸ھ میں بمقام سورت تیار کیا گیا تھا۔ مذکورہ نسخہ ممبئی میں ملّا فیروز کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ خواجہ کشمی نے ۱۱۵۴ھ میں وفات پائی[2]۔

حضرت برہان الدین راز الٰہ شاہ جند اللہ کے خلیفہ تھے۔ عاقل خاں اورنگ زیب کا مقرّب خاص آپ کا مرید تھا۔ عاقل خاں اپنے مرشد کے نام کی مناسبت سے رازی تخلص کرتا تھا۔

مذکورہ خصوصی صوفیا کے علاوہ شاہ نعمان آسیری، شاہ جلال آسیری، شاہ عبد اللطیف، میر محمد نقشبندی، سید شریف رسول نما، شیخ ابراہیم مرغ لاہوتی وغیرہ نے بھی روحانی فیض عام کرنے میں خدمت انجام دی ہے۔

برہانپور علماء کا شہر تھا۔ مزید برآں علم و ادب مسلم حکمرانوں اور امیروں کی زندگیوں کا جز لاینفک تھا۔ اور پھر اس عہد کی تہذیب کا تقاضا بھی تھا۔ شہر میں شاہی اور ذاتی کتب خانے کافی تعداد میں تھے۔ اب ان کی افسانوی قدریں باقی ہیں قلعۂ برہانپور، ارک، اور قلعۂ آسیر میں شاہی کتب خانے تھے۔ مگر ان کا ورق ورق

---

[1] سلک گہر [2] سلک گہر

برباد ہو چکا ہے۔ ایک دفعہ علامی فیضی کو ضرورت پیش آئی تو اس نے عادل شاہ فاروقی سے درخواست کی تھی کہ تغلق نامہ کے فلاں فلاں صفحات کی نقل مرحمت کی جائے[1]
فتح اکبری کے بعد ابوالفضل نے بھی قلعۂ آسیر کی سیر کی تھی[2] کہا جاتا ہے کہ برہانپور اور آسیر کی نادر کتابیں آگرہ چلی گئیں۔ یہ فاتح بادشاہوں کا دستور ہوتا تھا۔

قدیم دور کے ذاتی کتب خانوں میں سے تین چار کی نشاندہی کی جاتی ہے ایک گرانقدر کتب خانہ مولوی قدرت اللہ کا مشہور تھا۔ صرف جلال الدین اللہ والے کا تھا۔ اللہ والے حضرت کے فرزند نصیرالدین کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اللہ والے تو تھے ہی مگر وہ کتابوں والے بھی تھے۔ یہ دونوں کتب خانے دست برد زمانہ سے بچ نہ سکے۔ تیسرا کتب خانہ حضرت برہان الدین راز الٰہ کے سجادہ نشین کے خاندان میں کسی وقت تھا۔ راقم کو اس کی چند کتابوں کی زیارت کا موقع ملا تھا۔ اب اس کی نادر کتابیں پاکستان ہجرت کر چکی ہیں۔ ایک کتب خانہ حضرت ابوالبرکات صاحب کا بھی تھا۔ اس خاندان کے افراد کی تحویل میں ہے۔ اب بھی کتابیں ہیں مگر وہ ایسی پردہ نشین ہیں کہ ان کی جلد کا گوشہ بھی نظر نہیں آتا۔ ایک کتب خانہ جامع مسجد کے خطیب مرحوم مولوی احکام اللہ حضرت کے خاندان کی بھی ملکیت ہے۔ اس کتب خانہ میں بعض نادر کتابیں موجود ہیں۔ مثلاً خزانۂ رحمت شاہ با جن کی تصنیف روپ نرائن کھتری کی تاریخ مختصر اللطیف جیسی کتابیں اس کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ راقم کو بعض کتابوں کی سیر کا موقع ملا ہے۔

برہانپور علم و ادب کا اہم مرکز تھا۔ یہاں ہر عالم کا گھر ایک کتب خانہ ہوگا۔ مگر علماء کے خاندانوں کے ورثا علم سے خالی ہیں۔ اس لیے انھوں نے کتابوں کی قدر نہ جانی اور کتابیں یا تو ردی میں گئیں۔ یا کاغذ کوٹ کوٹ کر ٹوکریاں بنتی رہیں۔ یا پھر دیمک چاٹتی رہی۔ موجودہ دور میں عہد قدیم کا دوسرا رخ یہ واضح کرتا ہے کہ آج شہر میں ایک کتب خانہ نہیں ہے۔

---

[1] مولوی معین الدین [2] تاریخ فرشتہ

برہانپور کی ہر مسجد ایک مکتب اور عالم کا گھر ایک مدرسہ تھا۔ ان کے علاوہ چند مدرسے ایسے بھی تھے۔ جو اعلا التعلیم کے دانش کدے کا حکم رکھتے تھے۔ نہ جانے ایسے کتنے ہی دانش کدے ہوں گے۔ ہم صرف چند دانش کدوں سے واقف ہیں۔

برہانپور کے سلطان اعظم ہمایوں عادل شاہ فاروقیؒ کی بیگم نے ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرائی تھی۔ جو اب بھی بی بی کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اس مسجد میں ایک دانش کدہ علم کی روشنی پھیلا رہا تھا۔ اس مدرسہ میں نہ جانے کیسے کیسے عالموں نے درس و تدریس کی خدمت انجام دی ہوگی۔ عہد اورنگ زیب میں ایک جیّد عالم مولانا عبد العظیم درس دیتے تھے۔

برہانپور کے محلہ راستی پورہ میں ایک صوفی عالم حضرت شاہ عیسیٰ جند اللہ کے مرشد لشکر محمد عارف باللہ کا ایک مدرسہ تھا۔ جس میں حضرت لشکر محمد کی صاحبزادی بی بی راستی درس دیتی تھیں۔ کبھی کبھی عبد الرحیم خان خاناں بھی بی بی کے درس میں شریک ہوتا تھا۔

محلہ سندھی پورہ میں حضرت شاہ جند اللہ کی اقامت گاہ، ہاسٹل خانقاہ وغیرہ واقع تھی۔ یہی آپ کی آخری آرامگاہ ہے۔ اس جگہ ایک اعلا پیمانہ پر دانشکدہ قائم تھا[1]۔

محلہ بدھ وارا میں ایک مدرسہ قائم تھا۔ جہاں ایک صوفی سید شاہ غلام محمد صاحب عربی کا درس دیتے تھے۔ اس مدرسے کے لیے حیدرآباد کے نواب ناصر جنگ کی طرف سے سالانہ ایک لاکھ روپیہ ملتا تھا۔ شاہ غلام محمد ایک مدت کے بعد سورت آگئے تھے اور مستقل اقامت اختیار کر لی تھی۔ سورت میں آپ کا مزار محلہ ہری پورہ کی مسجد روشن ضمیر میں واقع ہے۔

غرض ماضی میں برہانپور علم و ادب اور سلوک و معرفت کا بھی ایک مرکز تھا۔ فاروقیہ اور مغلیہ دور میں فارسی سرکاری اور تہذیبی زبان تھی۔ حاکم کے مقربین

---

[1] ڈاکٹر شیخ فرید نے اپنی تصنیف "شاہ عیسیٰ جند اللہ" میں خانقاہ دار الاقامہ وغیرہ کے متعلق تفصیل سے بیان کیا ہے۔

دمتوسلین اور دیگر امراشعر و سخن سے شغف رکھتے تھے۔ ان میں بیشتر شاعر تھے۔ اور شعراء کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔

فاروقی دور کے فارسی گو شعرا میں شاہ باجن متوفی ۹۱۲ھ شاہ منصور متوفی ۹۵۵ھ عارفی متوفی ۹۹۲ھ مرزا جانی ۱۰۰۸ھ خصوصیت رکھتے ہیں۔ مغلیہ دور میں عبدالرحیم خان خاناں کی عمر کے تینتیس سال برہانپور میں گذرے ہیں۔ خان خاناں ایک سیاستداں اور سپہ سالار کی حیثیت سے خصوصیت رکھتا تھا لیکن علم و ادب میں تو وہ غیر معمولی شخصیت کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ فارسی، ترکی، سنسکرت، ہندی زبانوں میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ اس نے ترکی زبان میں تزک بابری کا ترجمہ کیا ہے۔ ہندی میں تو وہ ساکشر کوی کا درجہ رکھتا تھا۔ ہندی میں رحیم تخلص تھا۔ اس کے کلام کا مجموعہ ست سئی کے نام سے ہے۔ فارسی میں بھی بلند درجہ شاعر تھا۔ وہ اہل کمال اور استادان فن کی سرپرستی بھی کرتا تھا اس کی سرپرستی کے مرہون منت شعرا میں مرزا جانی ۱۰۰۸، انیسی ۱۰۱۲، کفری ۱۰۱۶، نوعی ۱۰۱۲ جسمی ۱۰۱۶ھ قادری وغیرہ تھے۔ جو خان خاناں سے منسلک تھے۔ انیسی سے مثنوی محمود و ایاز یادگار ہے۔ کفری خراسانی تھا۔ وہ منصبدار تھا۔ ایک شاعر جعفر ۱۰۱۲ھ مثنوی شیریں خسرو کا مصنف تھا۔ اس کو آصف خان کا خطاب حاصل تھا۔ اس دور کے شاعر ملا حیاتی، کشتی، رازی بھی قابل ذکر ہیں۔ ملا حیاتی جہانگیر کے مقربین میں سے تھا۔ نظامی کی خسرو شیریں کی بحر میں ایک مثنوی سلیمان بلقیس لکھ کر جہانگیر کی خدمت میں پیش کی تھی[۱]۔ خان خانان سے اس کے خصوصی دوستانہ مراسم تھے۔ اس نے ۱۰۲۸ھ میں بمقام فتح پور وفات پائی۔ مصنف شاعر رحیمی نے تاریخ وفات "حیات باقی یافتہ" سے برآمد کی ہے۔ ہر صنف سخن میں اس نے طبع آزمائی کی ہے۔ برہانپور میں ایک مسجد اس کی یادگار باقی ہے ——— عاقل خاں رازی اورنگ زیب کے مصاحبان خاص سے تھا۔ برہانپور میں برہان الدین رازالہ کا مرید ہوا اور رازی تخلص اختیار کیا ۱۱۰۸ھ میں وفات پائی۔ وہ صاحب دیوان تھا۔ اس سے مثنوی شمع پروانہ، مثنوی مہر وماہ، مثنوی عشق نامہ

---

[۱] بزم تیموریہ جلد دوم از سید صباح الدین۔

منوہر، ثمرات الحیات ملفوظات رازالہ یادگارہیں۔

مذکورہ بالا فارسی شعرا کے علاوہ خوشحال چند فرحت ۱۱۴۷ھ اور ان کے بھتیجے دولت رائے دبیر ۱۲۲۵ھ بھی شاعر تھے۔ اور تاریخ آصفی کے مصنف ہیں۔ عزت درسی ۱۱۸۵ھ مبارک ۱۱۹۰ھ پروانہ ۱۱۹۰ھ وفا ۱۱۹۵ھ ممتاز ۱۱۹۶ھ رونق، نقی ۱۱۷۵ھ وغیرہ بھی تھے۔

اردو غزل کا چرچا بارہویں صدی ہجری میں ولی کے اجتہاد سے شروع ہوا۔ مگر اردو میں نظم اور مثنوی کا آغاز دسویں صدی سے ہو چکا تھا۔ ولی سے قبل گجرات و دکن میں زبان کے مقامی روپوں میں معتد بہ ادب وجود میں آچکا تھا۔ اگرچہ باجن کا کلام ہندی میں زیادہ ہے لیکن مقامی زبانوں گجری ہندی میں بھی پایا جاتا ہے۔ گجرات میں باجن کو اولیت کا فخر حاصل ہے اور برہانپور میں بھی اولیت کا سہرا انہی کے سر ہے۔ ان کے کلام کا نمونہ سخنوران گجرات گجری مثنویاں اور ڈاکٹر شیخ فرید کے مضمون (نوائے ادب کے شماروں میں) دیکھا جا سکتا ہے۔ برہانپور کے دوسرے شاعر کی حیثیت سے شیخ علی متقی متوفی ۹۷۵ھ کا نام نامی پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان کا ایک شعر جو موصوف نے مرض الموت میں ارشاد فرمایا تھا۔ وہ یہ ہے:

سن سہیلی پریم کی باتاں یوں مل رہے جیوں دودھ نباتاں[ل]

شیخ علی متقی اپنے علم و فضل اور رشحات قلم کی وجہ سے عالم اسلام میں غیر معمولی شخصیت کا درجہ رکھتے ہیں۔

برہانپور کے تیسرے بزرگ شاہ جند اللہ ہیں۔ آپ کا بھی ایک شعر پایا جاتا ہے۔ شعر یہ ہے:

ہر کو بسرا دے تہی دنیا ناؤں اسی کا کہی

گجرات و دکن میں اردو منجھ کر علاقائی شکلیں اختیار کر چکی تھی اور ان علاقائی روپوں یعنی گجری اور دکنی میں معتد بہ ادب وجود میں آچکا تھا۔ عہد عالمگیر میں ولی

ل سلک گہر از جاوید انصاری

ایک مجتہد کی حیثیت سے آیا جس نے اردو زبان وادب کو نیا رخ دیا۔ جس کے بعد غزل عام ہوگئی۔

برہانپور میں اس دور میں اردو غزل گویوں کی کثیر تعداد ملتی ہے۔ برہانپور کے جناب جاوید انصاری نے اس دور کے شعرا کا ایک تذکرہ سلک گہر کے نام سے مرتب کرکے شائع کر دیا ہے۔

پچاس سال قبل برہانپور میں قابل ذکر سخن گو اور سخن فہم چند شاعر گذرے ہیں جو شعر گوئی کے فن سے خوب واقف تھے۔ ان اساتذہ میں حاذق، ریاضی، خیالی، رونق، راغب آغاز، راشد، صابر وغیرہ خصوصیت رکھتے ہیں۔ فخر الدین، حاذق، شمشاد لکھنوی اور بقا غازی پوری سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ ۱۳۵۲ھ میں پہلا دیوان ۱۳۲۸ھ میں خزینۂ محاورات ۱۳۳۴ھ میں مجموعۂ ریاض دلفریب شائع ہوا۔ حاذق نے ۱۹۵۲ء میں وفات پائی۔ منشی علیم اللہ خیالی قدیم و جدید کے درمیان کے شخص تھے۔ ان کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ دور جدید کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کا حلقۂ تلامذہ بہت وسیع تھا۔ موصوف نے ۱۹۴۴ء میں وفات پائی۔ استاد حشمت اللہ ریاضی فارسی میں مہارت رکھتے تھے۔ خیالی کے بھائی حشمت اللہ جا نشین تھے۔ عنایت علی آغاز پر گو شاعر تھے۔ سلاموں کا مجموعہ چراغ حسینی اور مجموعہ کلام شعلۂ احساس کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ آغاز نے ۱۹۴۴ء میں وفات پائی۔ آغاز، راغب کے شاگرد تھے لیکن جلیل مانک پوری اور نوح ناروی سے بھی مشورۂ سخن کرتے تھے۔ منشی فضل حسین صابر نہایت پر گو اور ظریف الطبع شخص تھے۔ ۱۹۶۲ء میں وفات پائی۔ سید مطیع اللہ راشد بلند درجہ شاعر تھے۔ عربی، فارسی اور اردو سے خوب واقف تھے۔ ان میں تحقیقی صلاحیتیں موجود تھیں۔ حاذق کے شاگرد تھے۔ ان کی ایک تصنیف برہانپور کے سندھی اولیا پاکستان سے چھپ چکی ہے۔ ان سے سلام، سہرے، غزلیں یادگار ہیں۔ موصوف ۱۹۴۸ء کے بعد کراچی چلے گئے تھے۔ جہاں ۱۹۶۰ء میں انتقال ہوگیا۔

حضرت خیالی کے ایک شاگرد محمد اسماعیل فہمی بھی قابل ذکر ہیں۔ فہمی صاحب فارسی میں مہارت رکھتے تھے۔ موصوف نے مآثر رحیمی کا اردو میں ترجمہ کیا ہے مگر اب تک شرمندہ اشاعت نہ ہوا۔ ان کے دو مجموعے ریاض دانش اور نیرنگ دانش کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ جناب جاوید انصاری مؤلف سلک گہر ان کے چھوٹے بھائی ہیں جاوید کتاب کے کیڑے ہیں۔ ان کو تاریخ سے دلچسپی ہے۔ برہانپور کے آثار قدیمہ سے متعلق چھوٹے چھوٹے کئی رسالے شائع کر چکے ہیں۔ موصوف کو فارسی میں بھی دسترس حاصل ہے۔

دور حاضر جوان شعرا کا دور ہے۔ اس دور میں ماضی کی کچھ تلچھٹ باقی ہے۔ اگلے وقتوں کے بزرگوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے۔ ان کی صحبتوں سے مستفید ہونے والے شعرا میں خلیق، فاضل، امیدی، شمیم وغیرہ زندہ ہیں۔ جو شعر و سخن کی محفلوں کو گرم رکھتے ہیں ایک شاعر مرزا محمود بیگ ساز ہیں۔ یہ عمر کے اعتبار سے بوڑھے کہے جا سکتے ہیں مگر مشاعرہ کے پیش نظر جوان ہیں۔ نہایت پرگو شاعر ہیں ان کے کلام میں قدیم و جدید دونوں روایتیں ملتی ہیں۔ موصوف نثر نگار بھی ہیں۔ اور نہایت جوشیلے مقرر بھی ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ ایک اچھے شاعر عارف وفات پا گئے۔

گربا

رقص انتہائی جوش و مسرت کے وقت کا ایک اضطراری فعل ہے۔ جس طرح غصّے کے عالم یا رنج والم کی حالت میں انسان کے رونگٹے رونگٹے سے غضب اور رنج والم کا اظہار ہوتا ہے۔ چہرے پر ایک رنگ، آتا ہے ایک جاتا ہے۔ آنکھوں سے شعلے نکلتے ہیں۔ اعضا میں ایک قسم کی اضطراری حرکت پیدا ہوجاتی ہے۔ زبان اور دل ودماغ پر سے قابو جاتا رہتا ہے۔ اسی طرح چونکہ خوشی اور مسرّت کا بھی جذبات سے تعلّق ہے ایسے موقعوں پر بھی یہی حالت اور ہمارے اعضا میں ایک قسم کی حرکت پیدا ہوجاتی ہے۔ ہر چند یہ حرکت بے ترتیب ہی سہی، چند لمحوں کے لیے ہی سہی لیکن اگر اس بے ترتیبی کو ترتیب دیا اور اصول کی زنجیر میں جکڑ لیا جائے تو یہ ایک فن ہوجاتا ہے۔ حقیقت میں یہ جذبات کا اظہار ہے جو الفاظ میں ادا ہونے سے پہلے حرکات سے ظاہر ہوجاتے ہیں۔ اسی وجہ سے بچہ خوشی کے مارے اگر بول نہیں سکتا تو ناچنے لگتا ہے۔ بچّے تو کیا بڑے بھی یہی کرتے ہیں۔ صوفی کا کسی شعر تصوّف پر تڑپ اٹھنا، عاشق کا کسی شعر پر جھوم جانا، اور مولانا روم کے پیروؤں کا مثنوی پر وجدانی حالت میں رقص کرنا اسی اصول کے تحت ہوتا ہے۔

دنیا میں کوئی ملک یا قوم، متمدّن یا وحشی ایسی نہیں جو فن رقص سے ناواقف ہو۔ متمدّن اور غیر متمدّن دونوں قوموں میں ناچ سوسائٹی کا جزو لاینفک ہے۔ اگر فرق ہے تو یہ کہ وحشیوں کے ناچ ان کے ماحول کے مطابق ہیں اور متمدّن ممالک کے ناچ ان کے اپنے ماحول سے زیادہ مطابقت رکھتے ہیں۔ اول الذکر میں سادگی، جسمانی صرفِ قوّت، اصلیت اور ایک قسم کا اکھڑپن ہوتا ہے تو موخر الذکر میں پیچیدگی،

نزاکت، تصنع اور شہوانیت ہوتی ہے۔ افریقہ کے وحشیوں کے ناچ۔ ہوائی ناچ۔ ہندوستان کے بھیلوں کے ناچ بھی اتنی ہی اہمیت رکھتے اور دل خوش کن ہوتے ہیں جتنے روس کے بیلے، یورپ کے کیبرے اور ہندوستان کے دراوڑی یا کتھک کے ناچ ہوتے ہیں۔

ہر ملک میں دو قسم کے ناچ ہوتے ہیں۔ ایک انفرادی دوسرا اجتماعی۔ ہندوستان میں بھی انفرادی اور اجتماعی دونوں ناچ رائج ہیں، ہندی ناچوں کا مذہب اور عبادت سے گہرا تعلق ہے۔ قدیم زمانے میں مذہبی جذبات اور عقیدت کے اظہار کے لیے سب سے زیادہ مناسب آلہ ناچ تصور کیا گیا ہے اور ناچ بھی عبادت کا ایک طریقہ قرار پایا ہے۔ آج ہم دراوڑی قوم کے ناچ دیکھتے ہیں۔ جن کی نمائندگی ہندوستان میں اودے شنکر، سیکی، گوپی ناتھ، سادھنا بوس، اور رکمنی دیوی وغیرہ کر رہے ہیں۔ یہ اصل میں ہندوستان کے مذہبی ناچ ہیں، جن کو مذہبی روایات کے معلوم کیے بغیر سمجھنا مشکل ہے۔ ہندوستان میں شمالی ہند کے ناچ ایسے ہیں جن کو مذہب سے زیادہ تعلق نہیں۔ انھیں تمدن کی پیداوار کہہ سکتے ہیں۔

ہندوستانی ناچوں کا سراغ ہمیں ہندوستانی موسیقی میں ملتا ہے۔ لہٰذا ہندوستانی ناچوں کی تاریخ کے لیے پہلے ہمیں موسیقی کی تاریخ دیکھنی ہوگی۔ ہندوستان میں موسیقی کی تاریخ ایک ہزار سال قبل مسیح چار ویدوں میں سے سام وید میں ملتی ہے۔ سام وید کے شلوک کسی قربانی کے موقع پر ترنم کے ساتھ پڑھے جاتے تھے اور ایسے ترنم کے ساتھ پڑھنے والے مشّاقوں کو گاندھرو کہتے تھے۔ اس ترنم میں کھرج۔ مدھم اور ٹیپ ایسے تین چڑھاؤ یعنی سپتکیں تھیں۔ جو گانے بجانے کا اصل اصول ہیں۔ موسیقی کے دوسرے دور یعنی ایک سو قبل مسیح سے ایک ہزار بعد مسیح میں متفرق ساز، تان، ٹھپکے وغیرہ وجود میں آئے۔ اور ان میں کافی ترقی بھی ہوئی۔ یہی دور ڈرامے کے جنم کا بھی ہے۔

ایک سو قبل مسیح میں موسیقی کے آرکیسٹرا جلسوں میں ہوا کرتے تھے۔ اسی دور میں تار اور منہ سے بجانے کے ساز ایجاد ہوئے۔ اس دور میں بھرت نے راگ۔ دھاری (ریکا) گانا ایجاد کیا۔ اور موسیقی نے اتنی ترقی کی کہ فن موسیقی (گانا)، دو بڑے حصوں میں منقسم ہوگیا۔ ایک بھرت کے نام سے "بھرت مت" اور دوسرا "ہنومان مت" (ڈرناٹکی) کے نام سے مشہور ہوگیا۔ یہی وہ دور ہے کہ ڈرامے سے ناچ.... (سائنٹیفک ناچ) وجود میں آیا۔ تیسرا دور وہ ہے جو مسلمانوں کی ہند میں آمد سے لے کر مغلوں پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور میں موسیقی کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ اسی دور میں خیال، ٹھمری، پٹہ وغیرہ ایجاد ہوئے۔

یہ وہ دور ہے جب موسیقی مذہبی حدود سے نکل کر ہندو اور مسلمانوں کا مشترک ترکہ ہوگئی۔ اور خواص سے نکل کر عوام میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ چوتھا دور موجودہ دور ہے۔ اس میں راگ دھاری گانے کے ساتھ ایک جدید طرز کے گانے ایجاد ہوئے ہیں۔ جن کو ریڈیو کی زبان میں ہلکے پھلکے ڈرامے کی زبان میں گانے فلمی اور عام طور پر بنگالی طرز کے گانے کہا جاتا ہے۔ اس موجودہ دور میں ناچ کو بھی فروغ ہو رہا ہے۔ مذکورہ بالا تقسیم "فن موسیقی کے ادوار وغیرہ" ایک سرسری جائزہ ہے، ممکن ہے اہلِ فن زیادہ ادوار میں تقسیم کر سکتے ہوں۔

ہم نے دیکھا ہے کہ ایک سو قبل مسیح سے ناچ پایا جاتا ہے۔ حالانکہ اس سے بہت پہلے سے ناچ موجود ہوگا۔ لیکن یہ وہ زمانہ ہے کہ جب ناچ کو باقاعدہ ترتیب دیا گیا۔ اور اس باترتیب ناچ کی وقعت و مقبولیت بڑھتی گئی۔ جس طرح ایک زبان سے جب تک بازاری ہوتی ہے تو کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ لیکن یہی زبان جب ادبی صورت اختیار کرلیتی ہے تو زبان کی وقعت بڑھ جاتی ہے۔ چار سو صدی عیسوی میں پراکرت میں جو ڈرامے ملتے ہیں ان ڈراموں میں شاعری، موسیقی، ناچ، تال اور لے ہوتی تھی۔ وہ موسیقی اس دور میں ہوئی۔ دیوالی یا بسنت کے مہینے میں غرض ہر خوشی کے موقع پر ناچ رنگ کی محفلیں گرم ہوتی تھیں۔

ناچ کا دوسرا حوالہ ہمیں بھاگوت اور برہما پُران میں ملتا ہے، بھاگوت کے دسویں باب میں کرشن اور گوپیوں کے ناچ میں پایا جاتا ہے۔ کرشن اور گوپیوں کے ناچ کی نوعیت یہ ہوا کرتی تھی کہ کرشن جی ایک جگہ کھڑے ہو جاتے اور گوپیاں ان کے اردگرد ایک خاص انداز اور ترتیب کے ساتھ ناچتی اور گاتی تھیں۔ ان ناچوں کو لاسیہ کہتے تھے۔ ایسے ناچوں کا دوسرا حوالہ ہم کو چندر آچاریہ سے ملتا ہے۔ وہ اپنی تصنیف "دلیش نام مالا" میں لکھتا ہے کہ جس ناچ کو سب مل کر ناچیں اور ان میں ایک شخص گانے میں پیشوائی کرے جیسے گوپیوں میں "ہری" تو اس کو راسک کہتے ہیں۔ اس طرح "سنگت رتناگر" کا بیان ہے کہ پاروتی نے اوشا نامی لڑکی کو ناچ سکھایا۔ اوشا نے دوارکا کی گوپیوں کو اور گوپیوں نے سوراشٹر (کاٹھیاواڑ) کی ناریوں کو سکھایا۔ اور کاٹھیاواڑ سے ہندوستان کے دوسرے خطوں میں پہنچا۔ اس حوالے کی سند پر شاید موجودہ دور کے گجراتی ادب کے ممتاز شاعر کوی نانالال آنجہانی نے اپنی ایک تصنیف میں لکھا ہے کہ گجرات ہندوستان کا راس تیرتھ ہے۔

بالفرض لاسیہ، راسک یا راس ہندوستان میں کسی نہ کسی طریقے پر ناچا جاتا ہوگا لیکن چوں کہ کاٹھیاواڑ میں اس ناچ کو فروغ حاصل ہوا۔ لہذا یہ ناچ اس علاقے کے ساتھ مخصوص ہوگیا۔ کاٹھیاواڑ میں اس نے لوک ناچ کی صورت اختیار کرلی۔ یہ مشترک عورتوں اور مردوں کا ناچ آج بھی اس علاقے میں اسی طرح ناچا جاتا ہے۔

اس راس نے گجرات میں آکر "گربا" کی شکل اختیار کرلی۔ گربا بھی راس کی طرح پہلے پہل ایک قسم کا مذہبی ناچ تھا۔ یعنی یہ ایسے ہی موقعوں پر ناچا جاتا تھا، اسی وجہ سے گربا کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ گربا لفظ گربھ سے مشتق ہے، گربھ گھڑے کو کہتے ہیں۔ گھڑے میں سوراخ کیے جاتے ہیں اور اس کے اندر دیا جلایا جاتا ہے۔ اس دیئے والے گھڑے کو گربھ دیپک کہتے ہیں۔ نوراتری کی پوجا کے دنوں میں اس گربھ دیپک کو ایک جگہ رکھ کر یا سر پر اٹھائے ناریاں گول حلقہ بنا کر ناچتی ہیں اور اپنے جوشِ عقیدت کا اظہار کرتی ہیں۔ الغرض یہ بھی عبادت یا اظہار عقیدت کا ایک طریقہ قرار پایا۔ جو خصوصاً گجرات میں اب تک رائج ہے۔

راس یا گربا صرف جسمانی حرکات کا نام نہیں ہے۔ حرکات، شاعری اور موسیقی مل کر راس یا گربا ہوتا ہے۔ گربوں میں جو گانے گائے جاتے ہیں ان گانوں میں گربا، گربی، راس، راسڑا، ایسے چار نام ملتے ہیں۔ عوام تمام گانوں کو گربا کہتے ہیں۔ لیکن ادب میں ان گانوں کو راس یا گربی کہتے ہیں۔ جس طرح اُردو ادب میں غزل ایک خاص صنف ہے اسی طرح گجراتی شاعری میں راس ایک الگ اور قابلِ قدر صنف ہے۔

ہمیں لفظ گربا (بحیثیت ادب) پہلے نرسینھ مہتا اور میرا بائی کے ہاں ملتا ہے۔ نرسینھ مہتا اور میرا بائی نے عبادت اور اظہارِ عقیدت کی غرض سے صوفیانہ رنگ میں ایسے گربے یعنی رقصی گیت لکھے ہیں۔ نرسینھ مہتا نے بھجن اور پربھاتیے بھی لکھے ہیں۔ جو قریب قریب گربا کی قسم کی مسلسل نظمیں ہیں جن میں بھگتی محبت، دلی جذبات و قلبی واردات ہیں۔ سترھویں صدی عیسوی میں گجرات میں ایک شاعر دیارام گزرا ہے جس نے راس اور گربوں کی طرح رقصی گیت لکھے ہیں اور انھیں گربا کی بجائے گربی نام دیا ہے۔ جس طرح ریختہ سے ریختی وجود میں آئی۔ اس طرح گربا سے گربی بنا لیا گیا۔ گربی مختصر مسلسل نظم ہے۔ گربی میں غزلیت زیادہ ہوتی ہے اس کو مسلسل غزل کہہ سکتے ہیں۔

اٹھارھویں صدی میں گربے لکھنے والے کئی شاعر گجرات میں پیدا ہوئے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس

زمانے میں گجرات میں پیدا انباجی اور بہوچراجی دیویوں کی پوجا عام ہونے لگی تھی اور اس پوجا میں عبادت اور اظہار عقیدت کا ایک طریقہ گربا بھی تھا۔ اس دور کے شاعروں میں دلبھ بھٹ خصوصیت رکھتا ہے۔ ولبھ بھٹ نے صرف گربے ہی لکھے، ان گربوں میں اگلے زمانے کی تمام خصوصیات کے علاوہ ایک جدت یہ پائی جاتی ہے کہ گربوں میں بھگتی، شکتی، مناظر قدرت وغیرہ کے علاوہ سماجی موضوعوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ وہ دور ہے کہ گربا مندروں سے نکل کر چوراہے پر آگیا۔ یعنی سماجی موضوعوں کے شامل ہونے سے ان ناچوں اور راس ادب میں اتنی وسعت پیدا ہوگئی ہے اور اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ گھر گھر راس اور گھر گھر گربا ہونے لگا۔ انیسویں صدی گربے کے لیے مبارک ثابت ہوئی۔ ایک طرف گربے لکھنے والے شاعر جیسے نرمدا شنکر (سورت)، نول رام (سورت) پیدا ہوئے جنھوں نے بڑی جدت کے ساتھ گربے لکھے۔ دوسری طرف تھیٹر گھروں میں گربوں ہی نے ڈراموں کو چمکایا۔ اور ان کے نقائص پر پردہ ڈالا۔ مختصر یہ کہ گربوں نے ڈرامے میں ایک درجہ حاصل کر لیا۔ کوئی ڈرامہ گربے سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح تمام مذہبی تہوار، شادی بیاہ کی تقاریب اور سماجی جلسے گربے کے بغیر پھیکے سمجھے جاتے تھے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں اس فن میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی۔ اس دور کے شعراء میں احمد آباد کا ایک شاعر کوی نانالال (انتقال ۱۹۴۶ء) قابل ذکر ہے۔ جس نے کئی تصنیفات اس صنف میں یادگار چھوڑی ہیں۔

قدیم زمانے میں گربے (ناچ) میں ایک قسم کی سادگی تھی۔ یہ ناچ تصنع اور بناوٹ سے بالکل پاک تھے۔ لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا اور ناچوں میں تراش خراش ہوتی گئی۔ اسی طرح اس کے گیتوں میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی گئیں۔ موجودہ دور میں زیادہ زور تخیل پر صرف کیا گیا ہے، ان میں انوکھی تشبیہیں اور استعارے استعمال کیے جاتے ہیں۔ کوی نانالال نے فلسفہ کو بھی شامل کر دیا اور اس طرح گربے کی ایک قسم وہ ہوگئی جو ناچے جاتے ہیں اور دوسری قسم وہ ہے جو صرف پڑھے جاتے ہیں۔ بہاریہ (مناظر قدرت) گربوں کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں خیال ایک ہی ہوتا ہے جس کو پہلے شعر میں بیان کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد چار چھ اشعار اسی خیال کے جزئیات پر لکھے جاتے ہیں اور آخری شعر ماحصل ہوتا ہے۔ گربوں میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے، بہاریہ گربوں کے خاص خاص موضوع شرد پونم، بسنت، برشگال، ہوتے ہیں اور سماجی موضوع بھی ہوتے ہیں۔

یہاں ان رقصی گیتوں کی چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

دیارام :-

اس گربی میں دیارام نے رادھا کرشن کے راز و نیاز کو پیش کیا ہے۔ ہندو مذہب میں تصوّف میں ہر جگہ خدا کو عاشق اور بندے کو معشوق کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔

مندرجہ ذیل گربی میں رادھا کی سہیلی رادھا سے چند سوالات کرتی ہے۔ رادھا جن کے جواب دیتی ہے۔

گربی : اے سجنی! مجھے یہ بتا کہ آج تو کہاں کھل کھیل آئی۔ یہ پیشانی پر پسینے کے قطرے کیسے ہیں۔ یہ بھنویں کیوں بھیگی ہوئی ہیں۔

سن : میں آج جنگل میں راستہ بھول گئی تھی اور اس وجہ سے میں وہاں بہت گھبرائی۔
اور یہی وجہ ہے کہ میری جبیں پر پسینہ ہے اور ابرو بھی بھیگی ہیں۔

کہہ : کل ہی تو میں نے تیرا گجرا گوندھا تھا۔ آج یہ کس طرح ٹوٹ گیا؟
اور ایسی کیا عجلت میں تھی کہ تو بالوں کا جوڑا بھی برابر نہ باندھ سکی۔

سن : سیاہ بھونرا میرے سر پر آبیٹھا۔ اس کو اڑاتے ہوئے جوڑا چھوٹ گیا۔ اور گجرے کو باندھتے ہوئے اس کی لڑیاں ٹوٹ گئیں۔

کہہ : یہ تیری اطلس کی انگیا جس کی سہیلیاں بہت تعریف کرتی تھیں، اس کے بند کیسے ٹوٹ گئے یہ تجھے کس نے نوچ لیا؟

سن : میرے دل میں درد اٹھا تو میں بیکل ہو گئی
اور میں نے جو انگڑائی لی تو اس کے بند ٹوٹ گئے

کہہ : راستے میں یہ خوشنما پھول تجھے کس نے دیے
ایسا چھیل چھبیلا کون ملا تھا جس نے تجھ سے اظہار الفت کیا

سن : صبح کو جب میں جاتی تھی تو کرشن جی راستے میں ملے
اور مجھے قسم دے کر یہ پھول دیے۔ تو میں نے لے لیے

کہہ : تیرے جسم سے یہ مشک کی مہک کیسی آرہی ہے
تو تو اس وقت جنگل سے آرہی ہے تیرے پاس اس کا کیا جواب ہے

سن : جنگل میں اتفاق سے ایک غزال بیٹھا ہوا تھا پیار سے میں نے اسے دبوچ لیا۔

یہ اس کے مشک کی خوشبو ہے جو چھپائے نہیں چھپتی

کہہ : معلوم ہوتا ہے کہ تجھے راستے میں شیام سندر ملے تھے

یہ جو کچھ جواب تو دے رہی ہے یہ محض تیری چالاکی ہے

سن : جس راستے پو ہری نے مجھے گھیرا ہو ۔ اس راستے نہ جاؤں

اگر مجھے ہری ملے ہوں تو کہہ ویسی قسم کھاؤں ۔

سن ، میں نے تو عہد کیا ہے کہ غیر مرد میرے باپ اور بھائی ہیں

خدا کی عبادت سے اس بندۂ دیارام کے سب دکھ دور ہو جائیں گے

دیارام کی ایک اور گربی ملاحظہ فرمائیے ۔ اس گربی میں معشوق سیاہ رنگ سے خوفزدہ ہے کیونکہ عاشق بے وفا ہے اور بے وفائی کو سیاہ رنگ سے تعبیر کیا ہے ۔ گربی میں لفظ کپٹ (کینہ) استعمال کیا ہے لیکن اس کے معنے دھوکا اور بے وفائی لیے گئے ہیں ۔ کرشن جی کا رنگ بھی سیاہ ہے یہ بھی تصوف سے مملو ہے ۔

میں اب سیاہ رنگ کے قریب نہ جاؤں گی

جو چیزیں سیاہ ہیں ان میں میرے عاشق جیسا ہی کپٹ ہوگا ۔

نہ عنبر کا قشقہ کھینچوں گی نہ آنکھوں میں کاجل آنجھوں گی

نہ کوئل کی کوک سنوں گی نہ کاگا کی آواز

نہ تو سیاہ رنگ کی چولی پہنوں گی نہ جمنا میں اشنان کروں گی

نہ بندر اور سیاہ بادل کی طرف دیکھوں گی نہ جامن اور بینگن کھاؤں گی

میں نے دیارام کے پریتم سے نہ ملنے کا عہد کیا ہے ۔ لیکن دل کہتا ہے اک لمحہ بھی ایسا نہ ہوگا ۔

"بسنت"

بسنت کے ساتھ خوشی آئی

اور دنیا پر مسرتیں چھائیں

بسنت کا عجیب سہاگ ہے

بسنت آئی اور سب بادل چھٹ گئے
اور ہر طرف روشنی پھیل گئی
بسنت کا عجیب سہاگ ہے
بسنت آئی اور ٹھنڈی ہوا چلنے لگی
اور لوگوں کو فرحت بخشنے لگی
بسنت کا عجیب سہاگ ہے
فصلوں کی وجہ سے کھیت لہلہاتے ہیں
کسانوں کے دلوں کو لبھاتے ہیں
بسنت کا عجیب سہاگ ہے
چاند پوری بہار کے ساتھ نکلا
اپنے پورے جوبن کے ساتھ چلا
بسنت کا عجیب سہاگ ہے
سکھیوں کا دل للچائے
(انھوں نے) بسنت کے راس کھیلے
بسنت کے عجیب سہاگ ہیں

آرٹ:

گربا دوسرے ناچوں سے بالکل الگ ہوتا ہے۔ گربا صرف حلقہ میں کھڑے ہو کر ناچا جاتا ہے۔ اگر حلقہ میں گول گول نہ ناچیں تو پھر یہ ناچ ہی نہیں کہلا سکتا۔ لہذا اس ناچ کی بڑی شرط یہ ہے کہ اس کو حلقے میں ناچا جائے۔ گربوں میں جدت پسندوں نے بیسیوں طریقے ایجاد کیے ہیں لیکن ان سب کا اصل اصول قریب قریب ایک ہی ہے۔ اس ناچ کا تمام تر دارو مدار قدموں اور ٹھیکہ پر ہے۔ گربے میں ناچنے والوں کی تعداد کی کوئی خاص قید نہیں ہوتی۔ مگر عام طور پر کم از کم آٹھ اور زیادہ سے زیادہ بیس افراد ہوتے ہیں۔ ہم یہاں اس کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں جس سے قارئین کو اس کا

اندازہ ہوگا۔
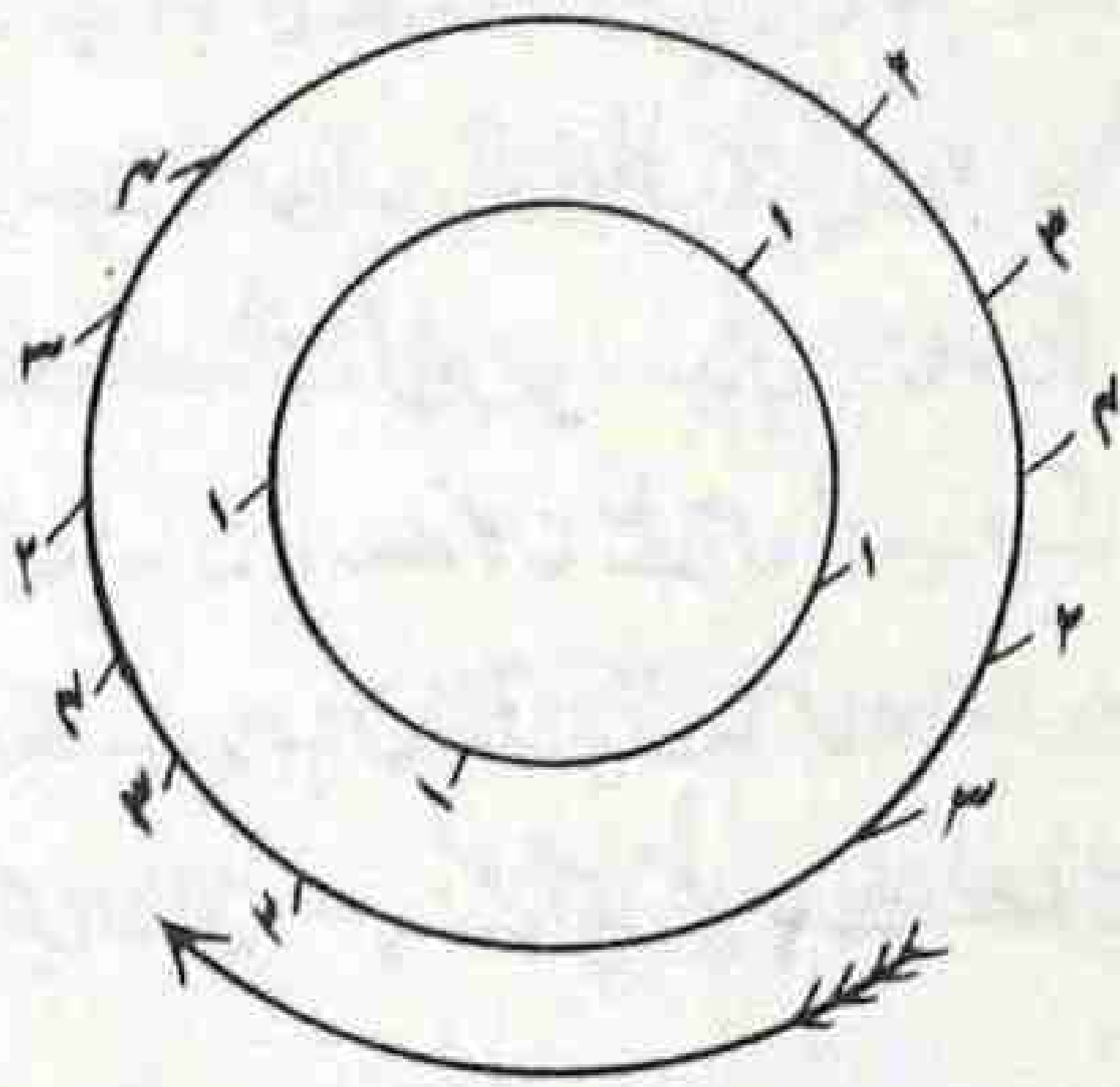
نمبر ۱ تر تال کا سم ہے۔ اس کے بعد نمبر ۲ دوسری تال ہے۔ اس تال پر سب ناچنے والے اندرونی حلقے سے بیرونی حلقے میں چلے آئیں گے۔ نمبر ۳ تال کی خالی ہے۔ اس وقت بیرونی حلقے میں ایک قدم اندر ہٹ کر چھوٹا حلقہ بنالیں گے۔ بس اس طرح پورا گیت ختم کردیں گے۔ یہ تو ہوا تال اور سم۔ سم سے اٹھ کر دوسرے سم تک جاتے جاتے بڑی منزلیں طے کرنا ہوتی ہیں۔ کبھی دو دو بالمقابل ہوں گے، کبھی ایک دوسرے کے سامنے تھوڑا جھک جائیں گے۔ کبھی دو حلقوں میں تقسیم ہوجائیں گے۔ غرض بے شمار طریقے ایجاد کیے گئے ہیں۔ ہم نے اوپر صرف تین تال کی مثال دی ہے، لیکن موجودہ دور میں متفرق تالوں میں گربے چسپاں کیے گئے ہیں۔ پہلے گربوں کو آسان اور مروّج راگوں میں بٹھلایا جاتا تھا مگر اب مشکل مشکل راگوں اور راگنیوں میں بٹھلایا جاتا ہے۔ بعض اہلِ ذوق اس رجحان کو پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے گربوں کی اصلیت اور سادگی خاک میں مل جاتی ہے۔ تصنع اور بناوٹ پیدا ہوجاتی ہے۔ اس طرح فن کی حیثیت سے ترقی ضرور ہوتی ہے۔ مگر ان گربوں میں جذبات کی جو فراوانی کارفرما ہوتی ہے وہ مفقود ہوجاتی ہے۔ اور ایک مشین کی پیداوار معلوم ہوتی ہے۔

کاٹھیاواڑ کے راس اور گجرات کے گربے میں تھوڑا سا فرق ہے۔ اس میں عورت اور مرد دونوں ساتھ مل کر ناچتے ہیں۔ اس کے برخلاف گربے میں صرف عورتیں ہوتی ہیں یا اس کے گیتوں میں بعض اوقات مذہبی قصے ہوتے ہیں۔ لیکن گربوں میں نزاکت، متانت اور فن کاری ہوتی ہے۔

لباس:

گربوں میں لباس کو بڑا دخل ہے۔ لباس سے گربے کی بہار میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ گربے میں ایک قسم کی نقل و حرکت ہوتی ہے۔ اس وقت رنگ برنگ کے کپڑوں کا فضا میں اُڑنا، حلقوں میں رنگوں کا دوڑنا۔ ایسا منظر پیش کرتا ہے جیسے رنگ کی لہریں دوڑ رہی ہوں۔ رنگ کی یہ لہریں زنجیرِ جمال پیش کرتی ہیں۔ گربوں کو دیکھنے میں جہاں ہمارے کان نغمے میں ڈوب جاتے ہیں۔ جہاں تال کا ہر جھٹکا سامعین پر کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ جہاں زرق برق لباس صاعقہ ریزی کرتا ہے۔ وہاں آنکھیں بھی رنگوں کی دنیا میں گم ہو جاتی ہیں اور ان سب کے ایک ہو جانے سے ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ کہنا پڑتا ہے کہ:

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

پہلے گربا کھیلتے (ناچتے) وقت عام طور پر پشواز پہنی جاتی تھی۔ کاٹھیا واڑ میں اب تک بھی زیادہ تر پشواز ہی پہنی جاتی ہے مگر گجرات میں ساری باندھتے ہیں۔ بعض اوقات لہنگا۔ دوپٹہ اور چولی بھی ہوتی ہے۔ عام طور پر شوخ رنگ اور ٹھپے گوٹے ٹنکے ہوئے کپڑے گربا کے لیے مناسب سمجھے جاتے ہیں۔ گربا کھیلنے والوں کے کپڑوں میں خاص تناسب اور ترتیب ہوتی ہے۔

گربوں میں قدیم زمانے میں مٹی کے گھڑے اور بجانے کے لیے ڈنڈے استعمال کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان میں بھی تبدیلی ہوتی گئی اور اب جست یا تانبے پیتل کے گھڑے یا چھوٹے چھوٹے لوٹے ہوتے ہیں اس طرح دوسری بہت سی اشیاء سے جدا جدا گربوں میں کام لیتے ہیں۔

المختصر اس بار گربا کاٹھیا واڑ اور گجرات کے ساتھ اتنا مخصوص ہے کہ گربا کا نام سنتے ہی ہر گجراتی کے تصور میں ایک سماں بندھ جاتا ہے۔ اور اس کے جلسے، اس کے گیت، اس کے کپڑوں کی چمک دمک۔ اور سب سے زیادہ فتنہ گران گجرات کے سلونے اور ملیح چہرے گجراتیوں کے خیال میں رقص کرتے ہوئے چلے آتے ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں اس ناچ کا رواج نہیں۔ اور اگر ہے تو بھی اس فن کو جو فروغ گجرات میں حاصل ہوا وہ اسے اس کی جنم بھومی یعنی کاٹھیا واڑ میں بھی نہیں

ہوا۔ گجرات کے مہذب گھرانوں (ہندو اور مسلمان) میں اگر کسی عورت سے ناچنے کے لیے کہا جائے تو وہ ناک بھوں چڑھائے گی لیکن اگر گربا کھیلنے کی گذارش کی جائے تو فوراً ڈھول یا طبلہ پر تھاپ اور تال کی تالیوں سے فردوس گوش اور رنگ برنگ کی ساریوں سے جنت نظر کا منظر پیش ہو جاتا ہے۔ گربا رقاصہ کا ناچ نہیں۔ اس کے گیت تان پلٹوں میں اُلجھے ہوئے نہیں۔ یہ ایک مہذب سوسائٹی کا مہذب ناچ ہے جس پر حیا سایہ فگن رہتی ہے اور وہ اس وجہ سے یہ ناچ پیشہ وروں کے ناچ سے زیادہ ممتاز نظر آتا ہے۔

گجرات کاٹھیاواڑ میں ہندو اور مسلمان دونوں کا یہ محبوب ناچ ہے۔ اگرچہ ہندوؤں میں یہ زیادہ رواج پاگیا ہے لیکن مسلمان رؤسا میں بھی اس ناچ کا رواج ہے۔ مسلمان عورتیں گجراتی گربے نہیں گاتیں بلکہ ٹھمری دادرے سے اپنا شوق پورا کرتی ہیں۔ ان کے ساتھ طبلہ نہیں کھڑکتا۔ گھر کی اناد دوا۔ کوئی بڑی بوڑھی یا مہذب طوائف ڈھول لے کر ایک جگہ بیٹھ جاتی ہے اور اس کے اردگرد بیگمات گربا کھیلتی ہیں۔ یہ زیادہ سائنٹیفک نہیں ہوتا۔ کاٹھیاواڑ میں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے رؤسا میں اس کا بہت زیادہ رواج ہے اور میراثنوں کے گربے کھیلنے والے باقاعدہ گروہ ہوتے ہیں۔ کاٹھیاواڑ میں انفرادی ناچ۔ گھومر اور جھومر بھی رؤسا میں ناچے جاتے ہیں۔ گویا گربا کاٹھیاواڑ کے رؤسا کی صحبتوں کا جزو لاینفک بن گیا ہے۔
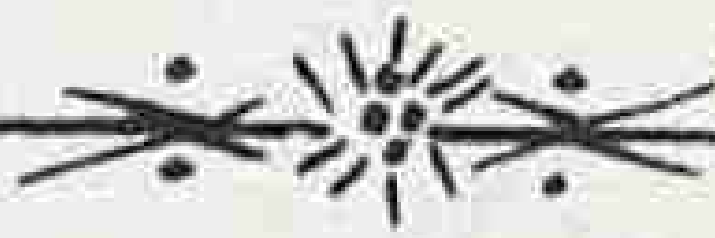
سورت کے عرب تاجر

سورت کو گجرات کی ایک اہم بندرگاہ ہونے کا فخر حاصل ہے ۔ سیاسی نقطۂ نظر سے کتب تواریخ میں اس کا نام بارھویں صدی سے ملتا ہے لیکن تجارتی مرکز کی حیثیت سے سولہویں صدی عیسوی سے اس کی اہمیت بڑھتی گئی ۔ یورپ سے پرتگالی ہند میں بہت پہلے سے موجود تھے ۔ سورت میں بھی یہ لوگ دھینگا مشتی کرتے تھے ۔ ۱۶۰۸ء میں کپتان ہاکنس ۱۶۱۲ء میں کپتان بسٹ اور ۱۶۱۵ء میں سر ٹامس رو لندن سے قافلے لے کر آئے ۔ پرتگیزوں اور انگریزوں میں تجارتی رقابت کی وجہ سے جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں ۔ آخر کار انگریزوں نے اپنے قدم جمالیے ۔

ان کی وجہ سے تجارت کو بہت فروغ حاصل ہوا ۔ یہ لوگ یہاں سے کپڑا اور دوسری اشیاء لے جاتے اور وہاں سے چاندی ، کانچ ، لوہا ، ہتھیار وغیرہ لاتے ۔ مغلوں کے عہد میں بعض اشیاء کے ٹھیکے شاہی خاندان کے افراد کے قبضہ میں تھے ۔

اگرچہ سورت آفاتِ سماوی و ارضی کا شکار رہا لیکن تجارت میں کمی نہیں آئی ۔ ایسے تو بیوپار روزگار میں تیزی مندی آتی ہی رہتی ہے ۔ مغل شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد میں گجرات و دکن میں بدامنی تھی ۔ اس کے متعلق ڈاکٹر ڈی ۔ بیتھ اپنے مقالہ

میں اورنگ زیب کے / THE COMMERCIAL POLICY OF THE MUGHAL باب (ص۲۳۵) میں رقمطراز ہیں کہ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں بیوپار کی حالت خراب تھی۔ اس امر پر بہت وضاحت کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے مگر بمبئی گزیٹیر (گجرات) (ص۹۸) میں بیان اس کے برعکس ملتا ہے۔ گزیٹر کی عبارت یہ ہے۔

IN SPITE OF THE FREQUENCY OF MAC ALLA ROADS UPON SURAT AND THE GROWING TRADE OF ITS CIVIL BOMBAY AURANG ZAIB'S REGION (1658-1707) EXCEPT THE FEW YEARS OF DISORDER AT ITS CLOSE WAS A TIME OF INCREASING WEALTH AND IMPORTANCE AT SURAT

گزیٹر (گجرات) کے ص۹۹ پر یہ تحریر ملتی ہے۔

THIS WAS THE TIME OF SURATS GREATEST COMMERCIAL PROSPERITY. IT WAS (1695) THE PRIME MART OF INDIA

۱۷۲۹ تا ۱۷۳۳ء سورت میں خانہ جنگیوں کا دور رہا۔ ایک حد تک بدامنی تھی تاہم بیوپار کو نقصان نہ پہنچا۔ بمبئی گزیٹر (گجرات) ص۱۱۲ پر یہ تحریر ہے۔

DURING THIS TIME INSPITE OF DISCORDERS, TRADE WOULD NOT SEEM TO HAVE SUFFERED.

سورت کی تجارت کی فراوانی کا بڑا سبب یہاں سے برآمدات تھا۔ ۱۶۳۰ تا ۱۶۹۰ء یہاں سے کارچوبی کپڑا، چاندی سونے کی بنی ہوئی اشیاء۔ ہیرا، موتی، مانک، عقیق اور دوسرے قیمتی پتھر، مشک، عنبر، سیماب، لاکھ، نیل، سوتی کپڑا، سیسہ، تانبہ، تھالیں ساٹن، ٹافیٹا، ہاتھی دانت کی بنی ہوئی اشیاء، صندل، مسالے وغیرہ سورت سے

برآمد ہوتی تھیں۔

اسی طرح باہر کی اشیاء بھی یہاں آتی رہی ہیں۔ قہوہ تو عرب اپنے ساتھ لائے۔ جس کا آج تک سورت میں خصوصاً رواج ہے۔ تمباکو اکبر کے عہد میں باہر سے ہند میں آیا۔ عام طور پر انگریز پائپ میں پیتے تھے۔ فتح اللہ شیرازی نے تمباکو کو حقہ میں پینے کا طریقہ ایجاد کیا۔ ان کے نام سے فتح پیچ کے نام سے ایک حقہ مشہور ہوگیا۔

چائے ۱۶۳۰ء میں چین سے ہند میں آئی۔ پہلے پہل شہر میں اس کی قدر و قیمت نہیں تھی۔ کمپنی کے ملازم پیتے تھے۔ ۱۶۳۵ء میں انگلینڈ میں چائے کا رواج ہونا شروع ہوا ۱۶۸۰ء میں ۱۴۳ پاؤنڈ چائے انگلینڈ بھیجی گئی تھی۔ مگر ۱۶۸۷-۹۰ تک تجارت کی اہم اشیاء میں شمار ہونے لگی اور ۱۶۹۰ اور اس کے بعد تقریباً ۱۴ ہزار پاؤنڈ چائے کمپنی نے سورت سے انگلینڈ کو برآمد کی [ل]

تجارت دانشمند اور حوصلہ مند تاجروں کی وجہ سے ترقی کرتی ہے اور تاجر تجارت کی فراوانی سے دولتمند بن جاتے ہیں۔ سورت میں عرب، ایرانی، ترک تاجر خصوصیت رکھتے ہیں۔ سورت میں ان کی اتنی کثرت تھی کہ ان کے محلّے مثلاً سوداگر واڑہ، ترکی واڑہ وغیرہ آباد تھے۔ جو آج بھی انہی ناموں سے مشہور ہیں مگر ترک، عرب، ایرانی نام کو نہیں ہیں۔ ہندوؤں میں آتارام بھوڑی والا، نگرسیٹھ وغیرہ وہ خاندان تھے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کو بڑی رقموں کی دھیر دھار کرتے رہتے تھے۔ اِس موقع پر تین مُسلم تاجروں کا ذکر ملاحظہ کیجیے۔ جو اپنے زمانے کے کروڑپتی تھے۔

شیخ خاندان:

اس خاندان کے بزرگ شیخ خواجہ عبداللطیف عبیدی البدوی بغدادی بغداد کے چیف جج تھے۔ وہ ۱۳۱۷ء میں ہند آئے اور سرخیز (قریب احمد آباد) میں سکونت اختیار کی۔ اس عہد میں شہرِ دالا پٹن گجرات کا صدر مقام تھا۔ موصوف سرخیز سے پٹن اٹھ آئے

ل English in western India. By Philip Anderson

یہاں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے حسن محمد نے تجارت شروع کی حسن محمد کے بعد ان کے فرزند ابو محمد اور پوتے محمد صالح نے تجارت کا سلسلہ جاری رکھا مگر محمد صالح کے فرزند بعہد احمد شاہ ثانی (۱۴۴۳ء) اعلا عہدہ پر فائز کیے گئے۔ اس رمز سے تجارت کا سلسلہ کم ہوگیا۔ یا بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد سے سلاطین گجرات اور مغل حکمرانوں کے عہد میں اس خاندان کا رسوخ بڑھتا گیا۔ اس خاندان کے بیشتر افراد حکومت کے اعلا عہدوں پر فائز رہے۔ شیخ محمد صالح کے فرزند شیخ عثمان، سلطان احمد شاہ (۱۵۶۱ء) کے عہد میں صوبے دار تھے۔ اُن کے فرزند شیخ صفی سیف خان بعہد جہانگیر ۱۶۱۳ء میں گجرات کے گورنر مقرر کیے گئے تھے۔ اور ان کے فرزند شیخ محمد ابن بعہد شاہجہاں ۱۶۳۷ء میں دو مرتبہ سورت کے متصدی کے عہدہ پر فائز رہے تھے۔ شیخ محمد صالح کے فرزند شیخ احمد کے انتقال کے بعد ان کے فرزند شیخ عبد المجید اور مجید کے فرزند شیخ حامد نے دوبارہ تجارت کا سلسلہ شروع کیا۔ تجارت میں اتنی ترقی کی کہ ۱۶۴۰ء میں ان کو خطاب عمدۃ التجّار اور ایک لاکھ محصول کی معافی کا پروانہ عنایت کیا گیا تھا۔ اس زمانہ میں یہ سات جہازوں کے مالک تھے۔

شیخ حامد بڑے علم دوست شخص تھے۔ انھوں نے اپنے ذاتی کتب خانہ میں تقریباً بیس ہزار کتابیں جمع کر لی تھیں۔ شیخ حامد نے ۱۷۰۲ء میں وفات پائی۔ ان کی عمر ۱۰۷ سال تھی۔ حامد کے فرزند شیخ محمد فاضل شیخ حامد کے جانشین ہوئے۔ بعہد اورنگ زیب ان کا خطاب اور مراعات قائم رکھی گئی تھیں۔ شیخ فاضل بھی والد کی طرح علم دوست تھے۔ انھوں نے تقریباً تین لاکھ روپیہ کی لاگت سے چالیس ہزار مخطوطے جمع کیے تھے۔ ان کو کسی کتاب کا پتہ چلتا تو ان کے کاتب اس ملک میں پہنچ کر کتاب کی نقل لاتے۔ موصوف قریب آٹھ دس مذہبی کتابوں کے مصنّف بھی ہیں۔ وہ شاعر بھی تھے۔ فاضل تخلص کرتے تھے۔ عربی، فارسی، اردو گجراتی میں شعر کہتے تھے۔ افسوس کہ ان کی شاعری کے نمونے نہ مل سکے۔

شیخ فاضل حج بیت اللہ سے واپسی پر اپنے فرزند شیخ سلیمان کی برات لے کر

جاہ وحشم کے ساتھ سورت سے احمد آباد جا رہے تھے۔ بڑودہ کے قریب برات پہنچی تھی کہ کولیوں نے حملہ کر دیا۔ ان کے بیٹے شیخ سلیمان اور شیخ محمد صدیق بچ نکلے اور چھوٹے بیٹے شیخ فاضل شہید ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حملہ حیدر قلی متصدی سورت کے ایماء پر کیا گیا تھا۔ شیخ فاضل کو حیدر قلی سے بعض مذہبی مسائل پر سخت اختلاف تھا۔ شیخ فاضل کو دوران حج میں یہ بشارت دی گئی تھی کہ ان کے لیے گجرات میں خلعت عطا ہونا مقرر کیا گیا ہے۔

اس واقعہ کے بعد شیخ سلیمان ہجرت کر کے عرب چلے گئے اور محمد صدیق نے سورت میں کاروبار سنبھال لیا تھا۔ شیخ محمد صدیق نے ۱۷۲۳ء میں انتقال کیا۔ ان کے بھائی شیخ محمود نے تجارت کی نگرانی کی۔ شیخ محمود نے چالیس ہزار روپیہ کی لاگت سے ایک عمارت بنوائی تھی۔ اس کا نام آئینہ محل تھا۔ اس موقع پر شیخ محمود نے نواب تیغ بیگ خاں کی پرتکلف دعوت کا انتظام کیا تھا اور نواب موصوف کو بطور نذرانہ ایک فیل پیش کیا تھا۔ شیخ محمود نے ۱۷۷۰ء میں انتقال کیا۔ ان کے فرزند شیخ حافظ بہادر صغیر تھے۔ لہذا شیخ صالح چلپی کو وصی مقرر کیا گیا۔ چلپی نے حافظ بہادر کی دولت اپنے قبضہ میں لے لی۔ چلپی بمرض فالج وفات پا گئے۔ لہذا شیخ بہادر کو دولت واپس نہیں ملی۔ شیخ بہادر نے ۷۳ سال کی عمر میں بہ سنہ ۱۸۲۹ وفات پائی۔ شیخ بہادر کے فرزند شیخ حامد ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے بعہدہ امینی مقرر کیے گئے تھے۔ شیخ حامد نے تیرہ سال خدمت انجام دینے کے بعد یہ اسامی اپنے فرزند شیخ رضی الدین عرف بخشو میاں کو دلوادی۔ شیخ حامد نے ۱۸۴۰ء میں وفات پائی۔

شیخ بخشو میاں نے ۱۸۴۹ء میں وفات پائی۔ بخشو میاں عالم و فاضل تھے۔ موصوف نے تاریخ سے متعلق دو ضخیم کتابیں حدیقۃ الہند اور حدیقہ احمدی یادگار چھوڑی ہیں۔ شیخ حامد کے دوسرے فرزند شیخ محمد فاضل عرف ڈوسو میاں بعہدہ منصف خدمت انجام دے کر ۱۸۷۹ انتقال کر گئے۔

احمد رضی الدین عرف بخشو میاں کے تین بیٹے تھے جو مختلف سرکاری ملازمتوں

سے منسلک رہے۔ اسوقت اس خاندان کے افراد بقید حیات ہیں۔

چلبی خاندان (چلبتی)

چلپی کا اصل وطن ترکستان ہے۔ لفظ چلپی بگڑ کر چلبی ہوگیا۔ جو آج رائج ہے۔ عالمگیر کے عہد حکومت میں ایک تاجر شیخ صالح بن درویش تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے تھے۔ انھوں نے قلیل عرصہ میں تجارت اور سیاست میں ناموری حاصل کرلی۔ مرکزی حکومت میں کافی اثر رسوخ رکھتے تھے۔ اسی طرح مقامی سیاست میں بھی بہت دخل رکھتے تھے۔ ان کو حکومت دہلی کی طرف سے خطاب عمدۃ التجار خلعت ایک لاکھ روپے محصول کی معافی اور دوسرے مراعات حاصل تھے۔ نواب تیغ بیگ خاں سے ان کی ان بن رہی لہذا آئینہ تاریخ کا بیان ہے کہ ان کو نواب نے ان کی حویلی[1] میں کولیوں کے ہاتھ سے قتل کرادیا جبکہ وہ اپنی داشتہ کے ساتھ دادعیش دے رہے تھے۔

حاجی صالح چلبی کے بعد ان کے فرزند شیخ احمد چلپی جانشین ہوئے۔ احمد چلپی بھی تجارت وسیاست میں دخل رکھتے تھے۔ صالح اور احمد دونوں بہت کروفر سے زندگی گذارتے تھے۔ اپنی ذاتی فوج کا دستہ بھی رکھتے تھے۔ نواب ان سے ناخوش تھا۔ لہذا گزیٹر کا بیان ہے کہ تیغ بیگ خاں نے احمد چلبی کو ان کی اپنی حویلی میں قتل کرادیا۔

احمد چلبی کے چار بیٹے قادر، کریم، صالح اور ابراہیم نامی تھے۔ قادر نے ۱۷۶۶ء میں وفات پائی۔ ان کی پوتی بنت محمود چلبی کی شادی ملّا خاندان کے عبدالمجید ابوالفتح سے ہوئی تھی۔ صالح چلبی دوم نے ۱۷۷۴ء میں وفات پائی۔

اس خاندان کی ایک حویلی محلہ سوداگر واڑہ میں تھی جہاں اب انگلو اردو ہائی اسکول کی عمارت ہے۔ اس کے سامنے ایک مسجد ہے جو چلبی کی مسجد کہلاتی ہے۔ اس پہ سنہ ۱۱۹۱ھ ہے۔ آج جس جگہ لائف انشورنس کمپنی ہے وہ چلبیوں کا دریا محل تھا

---

[1] یہ حویلی دریائے تپتی کے کنارے ہے۔ اسوقت اس کو سورت کے سشن جج کی رہائش گاہ بنادیا گیا ہے۔ یہ عدالت گھر کے سامنے ہے۔

ملا خاندان

سورت کا یہ تیسرا کروڑ پتی خاندان ہے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ عبدالغفور نامی نہروالا پٹن سے سورت آئے تھے۔ ان کے نسب نامے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر مفلسی نے ان کو وطن سے سورت آنے کی ہدایت دی۔ سورت میں مکتب میں پڑھا کر گذر بسر کرنا شروع کیا اسی وجہ سے ان کو ملا کہا جاتا تھا۔ جو اس خاندان کے افراد کے نام کا ایک جزو بن گیا۔

عبدالغفور دینی رجحان کے شخص تھے۔ ان کو اہل اللہ کی خدمت کا بہت شوق تھا ایک دفعہ کوئی مجذوب سے دوچار ہوئے تو ان کو گھر لائے۔ ان کی کئی دن خدمت کرتے رہے۔ ایک روز مجذوب اٹھے اور اپنا راستہ لیا۔ ملا صاحب بھی ان کے پیچھے چلتے رہے۔ ندی کے کنارے پہنچے تو مجذوب نے ان کو لوٹ جانے کو کہا مگر اس سے قبل ملا صاحب سے اپنا دامن پھیلانے کو کہا اور مجذوب نے اپنی کشکول سے ۱۹ دفعہ ریت ان کے دامن میں ڈالا اور کہا اتنا ہی تیرے نصیب میں ہے۔ مجذوب غائب ہوگئے۔ اور ملا صاحب ریتی وہیں پھینک کر لوٹ آئے۔

ملا صاحب کو تجارت کا شوق تھا۔ چھوٹا موٹا بیوپار کرتے رہتے ہوں گے ایک دفعہ ایک عرب تاجر کی کھجور کے بستے مرزا زاد بیگ کے جہاز میں سورت آرہا تھا۔ مالک تاجر راستہ میں فوت ہوگیا۔ اس کا مال کسٹم ہاؤس میں زکاۃ وصول کرنے کی بنا پر نیلام کیا گیا۔ ملا صاحب بھی بولی بولنے کے خیال سے کسٹم ہاؤس پہنچ گئے تھے۔ کھجور کے بستوں کو سمندر کا پانی لگ چکا تھا۔ اس لیے کسی نے توجہ نہیں دی مگر ملا صاحب نے سستے داموں مال خرید لیا۔ جب مال گھر لے جانے لگے تو نیچے سے جواہرات پائے گئے۔ ملا صاحب نے اس کو فروخت کر کے بڑے پیمانے پہ بیوپار شروع کیا۔

ملا صاحب تجارت میں قسمت لائے تھے۔ بہت قلیل عرصہ میں یعنی ۱۶۹۶ء تک وہ بڑے تاجروں کی صف میں آگئے[1]۔ تجارت میں فروغ کا یہ عالم تھا کہ وہ جہاز دلیا

---

[1] گزیٹیر

کے مالک ہو گئے۔ ان کے ۱۹ جہاز تھے۔ جب کبھی بیسواں جہاز بنواتے تو ایک ڈوب جاتا۔ یہی مجذوب کی پیشین گوئی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے رکارڈز میں تحریر ہے کہ ملّا صاحب کا مال سے لدا ہوا ایک ایک جہاز ہزاروں اور لاکھوں پاؤنڈ قیمت کا ہوتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی میں ان کی اور ان کے مال کی بہت ساکھ تھی۔ ملّا صاحب نے ۱۷۱۸ء میں انتقال کیا۔[1] رکارڈز سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶۶۰ء میں انھوں نے تجارت شروع کی تھی۔

ملّا صاحب کو تجارت میں مرکزی حکومت کی جانب سے خطاب عمدۃ التجار، خلعتِ فاخرہ، اور ایک یا سوا لاکھ کے محصول کی معافی نیز ان کو یہ بھی حق دیا گیا تھا کہ وہ اپنے مال کی ڈیوٹی خود حساب کر کے کسٹم ہاؤس میں جمع کر دیں۔

عبدالغفور کے فرزند عبدالحیُ باپ کی حیات میں انتقال کر گئے تھے۔ اس لیے عبدالحیُ کے فرزند محمد علی نے کاروبار سنبھال لیا۔ اسوقت حیدر قلی خاں متصدّی تھا۔ اس نے ملّا صاحب کے مال اسباب جائداد وغیرہ پر اس بہانے سے قبضہ کر لیا کہ ملّا عبدالغفور کی اولاد نہیں تھی۔ حیدر قلی نے ان کے گھر سے پچاسی[2] لاکھ روپیہ کو بھی قبضہ میں لے لیا تھا۔

ملّا صاحب دہلی گئے اور اپنے اثر رسوخ سے مقدمہ کا فیصلہ اپنے حق میں کرا لیا۔ دہلی سے حیدر قلی کے نام حکم صادر ہوا کہ تمام جائداد منقولہ و غیر منقولہ ملّا محمد علی کو لوٹا دی جائے۔

ایک دفعہ ملّا صاحب نے محصول کرنے کے سلسلہ میں متصدّی سے ناراضگی کا اظہار کیا۔ یہ بات اتنی بڑھی کہ ملّا صاحب نے سورت سے قریب گھوگا بندر کے قریب

---

[1] ایک جگہ سنہ وفات ۱۷۱۵ ملتا ہے۔

[2] پچاسی کو گجراتی میں پنچاسی کہتے ہیں۔ اس لیے آج تک یہ خاندان ملّا کے علاوہ پنچاسی والا بھی کہلاتا ہے۔

پیرام مقام پر قلعہ تعمیر کرانا چاہا مگر وہاں سانپوں کی کثرت ہونے کی وجہ سے خیال ترک کر دیا اور شہر سورت میں دریائے تاپی کے کنارے ایک گاؤں اٹھوا میں قلعہ کی بنیاد رکھی مگر متصدی سہراب خاں ابن رستم علی خاں نے کام رکوا دیا۔ اس بنا پر ملا صاحب نے قلعہ دار بیگدار خاں سے ساز باز کی کہ سہراب خاں کو ہٹا دیا جائے اور اس کی جگہ بیلگیہ خاں کے بھائی تیغ بیگ خاں کے نام سند متصدی گری منگوائی جائے۔ وقت مقررہ پر سہراب خاں کی حویلی پر توپ سے گولے برسانا شروع کیا۔ قلعہ کے میدان میں جنگ ہوگئی۔ ملا صاحب طے شدہ پلان کے مطابق آئے اور اس بات پر صلح کرا دی کہ دوبارہ دہلی سے سند منگوائی جائے اور اس قلعہ میں تیغ بیگ خاں انتظامی امور کی نگرانی کرے۔

اس کے بعد ملا صاحب نے قلعہ کو بھٹی کسٹم ہاؤس وغیرہ تعمیر کرانا شروع کیا۔ تیغ بیگ خاں نے اس کو اپنے لیے خطرہ سمجھ کر ملا صاحب سے تعمیر کا کام بند کرا دیا۔ اب ملا صاحب نے دوبارہ سہراب خاں سے ساز باز کی اور اس کے نام سند بھی منگوا دی اس طرح تیغ بیگ خاں کو ہٹنا پڑا۔ اب کی بار ملا صاحب نے قلعہ کو بھٹی وغیرہ تعمیر کرا لی۔ ملا صاحب کے کسٹم ہاؤس میں ڈیوٹی جمع ہوتی۔ اس طرح سورت کے خزانے کو نقصان ہونے لگا۔ سہراب خاں نے اپنے سرکاری کارکنوں کو ملا صاحب کے کسٹم ہاؤس میں رقمیں وصول کرنے کے لیے متعین کر دیا۔ ملا صاحب کو ناگوار گذرا تو دوبارہ بیلگیہ خاں سے ساز باز کر کے سہراب خاں کو بے دخل کر دیا اور تیغ بیگ خاں کے نام سند منگوا دینے کا وعدہ کیا۔

اس اثنا میں ملا صاحب کا خیال بدل گیا اور اپنے فرزند فخر الدین کے لیے خطاب فخر الدولہ، سند متصدی گری وغیرہ طلب کرنے کے خیال سے عریضہ لکھ کر قاصد کو دہلی روانہ کیا۔ اتفاق سے قاصد بھروچ کے قریب تیغ بیگ خاں کے طرفداروں کے ہاتھ پکڑا گیا۔

تیغ بیگ خاں نے ایک دن میلاد النبیؐ کا جلسہ رکھا۔ ملا صاحب کو بھی مدعو کیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد تیغ بیگ خاں نے ایک قرآن پاک ملا صاحب کو دیا کہ یہ ہم نے ان دنوں ہدیتاً لیا ہے۔ ملا صاحب نے جب ورق گردانی کی تو اس میں

دہلی بھیجا ہوا خط دکھیا۔ ادھر سے مانڈوی کا راجہ درجن سنگھ جو چھپا ہوا تھا۔ سامنے آیا۔ اور ملّا صاحب کا خنجر نکال لیا۔ ادھر دوسرے لوگوں نے گھیر لیا اور آخر ان کو قید خانہ میں بھجوا دیا۔

ملّا صاحب وہاں کب چین سے بیٹھنے والے تھے۔ زر کثیر کی رشوت دے کر کاغذ قلم منگوایا اور حیدر آباد آصف جاہ کو خط میں تفصیل لکھ بھیجی۔ آصف جاہ نے فوراً تیغ بیگ کے نام خط لکھا کہ فوراً ملّا صاحب کو رہا کر دیا جائے۔ تیغ بیگ خاں نے رہا تو کر دیا اور اعزاز کے ساتھ گھر بھیجا مگر زہر دے دیا تھا۔ نہ جانے پالکی میں سے یہ اترے یا ان کی نعش اتاری گئی۔ اس وقت سنہ ۱۷۳۳ء تھا۔ کسی نے تاریخ وفات کہی ہے

شہید از زہر مردانِ مکّار

عام طور پر مانا جاتا ہے کہ ان کی تعمیر کردہ مسجد[1] بہ مقام مغل سرائے حویلی کے سامنے دفن کیا گیا ہے مگر پروفیسر داس گپتا لکھتے ہیں کہ ان کو فرنچ رکارڈز سے یہ معلوم ہوا ہے کہ ان کو ان کے آبائی قبرستان، ہریادی دروازہ میں دفن کیا گیا ہے۔

ملّا محمد علی کے بعد ان کے خلف الرشید محمد حسین جدّہ سے آئے اور کاروبار سنبھال لیا اور دوسرے فرزند فخر الدین تیغ بیگ خاں سے پر خاش ہونے کی وجہ سے حیدر آباد آصف جاہ کے پاس چلے گئے۔ ۱۷۴۸ء میں جب وہاں سے لوٹے تو نواب تیغ بیگ خاں کے داماد سید اچھّن کے ہاتھ میں زمام حکومت تھی۔ ان سے بھی ان بن ہوئی تو فخر الدین کو قید کر دیا۔ فخر الدین کے ایک دوست کوٹھی دار مسٹر لام Lam ان کو رہا کرا لائے۔ فخر الدین نے آصف جاہ کو شکایت لکھ بھیجی تو آصف جاہ نے جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا۔

نہ تو نے گل کیا بلبل نہ تو نے باغباں اپنا
چمن میں کس بھروسہ باندھتی ہے آشیاں اپنا

---

[1] یہ مسجد محمد علی نے ۱۷۳۷ء میں تعمیر کرائی تھی۔ کمان پر یہ شعر تھا۔

دامن اصحاب بہ گیر دگو　　جامعہ معمور محمد علی امت ۱۷۳۷ء

ملا فخرالدین نے اس شعر کے جواب میں لکھا۔

بلبل بے کس کی گنجائش چمن میں کیونکر ہو
ایک تو صیاد تھا اور باغباں دشمن ہوا

فخرالدین شاعر تھے۔ مضطر تخلص تھا۔ ان کا دیوان پیر محمد شاہ لائبریری میں محفوظ ہے۔ فخرالدین رہا ہونے کے بعد بمبئی چلے گئے تھے اور ۱۴ سال کے بعد ۱۷۰۹ میں سورت لوٹے اور بھٹار مقام پر اپنی حویلی میں قیام پذیر تھے۔ فخرالدین نے ۱۷۸۷ء میں بمقام پونا وفات پائی۔ ان کے فرزند مجیدالدین ابوالفتح نے ۱۸۱۷ء میں انتقال کیا۔ ابوالفتح کے فرزند ملا قطب الدین بہت عیش پسند تھے۔ آخری جہاز فروخت ہونے پر روپیوں کے توڑے سامنے رکھے ہوئے تھے کہ ان کی داشتہ طوائف خورشید آگئی۔ اس سے کہا اگر تو یہ توڑے بیک وقت اٹھالے تو تجھے بخش دوں۔ خورشید نے تمام توڑے اٹھالیے اور گھر چل دی۔

قطب الدین علم دوست شخص تھے۔ وہ شاعری بھی کرتے تھے۔ قطب تخلص تھا۔ ان کا مجموعۂ کلام راقم کے پاس محفوظ ہے۔ قطب الدین نے ۱۸۶۸ء میں وفات پائی۔

برہانپور کا قلعہ اور اس کی تاریخ

نصیرالدین خاں فاروقی والیٔ خاندیس نے ۱۴۰۶ء میں شہر برہانپور بسایا تھا۔ ۱۶۰۱ء تک گیارہ فاروقی سلطانوں کا یہ شہر صدر مقام رہا۔ ۱۶۰۱ء میں اکبر نے اس کو اپنی قلمرو میں شامل کرلیا۔ ۱۷۲۰ء میں آصف جاہ دکن کی حکومت کا حصہ قرار پایا۔ اس کے بعد مرہٹوں اور انگریزوں کی عملداری رہی۔

فاروقی اور مغل اپنی تہذیبی و تعمیری بیسیوں یادگاریں چھوڑ گئے ہیں۔ فاروقی خاندان کے چوتھے فرماں روا عینا عادل شاہ متوفی ۱۴۹۱ء نے قیام حکومت کے پچاس سال بعد برہانپور میں ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ اس کو قلعہ 'ارک' کہتے ہیں۔ ارک ترکی لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں تاجپوشی کا قلعہ۔ مورخ خافی خان لکھتا ہے کہ شاہی خاندان کے لوگ سردی کا موسم اس قلعہ میں گذارتے تھے۔ آثر رحیمی میں ہے کہ قلعہ شہزادوں کی قیام گاہ تھا۔

قلعہ تاپتی ندی کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔ شہر کی سطح زمین ندی کی سطح سے ۸۰-۸۵ فٹ بلندی پر ہے۔ ندی کے پانی کو روکنے کے لیے ایک دیوار کنارے پر بنائی گئی ہے۔ اس کو نوگری کہتے ہیں۔ اس کی چوڑائی ۱۲ فٹ ہے۔ دیوار میں اندر زینہ ہے جو کسی محل تک

جاتا ہوگا۔ قلعہ جنوب شمال دو فرلانگ سے زائد اور مشرق و مغرب چوڑائی میں ایک ڈیڑھ فرلانگ ہے۔ مغربی رخ پر صدر دروازہ ہے۔

قلعہ کا ایک محل چاندنی محل کے نام سے ہے۔ یہ سات منزلہ عمارت ندی کی سطح سے اٹھائی گئی ہے۔ اس کی چار منزلیں نیچے اور سطح زمین سے اوپر تین منزلیں تھیں جو گر چکی ہیں۔ نیچے جانے کے لیے شمالی رخ پر زینہ ہے۔ ہر منزل پر سات سات در ہیں کہیں کہیں پچی کاری کے نقش و نگار نظر آتے ہیں۔ چوتھی منزل کی چھت پر میونسپلٹی نے باغیچہ بنوادیا ہے۔ عرف عام میں اس کو چاندنی ہی کہا جاتا ہے۔

چاندنی محل کے جنوب میں ندی کے رخ پر ہاتھی محل کے نام سے ایک عمارت تھی۔ اس کے آثار ہیں۔ اس سے لگا ہوا فیل خانہ تھا اور اس سے لگا ہوا قید خانہ تھا۔ قید خانہ کے پاس ۴×۴ فٹ رقبے کا ایک کنواں تھا جو پاٹ دیا گیا ہے۔ شاید موت کی سزا پانے والا اس میں پھینک دیا جاتا ہوگا۔ قید خانہ صرف ایک کمرہ تھا۔ اب مسمار ہو چکا ہے اس میں سیاسی قیدی بند کیے جاتے ہوں گے۔ جہانگیر کے باغی شہزادہ خسرو کو اسی جگہ رکھا گیا تھا۔ وہ اسی جگہ مر گیا۔ چھ ماہ بعد اس کی لاش الہ آباد کے خسرو باغ میں دفنائی گئی تھی۔

قلعہ کے جنوب و شمال کی حدوں پر ایک ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ جنوبی رخ کی مسجد محل سے متصل ہے۔ اس کا مینار لونگ کی شکل کا دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے اس کو لونگی مسجد کہتے ہیں۔ اس کی چھت دروازے ٹوٹ چکے ہیں۔ صرف محراب و ممبر والی دیوار کا کچھ حصہ قائم ہے۔ شمالی رخ کی مسجد محلات سے دور ہے۔ یہ عینا عادل شاہ کی یادگاروں میں سے ہے۔ اس کے مینار ٹھوس بنے ہوئے ہیں اور بالائی حصے سہ گوشہ الائچی کے مانند دکھائی دیتے ہیں اس لیے اس کو ڈورا مسجد کہتے ہیں۔

جب یہ قلعہ مغلوں کے قبض و تصرف میں گیا تو انھوں نے بھی اپنے ذوق کے مطابق کئی عمارتیں تعمیر کرائیں۔ مغلوں کی تعمیرات میں ایک عمارت جہانگیری حجروں کے نام سے ہے یہ حجرے چاندنی محل کے شمال میں واقع ہیں۔ ان کی چھتیں قبہ دار ہیں اور ان پر روشندان لگے ہوئے ہیں۔ یہ شہر کی جہانگیری سرائے سے بہت مشابہ ہیں۔ ۱۶۱۰ء میں انگلستان کا سفیر سرٹامس رو

سورت سے دہلی جاتے ہوئے برہانپور میں رکا تھا۔ سفیری قافلہ کو جہانگیری سرائے میں ٹھہرایا گیا ہوگا۔ مگر سمجھا جاتا ہے کہ اس کو جہانگیری حجروں میں ٹھہرایا گیا تھا۔ ٹامس رو اپنے سفری احوال میں لکھتا ہے کہ اس کے حجرے تنور کے مانند تھے۔ (مولوی ذکاء اللہ)

مغلیہ عمارتوں میں دولت خانہ خصوصیت رکھتا ہے۔ یہ محل ۱۶۱۷ء میں شاہجہاں نے تعمیر کرایا تھا۔ تاریخ کی کتابوں بادشاہ نامہ اور عمل صالح میں محل کی تعریف پائی جاتی ہے۔ یہ بھی مسمار ہو چکا ہے۔ آثار سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تین دالانوں پر مشتمل تھا۔ وسطی دالان کے شمال جنوب کمرے ہیں۔ ندی کے رخ پر باہر نکلا ہوا بالا خانہ تھا۔ اس میں درشنی جھروکہ تھا۔ اس کی چھت اور دیواریں گر چکی ہیں۔ صرف پشتہ باقی ہے۔ دالانوں کے نقش ونگار اور محرابوں سے اس کے حسن و جمال کا اندازہ ہو جاتا ہے محل کے جنوب میں زنانہ محل میں جانے کا راستہ ہے۔ ۱۶۲۰ء اور ۲۶ میں شاہجہاں نے اس محل میں دو دو سال قیام کیا تھا۔ فتح دکن کا جشن بھی اسی محل میں منایا گیا تھا۔ اسی تقریب کے موقع پر شاہجہاں نے برہانپور کو دارالسرور نام دیا تھا۔

دولت خانہ سے لگا ہوا زنانہ محل ہے۔ یہ بھی شکستہ حالت میں ہے۔ اس کے بعض آثار اس کے عدم وجود کا پتا دیتے ہیں۔ دونوں محلوں کے درمیان مشرق و مغرب ایک لمبی اور اونچی دیوار حد فاصل ہے۔ یہ محل لونگی مسجد تک پھیلا ہوا ہے۔ ندی کے رخ پر اس کے ایک دالان کی تین اونچی محرابیں اب تک حیرت میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی ہیں۔ یہ محل اہمیت رکھتا ہے۔ اس محل میں ممتاز محل قیام کرتی تھی۔ یہ شاہجہاں کی تین بیٹیوں کی جائے ولادت بھی ہے۔ روشن آرا، قدسیہ بیگم، اور گوہر آراء اس محل میں پیدا ہوئی تھیں (بادشاہ نامہ) گوہر آراء کی ولادت کے وقت اسی جگہ ممتاز محل کی وفات ہوئی تھی۔ عالمگیر کا شہزادہ معظم بھی اسی محل میں پیدا ہوا تھا۔ (بہ حوالہ جاوید انصاری)

زنانہ محل سے لگا ہوا ترکی حمام ہے۔ یہ لونگی مسجد کے مغرب میں تین کمروں پر مشتمل ہے پہلے کمرے کی دیواریں اور چھت منقش ہیں۔ بیل بوٹے اور رنگ روغن کچھ کچھ باقی ہیں۔ درمیان میں ایک حوض تھا۔ جو پاٹ دیا گیا ہے۔ دیواروں میں ماہی جال کی

سلیں نصب ہیں۔ نلوں میں سے پانی سلوں پہ آتا تھا۔ کمرے کے شمالی رخ پہ دروازہ اور روشندانیں ہیں۔ ان میں رنگین شیشے لگے ہوئے ہیں۔ اس کمرے کے مغرب میں لگا ہوا دوسرا کمرہ ہے۔ اس کا حوض بھی پاٹ دیا گیا ہے۔ دوسرے سے منسلک تیسرا کمرہ ہے۔ یہ سیدھا سادہ ہے۔ انگریزی عملداری میں اس کو ڈاک بنگلہ بنا دیا گیا تھا۔ اس وقت یہاں آثار قدیمہ کا دفتر ہے۔

قلعہ میں کوئی اور عمارتیں بھی ہوں گی۔ ان کے صرف بنیادی آثار نظر آتے ہیں۔ چاندنی محل کے شمالی رخ پر بھی ایسے آثار اور تہ خانے پائے جاتے ہیں۔ اس وسیع جگہ پر حکیمیہ بھائی اسکول واقع ہے۔ اب قلعہ میں بڑے بڑے میدان اور محلات کے کھنڈر باقی ہیں۔

یہ قلعہ رہائش اور تاجپوشی کا قلعہ تھا۔ سلاطین فاروقیہ، شاہان مغلیہ اور سرداران آصف جاہیہ نے اس قلعہ میں داد عیش دی، مسرت کے جشن منائے، بہادروں، سیاستداں خصوصی مہمانوں کو خلعت سے نوازا۔ جنگ و صلح کے منصوبے بنائے۔ قلعہ نے شہزادوں اور شہزادیوں کی ولادت کی شبھ گھڑیاں دیکھیں اور وفات حسرت آیات کے منحوس صبح و شام بھی دیکھے۔ آج اس کو خلقت دیکھنے آتی ہے۔ کیونکہ اس کی ہر اینٹ اور کھنڈروں کا ہر منظر ماضی کے جاہ و جلال کی تاریخ کا ایک ورق ہے۔

قلعۂ آسیر

عہد قدیم میں سیاسی جنگوں اور فتح و نصرت کے سلسلہ میں گڑھ یا قلعہ کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ حملہ آور جب تک قلعہ پر قبضہ نہ کرلے وہاں تک اس کی فتح کا ڈنکا نہیں بج سکتا تھا۔ اسی مناسبت سے اردو زبان میں کئی محاورے زبان کے خزانے میں داخل ہو گئے ہیں۔ جیسے قلعہ جیتنا یا سر کرنا۔ گڑھ مارنا۔ قلعہ بند ہونا۔ ہوائی قلعہ بنانا وغیرہ عام طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔ موجودہ دور میں اس کی پہلی سی اہمیت ختم ہو چکی ہے۔ اب یہ قلعے ماضی کی شان و سطوت کی تاریخی و تہذیبی شہادتوں کے طور پر آثار قدیمہ کی حیثیت سے اہمیت رکھتے ہیں اور سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہیں۔ ہندوستان میں چھوٹے بڑے سیکڑوں قلعے ہیں۔ ان میں چند مشہور عالم قلعے، آگرہ کا قلعہ، دہلی کا لال قلعہ، گوالیار کا قلعہ، چیتوڑ کا قلعہ، رہتاس کا قلعہ، دولت آباد کا قلعہ دیکھ کر اور ان سے متعلق سن کر ماضی کا جاہ و جلال، ان کی تعمیراتی کاریگری و صناعی، بانیوں کے طرز فکر اور ذہنی اُپج کا تصور حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ ہندوستان کے چھوٹے موٹے قلعوں کو سرکاری دفتر دں کے استعمال میں لے لیا گیا ہے۔

مدھیہ پردیش میں بھی کئی قلعے ہیں ان میں آسیر اور برہانپور کے قلعے آپ اپنی نظیر

ہیں۔ اگرچہ یہ قلعے مسمار حالت میں اس وقت اپنے وجود کو قائم رکھے ہوئے ہیں تاہم ان کی تاریخی و تعمیری اہمیت دلچسپی سے خالی نہیں۔ قلعۂ آسیر برہانپور سے چودہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

قلعۂ آسیر

قلعۂ آسیر کی قدیم تاریخ پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس کی بنیاد کس نے رکھی اور کب یہ وجود میں آیا ان اطلاعات سے تاریخ کی کتابیں خالی ہیں۔ بعض مورخین نے عوام میں سینہ بہ سینہ بیان کردہ افسانوں حکایتوں کی بنیاد پر قلعہ کی تاریخ کی بنیاد رکھی ہے۔ اور بعضوں نے اس کے مورخوں کے بیانات نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ لہٰذا قلعہ کی ابتدائی تاریخ پر خاطر خواہ روشنی نہیں پڑتی۔ اس دور کے مورخ محمد قاسم فرشتہ اور ابوالفضل مستند مانے جاتے ہیں لیکن یہ بھی ایسے سرسری گذر گئے ہیں کہ بعض اہم معلومات میں گڈ مڈ پایا جاتا ہے۔

قلعہ کے وجود میں تو کوئی شک و شبہ نہیں لیکن اس کا ابتدائی زمانہ متعین کرنا بہت دشوار امر ہے۔ بعض تاریخی حوالوں سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ قلعہ آٹھویں سے تیرہویں صدی عیسوی تک ٹانک اور راجپوت راجاؤں کے قبضہ میں رہا تھا۔ ایک حوالہ ملتا ہے کہ علاءالدین خلجی نے ۱۲۹۵ یا ۹۶ء میں دیوگری سے لوٹتے ہوئے آسیر پر حملہ کیا تھا اور اپنا اقتدار منوا کر چلا گیا۔ تاریخ فرشتہ، دہلی سلطنت از ایس سی گپتا وغیرہ میں اس حملہ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ ممکن ہے دکن، مالوہ، گجرات کی مہموں کے دوران لگے ہاتھوں حملہ کر دیا ہوگا یا پھر کسی اور مسلم سلطان نے اس پر ڈورے ڈالے ہوں گے۔ کہتے ہیں اس حملہ کے وقت ایک راجپوت بچہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوا۔ اس کا نام رائے سین تھا۔ اس کی سترہویں پشت میں ایک شخص راؤ رتن نامی تھا۔ جو شاہجہاں کی ملازمت میں تھا۔ اس نے برہانپور کے قریب شہزادہ خرم نے بغاوت کی تھی۔ اس کو شکست دے کر اپنی نمک حلالی کا ثبوت دیا تھا۔ راؤ رتن کو اس کے صلہ میں برہانپور کا صوبہ دار بنایا گیا تھا۔ راؤ رتن تادم آخر اس عہدہ پر فائز رہا۔ محلہ رتن پورہ برہانپور میں اس کے محل کے آثار موجود ہیں۔

اس مسلم حملہ کے بعد ایک سو سال کی تاریخ ناپید ہے۔ قیاس غالب ہے کہ کسی زمیندار نے اپنے قبض و تصرف میں اس قلعہ کو رکھا ہوگا۔ کیونکہ اس قلعہ کے اطراف و اکناف میں اہیر قوم کے زمینداروں کا پھیلاؤ تھا۔ ایسا ہی ایک زمیندار آسا اہیر اس قلعہ میں بودوباش کرتا تھا۔ یہ بہت بڑا زمیندار تھا۔ اس کے پاس بے شمار دولت اور ہزاروں کی تعداد میں ڈھور ڈنگر تھے۔ قیاساً کہا جاتا ہے کہ آسا نے قلعہ کے دامن میں وسیع رقبہ کو اپنے کام میں لیا ہو۔ کیونکہ ہزاروں جانوروں کو ایک بلندی پر مقید نہیں رکھا جا سکتا۔ خاندیس کے سلطان نصیر خاں فاروقی نے ۱۴۰۱ء میں اس قلعہ کو آسا اہیر سے ہتھیا لیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ نصیر خاں نے آسا اہیر کو پیغام بھیجا کہ میں جنگ و جدل میں مصروف رہتا ہوں اور اندیشہ ہے کہ غنیم میری مملکت پر حملہ کر دے لہذا میری خواہش ہے کہ میری بیگمات کو تمہارے قلعہ میں ٹھہرا دوں۔ آسا نے یہ منظور کیا۔ نصیر خاں نے ابتدائی چند ڈولیوں میں ایک دن چند مستورات کو قلعہ میں پہنچایا اور دوسرے دن سپاہیوں کو ڈولیوں میں روانہ کیا گیا۔ سپاہیوں نے قلعہ میں باہر نکل کر قتل و غارتگری شروع کر دی اس طرح قلعہ نصیر خاں کے قبضہ میں آگیا۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ نصیر خاں کے سپاہیوں نے صرف مولیشیوں کو مارا۔ یہ بات گلے سے نہیں اُترتی۔ سپاہی مویشی مارنے نہیں گئے تھے۔ اور وہ بھی ہزاروں کی تعداد میں مویشی تھے۔ ان کو مارنے سے کوئی خاص فائدہ نہ تھا۔

قلعہ پر کئی بار حملے ہوئے لیکن حقیقت میں وہ ناقابل تسخیر ثابت ہوا۔ مالوہ کا حاکم محمود خلجی ۸۶۶ھ میں دکن کی مہم پر جا رہا تھا۔ اس اثنا میں اطلاع ملی کہ حاکم برہانپور مبارک شاہ فاروقی فوت ہوگیا ہے اور اس کی جگہ عادل خاں تخت نشین ہوا ہے۔ عادل خاں نے دو سیّد برادروں کو ناحق قتل کرا دیا تھا۔ ان کا تیسرا بھائی محمود خاں کے دربار میں پہنچا اور قصہ سنایا تو عادل خاں کی تنبیہ کے ارادے سے اس نے آسیر پر حملہ کر دیا۔ عادل خاں نے مصلحتاً صلح کر لی اور اپنے گناہ کی معافی چاہی۔ محمود خاں بھی عازمِ دکن تھا۔ لہذا اس نے سخت قدم نہیں اُٹھایا۔ عرب سیاح

ظفرالدولہ نے اپنی تصنیف میں اس طرح بیان کیا ہے کہ محمد خلجی نے آسیر کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ ایک رات اس کی آنکھ کھلی اور صبح کا ستارہ جھلملاتا آسمان پر دیکھا تو خادم سے وضو کے لیے پانی لانے کو کہا۔ خادم نے عرض کی کہ حضور! ابھی تو آدھی رات ہوئی ہے۔ آپ جس کو صبح کا ستارہ سمجھ رہے ہیں وہ تو آسیر کے قلعہ کا چراغ ہے۔ سلطان نے غور کیا اور بعد میں یہ کہہ کر محاصرہ اٹھا لیا کہ جس قلعہ کا چراغ آسمان کا ستارہ نظر آئے وہ قلعہ فتح نہیں ہو سکتا۔

ظفرالدولہ نے سلطان محمد کو لکھا ہے لیکن وہ محمود ہونا چاہیئے۔ اس عہد میں مالوہ سے سلطان محمود ہی عازم دکن ہوا تھا۔ (بہ حوالۂ برہانپور درشن ہندی)

اکبر اعظم بھی قلعہ آسیر فتح نہ کر سکا تھا۔ کیونکہ حالات ایسے پیش آئے اور سلطان بہادر خاں کی نااہلی کی وجہ سے قلعہ مغلوں کے قبض و تصرف میں چلا گیا ۱۰۰۸ھ میں اکبر مالوہ آیا۔ خانخاناں اور شہزادہ دانیال کو دکن کی مہم پر روانہ کیا۔ دیکھا کہ بہادر خاں قلعہ سپرد کرنے اور اطاعت سے منہ موڑ رہا ہے اور کج روی دکھلا رہا ہے تو اکبر خود برہانپور آگیا اور وہاں سے قلعۂ آسیر کے محاصرہ کا حکم دیا۔ اسوقت بہادر خاں قلعہ بند پڑا ہوا تھا۔ اکبر نے کوشش کی کہ اس کو سمجھا بجھا کر راہ پر لایا جائے لیکن بہادر خاں نہ مانا چونکہ اس نے دس سال کافی ہو، اتنا ذخیرہ خورد و نوش کا قلعہ میں بھر رکھا تھا۔ محاصرہ میں دس ماہ رہا مگر کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ قلعہ میں غلہ اور دیگر اشیائے خوردنی سڑ رہی تھیں۔ یہ افواہ بھی پھیل گئی کہ اکبر نے عاملوں کو عمل تسخیر کرنے کا حکم دیا ہے اور خود بھی کوئی شمسی عمل کر رہا ہے۔ جس کی وجہ سے قلعہ میں جان و مال کا نقصان ہو رہا ہے۔ لوگ بددل ہوتے جا رہے تھے اور امراء کو بھی زر و مال دے دے کر طرفدار بنایا جا رہا تھا۔ دوسری طرف ابوالفضل نے اکبر سے اجازت لے کر حملہ کا منصوبہ بنایا۔ اس نے سرداروں کو جمع کر کے کہا کہ میں جب مالی گڑھ پر قبضہ کر لوں اور قرنا بجائی جائے تو تم لوگ بھی ہر طرف سے حملہ کر دینا۔ اس منصوبہ کے مطابق ایک اندھیری رات میں ساپن پہاڑی پر سے سپاہیوں کو مالی گڑھ پر چڑھانا شروع کیا۔ سپاہیوں نے مالی گڑھ کے دروازہ پر جا لیا۔ ابوالفضل

خود بھی پہاڑی پر سے چڑھ کر پہنچ گیا اور قرنا کی آواز سنتے ہی سرداروں نے بھی دھاوا بول
دیا۔ جب مالی گڑھ پر قبضہ ہوگیا۔ تو بہادر خاں کو بھی فکر لاحق ہوئی۔ اس نے مشیروں کو
بلاکر مشورہ کیا اور قلعہ اکبر کو دینا طے پایا۔ بہادر خاں اکبر کی حضور میں پیش ہوا۔ اس وقت
قلعہ دار کو حکم کیا گیا کہ وہ قلعہ کی کنجیاں حوالے کردے۔ اکبر بہادر خاں کو اپنے ساتھ لاہور
لے گیا۔ بہادر خاں اور اس کے بیٹوں کے لیے وظیفے مقرر کر دیے گئے۔ بہادر خاں نے
سنہ ۱۰۳۳ھ میں بمقام آگرہ انتقال کیا۔

آزاد نے دربار اکبری میں تحریر کیا ہے کہ قلعہ کی کنجیاں ایک نمک حلال حبشی غلام
کے پاس رہتی تھیں۔ نابینا تھا۔ اس کے بیٹے مختلف برجوں کے چارج میں تھے جب
اس نے سنا کہ قلعہ اکبر کے حوالے کردیا گیا تو اس کا دم نکل گیا اور اس کے بیٹوں نے افیون
کھاکر خودکشی کرلی۔

قلعہ آسیر برہانپور کھنڈوا کے راستہ پر برہانپور سے چودہ میل کے فاصلہ پر ہے۔
یہ ست پڑا پہاڑ کی سلسلہ کی ایک چوٹی پر واقع ہے۔ اس کا طول وعرض
فٹ ہے۔ اس کے اردگرد چٹانیں دیواروں کا کام دیتی ہیں۔ اس کو تین حصوں میں
تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ نیچے کا حصہ مالی گڑھ کہلاتا ہے یہ بھی سطح زمین سے بلندی پر ہے
اس کی دیوار پہاڑیوں کی قطاریں ہیں۔ اس کا ایک دروازہ ہے اس کی ایک طرف
چھوٹی سی پہاڑی ہے اس کا نام ساپن ہے۔ مالی گڑھ بھی ایک قلعہ ہے۔ مالی گڑھ عینا
عادل شاہ فاروقی نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کا دور حکومت ۸۶۱ھ/۱۴۵۷ء تا ۹۰۷ھ/۱۴۹۱ھ تھا۔

مالی گڑھ سے اوپر کمرگاہ یا کمرگڑھ کے نام سے مشہور ہے۔ تیسرا حصہ اصل قلعہ ہے
قلعہ میں داخلہ کا پہلا دروازہ مالی گڑھ میں ہے اس طرح قلعہ تک پہنچنے کے لیے سات
دروازے ہیں۔ مالی گڑھ سے اوپر تک ایک فصیل درمیان سے چلی جاتی ہے۔ مالی سے اوپر
تک زینے بنے ہوئے ہیں۔ مالی گڑھ کے پہلے دروازہ کے پاس ایک چٹان پر اکبر،
دانیال اور اورنگ زیب کے کتبے نصب کیے گئے ہیں۔ قلعہ میں جانے کا دوسرا راستہ
شمال میں ہے۔ یہ راستہ پہاڑی کنارہ پر سے گذرتا ہے۔ چھکڑے اور گاڑیاں وغیرہ اس

راستہ سے اُوپر جاتی ہیں ۔ اوپر کے قلعہ میں مدار کا چلّہ ہے ۔ ایک بڑا دروازہ ہے ۔ اس کو مدار دروازہ کہتے ہیں ۔ چونکہ وہاں شاہ مدار کا چلّہ ہے ۔ اندر داخل ہونے پر تین طرف اوپر نالے نالیاں دیوار میں بنی ہوئی نظر آتی ہیں ۔ ان سے دشمن کے داخل ہوتے ہی سپاہیوں پر سیسہ تیل وغیرہ گرم کر کے ڈالا جاتا تھا ۔ گویا دشمن کے سپاہی موت کے دروازہ میں داخل ہوتے تھے ۔

قلعہ میں اندر ہزاروں کی فوج کے رہنے کا انتظام تھا ۔ وہاں پانی کے ذخیرے اور چشمے ہیں ۔ قلعہ کے محلات تو مسمار ہو گئے ہیں ۔ لیکن مسجد اور مندر باقی ہیں ۔ مغرب کی طرف کالے پتھر کی وسیع مسجد ہے ۔ یہ مسجد عینا عادل شاہ کی یادگار ہے ۔ اس مسجد کے دو مینار ہیں جو دُور سے نظر آتے ہیں ۔ اِس مسجد میں بھی پانی کا بڑا ذخیرہ مَوجُود ہے ۔ قلعہ میں ایک طرف شیو مندر ہے یہ ایک صاف ستھرے کمرے میں ہے ۔ ان کے علاوہ قید خانہ سولی کا لکڑا وغیرہ ہیں ۔ پانی کا ایک چشمہ گنگا جمنا کہلاتا ہے ۔ اتنی اوپر پانی کے چشموں کا دستیاب ہونا حیرت میں ڈال دیتا ہے ۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ اکبر نے دانیال کو لکھا تھا کہ اس مسجد کو منہدم کر کے وہاں مندر بنوایا جائے ۔ لیکن دانیال نے اس حکم پر توجہ نہیں دی ۔ قلعہ اورنگ زیب ، کے قبضہ میں رہا لیکن اس نے شیو مندر کو منہدم کرنے کا خیال تک نہیں کیا ۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ سنہ ۱۰۲۳ھ میں اس نے بذات خود قلعہ دیکھا تھا ۔ لکھتا ہے کہ قلعہ میں عالی شان محلات ، باغات اور چشمے ہیں ۔ کسی نے فرشتہ سے دریافت کیا کہ ہند میں اس سے بڑا قلعہ کہیں دیکھا ہے ۔ فرشتہ نے جواب دیا کہ رہتاس کا قلعہ اس سے کہیں زیادہ بڑا ہے ۔

لطف اللہ

لطف اللہ بن محمد اکرم بن عبدالغنی دھارا نگر، مدھیہ پردیش کے مشائخ زادہ تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب پندرہ واسطوں سے بابا فرید گنج شکر اور بارہ واسطوں سے شاہ کمال الدین مالوی تک پہنچتا ہے[1] بابا فرید کی اولاد میں پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ بابا کے خلف الرشید کا نام شیخ نصیر الدین نصر اللہ تھا اور ان کے فرزند شیخ بایزید تھے۔ شاہ کمال مالوی، شیخ بایزید کے فرزند ارجمند تھے[2] شاہ کمال سلطان الاولیا حضرت نظام الدین کے مقرب و عزیز خلیفہ تھے۔ حضرت نظام الدین نے شاہ کمال کو مالوہ جاکر رشد و ہدایت کی خدمت کا حکم دیا[3] مالوہ میں سلسلۂ چشت کو پھیلانے والوں میں شاہ کمال کو اوّلیت کا فخر حاصل ہے۔ مالوہ کے خلجی سلاطین اس خاندان کے عقیدت مند تھے۔ شاہ کمال سلطان محمد خلجی کے استاد و مرشد تھے[4] محمد خلجی کا عہد ۱۴۳۴ء تا ۱۴۷۰ء تھا۔ سلطان محمد خلجی متوفی ۱۵۳۰ء نے شاہ کمال کی قبر پر گنبد اور خانقاہ بھی تعمیر کرائی تھی۔ سلطان محمود نے خاندان کے لیے ۳۰۰۰ ایکڑ زمین بطور وظیفہ اور ایک روپیہ یومیہ عنایت کیا تھا۔ شاہی امداد کا سلسلہ ۱۷۰۶ء یعنی مالوہ کا مراٹھوں کے قبضہ و تصرف میں آنے تک قائم رہا[5]

---

[1] خود نوشت سوانح عمری۔ انگریزی۔ از لطف اللہ [2] سوانح اور تاریخ مشائخ چشت۔ از خلیق احمد نظامی اور گلزارِ ابرار [3] تاریخ مشائخ چشت و گلزارِ ابرار۔

[4] سوانح [5] سوانح۔

اس خاندان کے چشم و چراغ لطف اللہ بہ مقام دھار (مدھیہ پردیش) بتاریخ ۷، رجب ۱۲۱۷ھ مطابق ۴، نومبر ۱۸۰۲ء پیدا ہوئے تھے[1]۔ لطف اللہ کے والد محمد اکرم نے تین شادیاں کی تھیں۔ لطف چار سال کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا[2]۔ لطف بہت ذہین و ذکی تھے۔ آٹھ سال کی عمر تک عربی و فارسی کی ابتدائی درسی کتابیں پڑھ چکے تھے[3]۔

لطف بہت من چلے اور دُھن کے پکّے تھے۔ ایک دفعہ کوئی شخص ان کے گھر مہمان تھا۔ نہ جانے کیا بات ہوئی تھی کہ نیند میں لطف نے ان کی داڑھی جلادی۔ یہ بات لطف کے استاد تک پہنچی۔ استاد نے ان کو خوب مارا پیٹا۔ اس واقعہ کے وقت لطف کی عمر پانچ سال تھی۔ اتفاق سے ایک روز ان کے استاد نے گھر سے قہوہ لانے کو کہا۔ لطف گھر گئے اور قہوہ لے آئے۔ لیکن راستے میں قہوہ میں جمال گوٹہ ملادیا۔ استاد کی حالت خراب ہوگئی۔ اس روز سے استاد ان سے بہت ہی شفقت سے پیش آنے لگے[4]۔

محمد اکرم کے بعد سجادہ نشینی کے حق دار لطف تھے۔ لیکن لطف کی صغر سنی کی وجہ سے ان کے چچا جائداد، آمد وغیرہ کی دیکھ بھال کرتے تھے[5]۔ لطف کے چچا ان کی والدہ کو خرچ کے لیے ناکافی رقم دیتے تھے۔ لہٰذا لطف کے ماموں جو کاتب تھے ان کے ساتھ کام کرتے رہتے[6]۔ لطف کے چچازاد بھائی بہت حاسد تھے اور ان کی جان کے درپے تھے۔ ایک دفعہ ان کے بھائی ان کو تالاب پر نہانے کے بہانے سے لے گئے اور موقع پاتے ہی ان کو غرقِ آب کردینے کی کوشش کی۔ تالاب کے سامنے ایک مندر تھا۔ اس کا پجاری یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ دوڑا گیا اور لطف کو پانی سے نکال لایا۔ فوری علاج کیا اور جب ان کی طبیعت سنبھلی تو پجاری انھیں مندر میں لے گیا اور کہا کہ اب سر جھکا بُت کے سامنے اور پوجا کر[7]۔

عُسرت کی زندگی اور آئے دن کی دانتا کل کل کی وجہ سے لطف کی والدہ عقدِ ثانی پر رضامند ہوگئیں۔ دولت راؤ سندھیا کی ماں کے ایک مسلم فوجی صوبے دار سے ان کا عقد کر دیا گیا تھا۔ لطف، ان کی والدہ اور سوتیلے باپ صوبے دار کے ہمراہ اُجین آگئے تھے۔ اس وقت لطف کی

---

[1] سوانح ۔ [2] سوانح ۔ [3] سوانح ۔ [4،5،6،7] سوانح ۔

عمر دس سال تھی۔ صوبے دار لطف سے خوش نہ تھا۔ لطف بھی اس سے چھٹکارا پانے کی فکر میں تھے۔

اُجین میں سندھیا کی ماں مرگئی تو وزیر کے حکم سے محل یا حویلی کو فوجیوں نے دھاوا بول کر لُوٹ مچا دی۔ اس کے بعد صوبیدار لطف اور ان کی والدہ گوالیار آ گئے تھے۔ گوالیار میں صوبیدار نے انھیں کسی بات پر مارا پیٹا تو وہ گھر سے بھاگ نکلے۔

راستہ چلتے چلتے مغرب ہو چکی تو ایک قصبہ کے قریب ایک غیر آباد مسجد میں رات بسیرا کیا۔ آدھی رات گزرنے پر ایک شخص آیا اور لطف کو لات مار کر اُٹھایا اور پکانے کی چیزیں دے کر کہا۔ کھانا پکا۔ لطف نے آگ جلائی اور پکاتے پکاتے معلوم کر لیا کہ وہ کون ہے۔ لطف نے اپنی ایک انگلی کاٹ لی تھی کہ درد کی وجہ سے نیند نہ آجائے۔ وہ شخص اس زمانے کا مشہور ٹھگ جمّا تھا۔ صبح اندھیرے منھ لطف وہاں سے بھاگ نکلے اور قصبے کے تھانے میں اطلاع کر دی۔ انھیں اطلاع دینے پر انعام بھی ملا تھا۔

لطف آگرہ پہنچے اور وہاں ایک طبیب سے پانچ سال طب سیکھی اور اُجین لَوٹ آئے۔ اجین میں ۱۸۱۷ء میں مارچ تا دسمبر اپنی والدہ کے پاس رہے۔

ایک دفعہ اُجین میں لطف نے افغانوں کا ایک پڑاؤ دیکھا۔ جو دکن جا رہا تھا۔ لطف کو پھر قصدِ سفر نے گدگدایا۔ وہ اس گروہ کے سردار موسیٰ خان سے ملے اور ہم سفری کی خواہش ظاہر کی۔ سردار موسیٰ خان نے ان کو دس روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا۔ جب پڑاؤ اٹھا اور منزلیں طے کرتا ہوا پہاڑیوں کے اندر گیا تب لطف کو معلوم ہوا کہ وہ ڈاکوؤں کا گروہ ہے۔ وہاں سے چھٹکارا آسان نہ تھا۔ لہٰذا موقع کے منتظر رہے۔ روزانہ صبح کے قریب میں ایک کنویں پر جاتے، وضو بناتے اور نماز پڑھ کر گڑگڑا کر نجات کے لیے دعا مانگتے۔ ایک دن افغانوں نے بھیل ڈاکوؤں کو کھانے کی دعوت دی۔ دعوت میں خوب شراب پی گئی۔ اور ان میں اتنا جھگڑا ہوا کہ مار پیٹ، مار کاٹ تک نوبت پہنچی۔ لطف موقع پاتے ہی وہاں سے نکل بھاگے۔ کافی فاصلہ دوڑتے بھاگتے طے کر کے دَم لیا۔ مغرب کے وقت لطف نے درندوں سے محفوظ رہنے کے خیال سے اپنی پگڑی کے دونوں سرے شاخوں سے باندھ کر جھولی بنالی اور جھاڑ پر رات بسیرا کیا۔ صبح سویرے پھر چلنا شروع کیا۔ قریوں

قصبوں سے گزرتے ہوئے وہ حاصل پور پہنچے۔ حاصل پور میں ان کے ایک استاد نصر اللہ کے گھر گئے۔ وہاں سے وہ اُجین جانا چاہتے تھے، مگر ان کے استاد نے اطلاع دی کہ ان کی والدہ اندور میں ہیں۔ لطف اندور پہنچے۔ ان کی والدہ بیمار تھیں۔ لطف نے زیور اور دوسرا اثاثہ بیچ دیا اور والدہ کو دھار لے گئے، جہاں محترمہ کا انتقال ہو گیا۔

۱۸۱۸ء میں ایک نیٹیو ایجنٹ نجف علی خاں کی سفارش سے لطف کو پوسٹ آفس میں کلرک کی اسامی مل گئی۔ دورانِ ملازمت لطف کو فوجیوں کے ہمراہ کچھ، مانڈوی، سندھ نگر پارکر کی سیر کرنے کا موقع مل گیا۔ نومبر ۱۸۲۱ء میں گھومتے پھرتے گھوگا بندر آگرڑ اور گھوگا سے صورت پہنچے۔ رات ہو چکی تھی۔ جہاز سے اتر کر قریب کی ایک مسجد میں ٹھہر گئے۔ یہ مسجد ندی کے قریب ہی ہے۔ مسجد شاہ نور اللہ کی مسجد کہلاتی تھی۔ اب اس کو بوٹا والا کی مسجد کا نام دیا گیا ہے۔ یہ موجودہ گاندھی باغ کے قریب واقع ہے۔ صبح صبح انھوں نے دف بجنے کی آواز سنی اور باہر آئے اور لوگوں سے دریافت کرنے پر انھیں معلوم ہوا کہ سورت کے نواب نصیر الدین کا انتقال ہو گیا ہے اور علم جا رہے تھے۔ لطف سورت میں چند روز قیام کر کے بھڑوچ، بڑودہ ہوتے ہوئے دھار لوٹ گئے۔

پالو میں جکّہ تھا۔ ۱۸۲۳ء میں دوبارہ سورت آئے اور سورت سے جہاز کے ذریعہ بمبئی گئے۔ (بمبئی سے الہ آباد تک ریل گاڑی ۱۸۰۲ء کے لگ بھگ چلنے لگی تھی) بمبئی میں ذکریا مسجد میں قیام کیا۔ ایک دفعہ ایک مسافر مسجد میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا کہ روز رات کو ایک شخص آتا ہے اور مسافروں کے لیے مطلوبہ چیزیں بازار سے لا دیتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مسافروں کی مٹھی چاپی بھی کرتا ہے۔ مسافر حسنِ انتظام سے متاثر ہوا اور ذکریا سیٹھ کے متعلق خادموں سے دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ ذکریا سیٹھ کی پیڑھی قریب ہی میں ہے، مسافر اُن سے ملنے گیا اور دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا کہ ذکریا سیٹھ وہی ہیں جو رات کو مسافروں کی خدمت کرتے ہیں۔ مسافر نے اس خدمت کی وجہ دریافت کی تو جواب دیا کہ میں اپنی نجات کے لیے کرتا ہوں۔

مارچ ۱۸۲۳ء میں لطف اللہ بمبئی سے ستارا گئے۔ ستارا میں بھی فوجی افسروں کو ہندوستانی سکھلاتے تھے۔ وہاں ایک میمن عورت سے انھوں نے نکاح کر لیا تھا۔ وہ چھ سال ستارا میں قیام کرنے کے بعد ۱۸۲۸ء میں سورت لوٹ آئے۔

سورت میں اب مستقل اقامت اختیار کرلی تھی۔ اس عہد میں سورت علماء سے بھرا ہوا تھا۔
یہ شہر علوم و فنون کے ایک اہم مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ شہر میں ایک محلہ تو ایسا تھا جہاں سے علماء کی ۵۲ پالکیاں نکلتی تھیں۔ اس کا نام بڑے خان کا چکلہ ہے۔ اب وہ قدیم حویلیاں نہیں رہیں صرف لطف اللہ کی حویلی کا ایک حصّہ باقی ہے۔ لطف اللہ کو یہ احساس ہوگیا کہ وہ اپنی بے بضاعتی کی وجہ سے علماء کی مجلسوں میں شرکت نہیں کرسکتے۔ لہٰذا انھوں نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے شہر کے ایک عالم شیخ تاج الدین قاضی و صدر امین سے اکتساب علم کیا اور ساتھ ساتھ سورت کے ایک حاذق طبیب میر عیسیٰ سے طب میں درس لیا۔ لطف مطب بھی کرتے تھے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں کو ہندوستانی بھی سکھلاتے تھے۔ ان انگریزوں کی صحبت میں انھوں نے انگریزی زبان سیکھ کر ادب کے وسیع مطالعہ سے مہارتِ تامّہ حاصل کرلی تھی۔ انگریز مذاقاً کہتے تھے کہ ان کے باپ یا ماں انگریز ہوں گے۔ لطف کی لائبریری دیکھنے کا راقم کو اتفاق ہوا ہے۔ اس میں انگریزی کلاسکی ادب اور فارسی عربی کا نادر ذخیرہ تھا۔

سفر و حضر لطف اللہ کی زندگی کا ایک فطری تقاضا تھا جس کو وہ پورا کیے بغیر چین نہیں لیتے تھے۔ گویا سفر و حضر کے محور پر ان کی حیات کا مدار تھا۔ ۱۸۲۸ء میں سورت میں مستقل اقامت اختیار کرلی تھی، لیکن پاؤں کا چکر انھیں چین لینے نہیں دیتا تھا۔ ۱۸۲۹ء میں شولاپور چلے گئے۔ ۱۸۳۴ء میں نواب افضل الدین خاں کے سکریٹری کی حیثیت سے لطف کا تقرر کیا گیا۔ یہ سلسلہ سات ماہ سے زیادہ قایم نہ رہا۔ بے ایمان لٹیروں نے نواب کو گھیر رکھا تھا۔ یہ بات لطف کے مزاج کے خلاف تھی۔ خود لطف اس سے سبکدوش ہوگئے۔

ابھی سبکدوشی کے دو ہفتہ ہی گزرے تھے کہ راج کوٹ سے پولیٹیکل ایجنٹ کی طرف سے ان کو طلب کیا گیا۔ انھیں سوراشٹر کے بابریا ضلع کا سپرنٹنڈینٹ مقرر کیا گیا تھا۔ وہاں چند روز رہے ہوں گے کہ ان کو نومبر ۱۸۳۸ء میں سندھ بھیجا گیا۔ سندھ کے جس علاقے میں ان کا تقرر کیا گیا تھا، وہاں عید کی بھی نماز پڑھانے والا نہیں تھا۔ دسمبر میں عید الفطر آئی تو لطف نے نماز پڑھائی اور خطبہ بھی دیا۔ شکار پور اور دوسرے مقامات دیکھتے ہوئے لطف اگست ۱۸۳۹ء میں سندھ حیدر آباد پہنچے۔

ایک روز حیدر آباد میں ریسی ڈنسی کے باہر ایک نوجوان سادہ پوشاک میں ایک تھیلی لٹکائے ان کے قریب آیا اور سلام کیا۔ لطف نے بے توجہی برتی اور آگے بڑھ گئے۔ جب دوپہر کو

لطف کاغذات پر دستخط لینے دفتر کے ایک افسر کے پاس گئے تو دیکھا کہ وہی شخص انگریزی لباس میں بیٹھا ہوا افسر سے باتیں کر رہا ہے۔ افسر نے اس کا تعارف کرایا۔ اس کا نام کرزن تھا۔ اور وہ تعلیم یافتہ تو تھا، مگر عربی، فارسی ہندوستانی وغیرہ میں خوب مہارت رکھتا تھا۔ اسی بھیس میں وہ دوسرے روز ترکی جانے کے لیے روانہ ہوگیا۔ ۱۸۴۴ء میں لطف اس سے لندن میں بھی ملے تھے۔

۱۸۴۳ء کے اگست میں نواب افضل الدین خاں کا انتقال ہوگیا۔ میر جعفر علی اور ان کے والد میر سرفراز علی نے بمبئی میں ایک دو ماہ قیام کر کے پنشن وغیرہ جو کمپنی نے موقوف کر دی تھی، اس کے لیے ہر ممکن طریقے پر کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہونے پر طے کیا کہ جعفر علی لندن جا کر اپنا مقدمہ پیش کریں۔ لہٰذا میر جعفر علی نے لطف اللہ کو بحیثیت ترجمان اور وکیل اور حکیم بدر الدین کو بہ طور طبیب ہمراہ لیا۔ ان کے علاوہ خادم وغیرہ بھی تھے۔ جعفر علی ۱۸۴۴ء کے مارچ مہینے میں لندن کے لیے روانہ ہوئے۔

لطف نے سفر و قیام لندن کا حال دل چسپ پیرائے میں بہ تفصیل اپنی خود نوشت سوانح عمری میں بیان کیا ہے۔ میر صاحب اور لطف اللہ کی پہلی ملاقات کمپنی کے چیرمین کپتان جان شیفرڈ سے ہوئی۔ بعد میں میوزیم دیکھنے گئے جہاں جان شکسپیر مرتّب ہندوستانی لغت، پروفیسر ولسن اور کرنل سائکس وغیرہ سے ملاقات کا موقع ملا۔ لطف اللہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ انھوں نے شکسپیر سے ٹکلف اُردو میں گفتگو شروع کی۔ مگر دیکھا کہ جان صاحب کے پلّے نہیں پڑ رہا ہے تو سادہ اُردو میں بات کرنے لگے، وہ بھی جان صاحب کی سمجھ سے کچھ باہر ہی ثابت ہوئی۔ کرنل سائکس وہ تھے جنھوں نے تاریخِ ایران مرتّب کی ہے۔ تین چار ماہ بعد دسمبر ۱۸۴۴ء میں ماورتی قافلہ سورت پہنچ گیا۔

۱۸۴۷ء جنوری میں لطف اللہ نے نواب صاحب کے گھر کی پروردہ ایک مغل لڑکی ولایتی بیگم سے عقدِ ثانی کر لیا۔ لطف اللہ کی ازدواجی زندگی ایک دُکھ بھری کہانی ہے۔ پہلی بیوی سے انھیں، دوسری بھی ان کے لیے سوہانِ رُوح ثابت ہوئی۔ ولایتی بیگم سے ایک فرزند فضل اللہ اور بیٹاں تھیں۔ جب ولایتی بیگم نے ان کی محبت کو ٹھکرا دیا تو انھوں نے اپنی تمام محبت اپنے

بیٹے فضل پر نچھاور کر دی۔ اور خصوصی طور پر ان کی تعلیم و تربیت میں دل چسپی لی۔ فضل اللہ بھی اپنے باپ کی طرح عربی، فارسی، انگریزی، اردو وغیرہ میں مہارت رکھتے تھے۔ فضل اللہ نے مرأت سکندری (تاریخ گجرات) کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ گزیٹر کے مرتب مسٹر کنڈل کی انھوں نے علمی ادبی اعانت کی اور گجرات کے مسلمانوں کا احوال گزیٹر کے لیے انھی نے لکھا ہے۔ اس کو کتابی صورت میں مسلم گجرات کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ سرکاری ملازمت میں بھی ان کی ساکھ قایم تھی۔ انھیں رادھنپور اور دھرم پور ریاستوں میں دیوان کی حیثیت سے بھی بھیجا گیا تھا اور خان بہادر کا خطاب بھی عنایت کیا گیا تھا۔ آخر میں کسٹمس کے اسسٹنٹ کلکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے تھے۔ فضل اللہ کے اولاد نرینہ نہیں تھی۔ صرف تین بیٹیاں تھیں۔ لہٰذا انھوں نے اپنی اہلیہ کے بھانجے (راقم کے حقیقی ماموں) سید جلال الدین قادری کو متبنیٰ لیا تھا۔ جلال الدین کو انھوں نے تعلیم دلوائی، جو ڈاکٹر تھے۔ فضل اللہ کا انتقال ۱۹۰۴ء میں بہ مقام بمبئی ہوا۔

لطف اللہ ایک غیر معمولی شخص تھے۔ دینی اور دنیوی علوم میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔ انگریزی، گجراتی، مرہٹی، سندھی، راجستھانی زبانوں کے بھی ماہر تھے۔ ان کے کتب خانے میں ہزاروں کتابیں تھیں۔ جن میں کلاسیکی ادب خصوصیت رکھتا تھا۔ اس میں انگریزی، فارسی، عربی کتابیں تھیں، جو اب نادر و نایاب ہیں۔ مجھے اس کتب خانے کی سیر کا موقع ملا تھا۔ چند کتابیں راقم کے پاس ہیں، حویلی کے ملازمین نے ہزاروں کی کتابیں کوڑیوں کے مول بیچ دیں۔ لطف بہت خوش خط تھے۔ ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یٰسین اور دوسرے نمونے راقم کی تحویل میں ہیں۔ قاضی عبدالودود مرحوم نے ان کے دو رسالوں (اردو) کی نشان دہی کی ہے۔ ایک کا نام فوائد العجائب ہے۔ یہ مسٹر کاکس کے رسالے کا ترجمہ ہے۔ دوسرا رسالہ مرض ہیضہ سے متعلق ہے۔ لطف کی سب سے اہم تصنیف ان کی خودنوشت انگریزی سوانح عمری ہے۔ یہ بہت دل چسپ ہے۔ اپنے اور پرایوں کے اچھے برے سلوک و برتاؤ اور اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں کا بیان ہے۔ مذکورہ سوانح عمری ان کے ایک شاگرد کپتان ایڈورڈ ایسٹ وِک نے ۱۸۵۷ء میں لندن سے شائع کی تھی۔ اس کا مخطوطہ راقم کے پاس تھا جو سورت کے میونسپل کارپوریشن کی لائبریری کو دے دیا ہے۔ اس مخطوطے پر جان شکسپیر کے بھی دستخط ثبت ہیں۔ اس کے ابتدائی صفحات کا ترجمہ لاہور

سے شائع ہونے والے ایک رسالے میں نظر سے گزرا ہے۔ رسالہ ۱۸۹۰ء کا کوئی شمارہ تھا۔

حویلی کی مردانہ بیٹھک میں ان کی بڑی تصویر بھی تھی۔ موصوف بہت وجیہہ تھے۔
لطف اللہ کی سنہ ولادت تو معلوم ہے لیکن ان کی سنہ وفات معلوم نہ ہو سکی۔ بزرگوں کے بیان کے مطابق ۱۸۷۴ء ہے یا ۱۸۷۴ء تک وہ بقیدِ حیات تھے۔

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی

کیفی صاحب کو اللہ نے لمبی عمر عطا کی تھی۔ ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۸۰ء میں سنِ شعور کو پہنچے اور یکم نومبر 1955ء میں وفات پائی۔ پون صدی تک بھارت کے بدلتے ہوئے سیاسی، سماجی، علمی، ادبی رنگ ان کے سامنے سے گزرے۔ انھوں نے حالی و آزاد ایسے بزرگوں کی آنکھیں دیکھیں۔ بزرگوں سے اثر لیا۔ ہم عصروں کو متاثر کیا اور جوانوں کو چراغِ راہ دکھایا۔ میدانِ ادب کا یہ سپاہی آخر عمر تک رواں دواں رہا اور جھنڈا گاڑ کر کھڑا رہا۔

کیفی صاحب جوانوں میں بوڑھے اور بوڑھوں میں جوان کی حیثیت سے اپنا کردار خوب ادا کرتے رہے۔ میں بھی بوڑھے کیفی صاحب کے جوان نیازمندوں میں سے ایک ہوں۔ میں بھی اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوں۔ اس دورِ خلفشار میں ماضی کی یادوں سے اپنے قدامت پسندی کے جذبات کو سکون پہنچاتا رہتا ہوں۔

کیفی صاحب کی صحبتوں سے مستفید ہونے کے مجھے بہت موقعے ملے۔ میں نے ان میں قدیم تہذیب کی جھلکیاں اور جدید تہذیب سے بے رُخیاں دیکھیں۔ جوانوں سے اُن کا بزرگانہ برتاؤ دیکھا ہم عصر احباب میں ان کی خوش طبعی دیکھی اور بزرگوں کا نام لیتے وقت ان کی نیازمندی کا لب و لہجہ دیکھا۔ نرم گفتگو میں تو نرمی تھی مگر گرم گفتگو میں نرمی بھی دیکھی۔

دسمبر ۱۹۳۹ء میں انجمن ترقی اردو دہلی کی کُل ہند اردو کانفرنس میں کیفی صاحب کے صرف دیدار ہوئے تھے۔ ۱۹۴۱ء میں پھر دہلی جانا ہوا تھا۔ مولوی صاحب کے ہاں دریا گنج میں قیام

تھا۔ ایک دن کوٹھی کے ایک حصّے میں گزر ہوا۔ ایک کمرے میں کیفی صاحب اپنے کام میں مصروف دکھائی دیے۔ کمرے میں سنّاٹا تھا۔ حقّہ کے قہقہوں سے سکوت ٹوٹتا رہتا تھا۔ میں اندر چلا گیا۔ رسمی باتوں کے بعد مجھ سے تعلیمی سلسلہ کی باتیں کیں۔ بر سبیلِ تذکرہ فلمی ڈراموں کا ذکر چھڑ گیا۔ کیفی صاحب نے اپنی تصنیف تہتّا دانا کا ذکر کیا۔ یہ ملاقات بھی "سر راہے" جیسی تھی۔ تین چار روز کے بعد میں بھی سوُرت لوٹ گیا۔

۱۹۴۴ء میں ایک انٹرویو کے سلسلے میں دہرہ دون گیا تھا۔ جاتے ہوئے دہلی میں مولوی صاحب کے یہاں ٹھہر گیا۔ دھوپوں کے دن تھے۔ مولوی صاحب دلّی سے باہر گئے ہوئے تھے۔ کیفی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ فرمایا۔ آپ آرام کیجئے، پانچ بجے ہم باہر چل کر چائے پئیں گے۔ بستر پر دراز ہوتے ہی آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ کیفی صاحب بیٹھے کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ فرمایا آپ تھکے ماندے تھے۔ میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ ایک جگہ پہنچے ایک صاف ستھرا ریسٹورنٹ دکھائی دیا۔ شاید وہاں کیفی صاحب جاتے رہتے ہوں گے اندر گئے تو گرم سا معلوم ہوا۔ کیفی صاحب نے کرُسی میز فٹ پاتھ پر ڈالنے کو کہا۔ ہم باہر بیٹھے۔ کیفی صاحب نے شاید ایسا محسوس کیا کہ مجھے باہر بیٹھنا ناگوار ہے۔ فرمایا پیرس میں اسی طرح لوگ بیٹھتے ہیں۔ میں نے عرض کیا مجھے بھی یہ پسند ہے۔

دہرہ دون سے لوٹ کر پھر مولوی صاحب کے ہاں رک گیا۔ مولوی صاحب اس وقت تک لوٹے نہیں تھے۔ پروفیسر حافظ محمود شیرانی دمے کے علاج کے سلسلے میں دہلی تشریف لائے تھے اور مولوی صاحب کے ساتھ ہی ٹھہرے تھے۔ ایک روز سہ پہر کو کوٹھی کے پچھلے صحن میں چلا گیا۔ ایک طرف شیرانی صاحب دو جوانوں کو پڑھا رہے تھے۔ مجھ سے تعارف کرایا کہ یہ نوجوان تاجور نجیب آبادی کے پوتے (شاید ایسا ہی فرمایا تھا) ہیں۔ انھیں شاہنامے کے مشکل مقامات سمجھا رہا ہوں۔ دوسرے روز مولوی صاحب دَورے سے لوٹ چکے تھے۔ روزانہ شام میں مولوی صاحب، شیرانی صاحب اور کیفی صاحب باغیچہ میں بیٹھتے اور آپس میں خوب ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی رہتیں۔

۱۹۴۴ء بمبئی میں ایک مشاعرے کی صدارت کے لیے کیفی صاحب احمد آباد تشریف لائے تھے۔ ۔:۔ بانی کے فرائض میں نے انجام دیے۔ دو تین روز قیام رہا۔ ایک دن میں نے دریافت کیا

کہ رات کے کھانے میں کھچڑی بنوائی جائے۔ فرمایا کھچڑی تو ہمارے ہاں بیماروں کو دی جاتی ہے۔ میں نے عرض کیا صاحب! گجرات کی کھچڑی مشہور ہے۔ یہ کئی طریقوں سے بنائی جاتی ہے۔ حکم ہوا کہ بنوائیے۔ کھچڑی اس کے لوازمات کے ساتھ کھائی تو بہت خوش ہوئے۔

مشاعرہ گاہ میں پہنچنے کے بعد انھیں یاد آیا کہ بیاضیں گھر پر بھول آئے ہیں۔ مجھے ہدایت دی گھر جائیے۔ میرا چھوٹا سا سوٹ کیس اٹھا کر الگ رکھ دیجیے نیچے والا بکس کھولیے۔ اوپر سے تین کتابیں اٹھائیے۔ اس کے نیچے جو بیاض ہے، وہ نکالیے۔ دوسری طرف کی کتاب اٹھائیے۔ اس کے نیچے جو بیاض ہے وہ بھی لائیے۔ بیاضیں حقیقت میں اسی ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ میں پہنچا اس وقت کیفی صاحب تقریر کر رہے تھے۔ بیاضیں دینا چاہا تو فرمایا پہلی بیاض کے صفحہ ۵۱ پر نشان لگا کر رکھیے۔" تقریر ختم کرنے کے بعد پہلی بیاض سے اور بعد میں دوسری بیاض سے دو دو تین تین نظمیں سنائیں۔

لباس تبدیل کر رہے تھے تو اتفاق سے پائینچے کی ایک سیون ادھڑی ہوئی دیکھ لی۔ میں نے عرض کیا "لائیے میں ٹھیک کرائے دیتا ہوں" فرمایا "مردانہ پاجامہ بہو بیٹیوں کے ہاتھ میں دینا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔" عرض کیا آپ خیال نہ کریں۔ آپ کی بہو بھی خوش ہو گی کہ بزرگوں کی خدمت کا ایک موقع ہاتھ لگا۔"

کیفی صاحب بڑودہ شہر دیکھنا چاہتے تھے چونکہ میں کالج کے کام میں مصروف تھا۔ کیفی صاحب کو قادری مصطفےٰ میاں کے بیٹے کے ہمراہ بڑودہ روانہ کیا۔ بڑودہ میں کیفی صاحب کا قیام نواب بڑودہ کے بھائی ڈاکٹر فخر الدین صاحب (مصطفےٰ میاں کے نسبتی بھائی) کے دولت کدہ پر تھا۔ ایک روز میں کچھ اِدھر اُدھر سیر کر لی۔ دوسرے روز شام پانچ بجے میں ایسی گاڑی سے پہنچا کہ کیفی صاحب کو ساتھ لے لیا اور سورت چلا گیا۔ سورت میں راقم ہی کے غریب خانے پر قیام تھا۔ سورت میں ایک جلسہ کا انتظام انجمن ترقی اُردو نے کیا تھا۔ دوسرا جلسہ وہاں کے کالج میں ہوا تھا۔ انجمن کے صدر شفاء الملک حکیم میر سرفراز حسین صاحب نے عصرانہ دیا تھا۔ سورت سے بمبئی تشریف لے گئے۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم سے پہلے اور بعد میں فسادات کی آگ بھڑکتی رہی۔ یہ سلسلہ دسمبر تک

رہا۔ احمد آباد بلکہ پورے گجرات میں ادبی اداروں پر جمود چھایا ہوا تھا۔ احمد آباد میں انجمن ترقی اُردو کے سکریٹری سید جمال الدین قادری اس کے صدر سید مصطفےٰ احسن قادری، پروفیسر ابراہیم ڈار اور میں مصطفےٰ میاں کے بنگلے کے باغیچے میں روزانہ رات کو مل بیٹھتے تھے (اسی بنگلے کے ایک حصے میں ڈار صاحب اور ایک میں راقم قیام پذیر تھے) اور آرام کرسیوں میں دھنسے بیٹھتے اور برسبیلِ تذکرہ اردو کے لیے زبانی جمع خرچ ہوتا رہتا۔ ایک دفعہ میں نے کہا کہ شہر میں لوگ سہمے ہوئے ہیں اور اردو کا نام لینے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ اس سکوت اور جمود کو توڑنا ضروری ہے اور اس کا یہی ایک طریقہ ہے کہ کوئی ادبی اجتماع کیا جائے۔ اصولی طور پر اس تجویز سے اتفاق کیا گیا تو میں نے کل گجرات اردو کانفرنس کی تجویز پیش کی۔ ایک آدھ ہفتہ اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا گیا۔ کانفرنس کے اخراجات کے لیے فکر نہیں تھی۔ کسی کو باہر سے صدارت کے لیے مدعو کرنا غور طلب تھا۔ میں نے جرأتِ رندانہ سے کام لے کر ڈاکٹر عبدالحق صاحب کا نام پیش کر دیا۔ مجھ سے کہا گیا کہ عبدالحق صاحب سے خط و کتابت کے ذریعہ معلوم کر لیجئے۔ عبدالحق صاحب اس زمانے میں کراچی میں تھے۔ میں نے خط لکھا اور دعوت کی منظوری آگئی۔ اس کے بعد کانفرنس کے لیے تیاری شروع کی گئی۔ ۲۵ / مارچ ۱۹۴۸ء تاریخ مقرر کی گئی۔ عبدالحق صاحب نے کیفی صاحب کو مدعو کرنے کے لیے لکھا تھا۔ کیفی صاحب ان دنوں بمبئی میں تھے، ان سے بھی رابطہ قائم کیا گیا۔

مولوی صاحب بذریعہ ریل احمد آباد تشریف لائے۔ جناب ہاشمی فرید آبادی ہمراہ تھے۔

دوسرے روز صبح کو کیفی صاحب احمد آباد پہنچے۔ سید شہاب الدین صاحب دسنوی بھی آ گئے تھے (ان کی شرکت کے متعلق مجھے ٹھیک یاد نہیں) خصوصی مہمان غریب خانہ پر قیام پذیر تھے۔ صبح جب کیفی صاحب کی کار باغیچہ میں آئی تو مولوی صاحب استقبال کے لیے کار تک لے گئے۔ کیفی صاحب اور مولوی صاحب گلے مل کر خوب روئے۔ چند لمحوں کے لیے دیکھنے والے سب لوگ سہم گئے تھے۔

کانفرنس کے مہمانوں کے کھانے کا انتظام بنگلے میں مصطفےٰ میاں کے ڈرائنگ روم میں کیا گیا تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد کمرے میں آ گئے اور مجھے طلب کیا اور فرمایا سات من لکڑیوں کا انتظام کیجیے۔ مرغن کھانے کھلا کر آپ مار ڈالیں گے۔ عرض کیا آپ فرمائیں کیا کھانا

بنوایا جائے۔ دریافت کیا۔ میری بہو یہاں ہے۔ عرض کیا۔ جی ہاں۔ فرمایا۔ کہیے کہ میرے لیے چھٹانک کے دو تین پھلکے اور دو سبزیاں ایک میں نمک اور دوسری بلا نمک تیار کریں۔ حسب الحکم ایسا ہی کھانا تیار کیا جاتا تھا۔

دونوں بزرگوں نے اپنا پروگرام مرتب کر لیا تھا۔ کانفرنس کے بعد مولوی صاحب کیفی صاحب کو اپنے ہمراہ ہوائی جہاز سے کراچی لے گئے۔

شاید ۱۹۵۲ء یا ۵۳ میں میرے کرم فرما محب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب نے خط میں برسبیلِ تذکرہ تحریر فرمایا تھا کہ کیفی صاحب نے اردو کی خدمت کی ہے اور خدمات کا اعتراف کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جب میں نے اعترافِ خدمات کا طریقہ دریافت کیا تو خواجہ صاحب نے تحریر کیا کہ کیفی صاحب کی ۸۸ ویں سالگرہ منائی جائے تو بہتر ہے۔ میں نے خواجہ صاحب سے سالگرہ منانے کا وعدہ کیا بشرطیکہ کیفی صاحب کو بمبئی تشریف لانے کے لیے راضی کر لیا جائے۔ خواجہ صاحب نے یہ کام انجام دیا اور بمبئی میں جشن کے لیے ۲۷ مارچ ۱۹۵۴ء تاریخ مقرر کی گئی۔ بمبئی میں کچھ رقم تحفتاً پیش کرنا چاہتے تھے مگر کیفی صاحب نے سختی سے منع کیا۔

کیفی صاحب زینہ چڑھنے سے معذور تھے اس لیے میں نے اپنے مکان کے سامنے ایک منیجر مالک فیکٹری جناب فتاح صاحب کے ہاں انتظام کیا۔ معینہ تاریخ پر کیفی صاحب اپنے ایک بھانجے شمبھوجی کے ہمراہ پنجاب میل سے تشریف لائے۔ مسلم لیگ کے صدر جناب محمد احمد، انجمنِ اسلام کے جنرل سکریٹری سید شہاب الدین دسنوی دوسرے معزز حضرات وی۔ ٹی اسٹیشن پر استقبال کے لیے تشریف لائے تھے۔ جیسے ہی گاڑی لگی، میں کمپارٹمنٹ میں گیا تو ان کی صحت دیکھ کر مجھے دھک سے ہوا۔ بہت آہستہ باہر لایا اور حاضرین سے درخواست کی کہ مصافحہ بہت آہستہ کریں۔ ہر ایک کو ان کی مخدوش صحت کا احساس ہو گیا۔ اسٹیشن پر محمد احمد صاحب نے دسنوی صاحب سے بے ساختہ کہا "مدنی صاحب نے تو جوکھم بلایا ہے۔"

جلسہ انجمن اسلام اسکول کے احاطہ میں منعقد کیا گیا تھا۔ معززین، اخباروں کے ایڈیٹر پروفیسر، ٹیچر، خواتین و حضرات نے جلسہ کو رونق بخشی۔ شکیل بدایونی نے نظم پڑھی۔ ڈاکٹر نظام الدین صاحب گوریکر اور راقم نے مقالے پیش کیے۔ عرش ملسیانی صاحب نے بھی مقالہ بھیجا تھا۔ آخر میں

کیفی صاحب نے تقریر کی۔ جلسہ نہایت ستھرا تھا۔ تقریباً شام سات بجے جلسہ ختم ہوا۔

دوسرے روز صبح صبح ایک شخص نے اطلاع دی کہ کیفی صاحب یاد کرتے ہیں۔ اسی وقت میرا ماتھا ٹھنکا۔ فوراً پہنچا۔ دیکھا کہ کیفی صاحب صوفے پر سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ ناک سے پانی ٹپک رہا ہے۔ شمبھو جی نے بتایا کہ رات اسی طرح بیٹھے بیٹھے گزاری ہے۔ آگے بڑھ کر میں نے سلام کیا اور مزاج پرسی کی۔ فرمایا۔ آپ نے میری قبر کا کوئی نقشہ بنوا رکھا ہے۔ عرض کیا۔ انشاءاللہ اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ فرمایا۔ اب آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ عرض کیا۔ میں فوراً اپنے فیملی ڈاکٹر کو اطلاع کرتا ہوں، ایک ڈیڑھ گھنٹے میں آجائیں گے۔ آپ کو فوری علاج کے طور پر جواہر مہرہ کھلانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ منظور کریں۔ فرمایا۔ لائیے۔ گھر سے جواہر مہرہ لاکر کھلا دیا۔ ایک گھنٹے میں ڈاکٹر صاحب بھی آگئے۔

ڈاکٹر صاحب نے معائنہ کیا اور نسخہ لکھا۔ کیفی صاحب نے فرمایا پہلے میرا نسخہ دیکھ لیجئے ڈاکٹر صاحب نے کہا ٹھیک تو ہے۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے نسخہ کے اجزا دیکھے۔ اور کہا بس آپ کا نسخہ بنوائیے۔ تھوڑی دیر میں طبیعت ٹھیک ہو گئی۔

دوسرے روز دوپہر میں خواتین کے جلسے کو خطاب کیا۔ جلسے کی صدارت محترمہ عصمت چغتائی نے کی تھی۔ شام پانچ یا چھ بجے بمبئی ریڈیو والوں کی درخواست پر ریڈیو اسٹیشن گئے۔ کیفی صاحب نے اپنا کلام سنایا اور چند جملے بطورِ تقریر فرمائے۔

تیسرے روز شام فرنٹیر میل سے دلّی کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد اطمینان کا سانس لیا اور اللہ سے التجا کی کہ اس گراں قدر شخصیت کو خیریت کے ساتھ ان کے گھر پہنچا دے۔ اب ایسے وضع دار مرحوم تہذیب کے نمائندے اور بزرگانہ شفقت رکھنے والے لوگوں کو دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستی ہیں۔

ڈاکٹر سیّد محی الدین قادری زورؔ

اُردو زبان و ادب کا شاید ہی کوئی ایسا معلّم و متعلّم ہوگا جو زور صاحب کے مضامین، تصنیفات و نظریات سے واقف و آگاہ نہ ہو۔ طلبہ کتابیں امتحان کے زاویۂ نظر سے پڑھتے ہیں۔ معلّمین تدریسی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرتے ہیں اور میدانِ علم و ادب میں چکّر لگانے والے گہرائی سے نظر ڈالتے ہیں۔ میں بھی منزل بہ منزل یہی کرتا رہا۔ آگے چل کر ایک ایسا موڑ آیا، جب زور صاحب کے نظریوں کو خورد بین سے دیکھنا پڑا۔

۱۹۲۷ء میں پروفیسر احسن مارہروی صاحب کا مرتّبہ "کلیاتِ ولیؔ" شائع ہو چکا تھا۔ زمانہ طالب علمی میں کلیات زیرِ مطالعہ رہا مگر ان کے پیش کردہ نظریۂ وطنیت ولیؔ سے اتفاق نہ کر پایا۔ ۱۹۳۷ء میں زور صاحب کی سرپرستی میں حیدر آباد میں یومِ ولیؔ منایا گیا۔ الموسی کا یادگارِ ولیؔ شائع کیا گیا۔ ولیؔ کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بلند معیار مضامین کو مرتّب کر کے کتابی صورت میں پیش کیا گیا جو قابلِ صد ستائش ہیں۔ یادگار اور نذرِ ولیؔ پڑھنے کے بعد فوری طور پر خیالات نے دماغ میں کروٹیں لیں۔ دل میں اضطراب نے خوب ٹھونگے مارے۔ اس اضطرابِ مسلسل نے ۱۹۴۱ء میں مجھ سے ولیؔ کی وطنیت پر ایک مضمون لکھوا دیا جو مبتدیانہ مشق سے زیادہ نہ تھا۔ استاذ پروفیسر سیّد نجیب اشرف صاحب ندوی نے میری لاعلمی میں مضمون رسالہ 'زمانہ' کانپور سے شائع کرا دیا۔ اس کی اشاعت مجھے منظور نہیں تھی۔

دن گزرتے گئے، سال گزرتے رہے، مطالعہ کرتا رہا، خیالات و دلائل کو ترتیب دیتا رہا۔

رسالہ اردو میں مضامین بھی شائع ہوتے رہے' اور آخر ۱۹۵۰ء میں اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے ولی گجراتی' اور نور المعرفت کی اشاعت عمل میں آئی۔ ۱۹۵۲ء میں زور صاحب کا ایک تردیدی مضمون رسالہ آج کل" میں شائع ہوا۔ ندوی صاحب کے دل کا حال تو اللہ ہی جانتا تھا۔ زور صاحب کا مضمون مجھے دکھلا کر مشورہ دیا کہ میں زور صاحب کی فلاں کتاب پر تنقیدی مضمون لکھ دوں۔ میں نے کہا کہ ولی گجراتی کے خلاف زور صاحب کا مضمون شائع ہو چکا ہے اور اب میں زور صاحب کے خلاف ایک لفظ بھی لکھوں گا' تو یہ میری کم ظرفی پر محمول کیا جائے گا۔ میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔

۵۲ یا ۵۴ء میں ایم۔ اے کے ایک ممتحن کی حیثیت سے زور صاحب کو یونیورسٹی کی طرف سے دعوت دی گئی تھی۔ مقامی ممتحن ہونے کی وجہ سے میں سینیر تھا۔ زور صاحب سے تقسیم کار کے سلسلے میں خط و کتابت ہوتی رہی اور تاریخِ معینہ پر زور صاحب میٹنگ کے لیے بمبئی تشریف لائے۔ میٹنگ میں زور صاحب کچھ کھنچے کھنچے سے رہے اور میں نیاز مندی سے پیش آتا رہا۔ اگرچہ ان کے دل کی پھانس دکھائی دے رہی تھی۔ میٹنگ کے خاتمے پر میں ایک میزبان کی حیثیت سے قیام گاہ تک ساتھ گیا اور کچھ دیر کے بعد میں ان سے رخصت ہونے کے لیے کھڑا ہی ہوا تھا کہ فرمایا " ابھی کہاں چلے ہم سمندر پر چلیں گے۔

انجمن اسلام ہاسٹل سے باہر نکل کر سو دو سو قدم خاموش اجنبیوں کی طرح چلتے رہے کہ زور صاحب نے یہ کہہ کر سکوت توڑا۔ آپ نے میرا مضمون پڑھا ؟ میں نے کہا" جی ہاں۔" اور ایک ہی سانس میں یہ بھی کہہ دیا کہ یہ آپ کا نظریہ ہے اور وہ میرا۔ یہ کہنا تھا کہ انقباض دور ہو گیا۔ فرمایا بہت اچھا۔ اسی پر قایم رہیے اور کسی قسم کی تنقید و تنقیص کی پروا نہ کیجئے۔ اس کے بعد تو گفتگو کے لیے راہیں کھل گئیں۔ اور دلوں میں اعتماد کی لہر دوڑنے لگی۔ زور نے فرمایا" ندوی صاحب حیدر آباد آئے تھے۔ اسٹیشن پر بہت ہی ڈرامائی انداز میں بغل گیر ہوتے ہوئے کہا۔ ولی گجراتی کی اشاعت کے لیے مدنی کو ہر چند منع کیا' مگر وہ نہ مانے' آپ نے اچھا کیا کہ تردیدی مضمون شائع کر دیا۔ میں نے کہا" زور صاحب! آپ نہ لکھتے تو کوئی اور لکھ دیتا۔ مجھے بھی دوبارہ غور کرنے کا موقع مل گیا۔ نظریات و خیالات میں اصلاح ہوتی رہتی ہے۔ تحقیقی کاموں میں ہٹ دھرمی سے کام نہیں چلتا۔ زور صاحب نے فرمایا مضمون لکھنے کا میرا

کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں لکھنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک ادبی صحبت میں وؔلی کا ذکر چھڑ گیا (یا چھیڑا گیا)، تو پروفیسر .... صاحب نے طنز سے کہا وؔلی گجراتی کو شائع ہوئے دو سال گزر چکے ہیں مگر کسی نے تردیدی مضمون نہیں لکھا۔ زور صاحب نے کہا: میں کل لکھ دوں گا۔ چوں کہ روئے سخن میری (زور) طرف تھا۔ اسی روز شب میں مضمون لکھا اور 'آجکل' کو بھیج دیا۔ دلوں کا غبار تو صاف ہو چکا تھا۔ سمندر کے سامنے ہاسٹل سی گرین میں آئس کریم کھائی اور بہت دیر باتیں کرنے کے بعد قیام گاہ پر لوٹ آئے۔ بیگ بستر لیا۔ وی ٹی کے اسٹیشن ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا اور گاڑی پر سوار ہو گئے۔

اس کے بعد کئی بار زور صاحب بمبئی تشریف لائے اور غریب خانے پر ہی قیام کیا۔ ایک دفعہ میرے ادبی کاموں کے متعلق دریافت کیا۔ میں نے اپنی مرتبہ "منشی میاں داد خاں سیاؔح اور ان کا کلام کا مسودہ پیش کر دیا۔ فرصت کے اوقات میں اسے دیکھتے رہے اور جاتے وقت کہہ دیا کہ یہ میں اپنے ادارے کی جانب سے شائع کروں گا۔ یہ شاید ۵۵ - ۵۶ء کا زمانہ تھا۔

ایک دفعہ رسالہ شاعر کی جبلی پر تشریف لائے تھے۔ باہر کے مہمانوں کا قیام و طعام کا مختلف جگہوں پر انتظام کیا گیا تھا۔ حضرت جعفر علی خاں اثؔر لکھنوی غریب خانے پر قیام کرنے والے تھے لیکن وہ کسی وجہ سے تشریف نہ لائے تو زور صاحب کو میرے یہاں ٹھہرا دیا گیا۔ کئی دن قیام رہا اور خوب صحبتیں رہیں۔ ایک دن زور صاحب گھر لوٹے تو دیکھا کہ جناب یوسف ناظم صاحب بھی فٹ نوٹ کی طرح متن کے پیچھے چلے آرہے ہیں۔ زور صاحب نے تعارف کرایا۔ ہم دونوں نے مصافحہ کیا۔ لیکن ہم دونوں میں سے کوئی بھی منہ سے ایک لفظ نہ پھوٹا۔

زور صاحب کھانے سے فارغ ہو کر رات گئے دیر تک باتیں کرتے رہتے تھے۔ گفتگو ادبی موضوعات تک محدود نہ ہوتی تھی۔ نج کی باتیں بھی درمیان میں آجاتی تھیں۔ درون خانہ کی ایسی باتیں بھی بیان کر دیتے تھے جو ہر ایک کو نہیں بتائی جاسکتی تھیں۔ ایک دن یورپ کے سفر و قیام کا ذکر چھڑ گیا تھا۔ فرمایا: "آپ بھی ریسرچ کے سلسلے میں ایک آدھ سال کے لیے باہر چلے جایئے۔ میں نے کہا کہ محب خواجہ احمد فاروقی صاحب کا بھی یہ اصرار تھا کہ باہر چلا جاؤں۔ وظیفے کے لیے بھی اطمینان دلایا تھا مگر میں ایسا گھر گھسنا ہوں کہ باہر جانے کو جی ہی نہیں چاہتا اور مجھے آب وہوا بھی راس نہیں آئے گی۔ فرمایا: "میں صرف ایک بار بیمار پڑا۔ اکیس روز بے ہوش رہا تھا، مگر اس

کے بعد سے آج تک نزلہ بھی نہیں ہوا ہے۔"

برسبیلِ تذکرہ ایک ڈاکٹر صاحب (نام یاد نہیں) کا قصہ سنایا۔ فرمایا "وہ تقریباً پچیس سال فرانس میں رہے ہوں گے اور حیدر آباد لوٹے تو ایک عجیب و غریب نسخہ ساتھ لائے۔ انھیں پوشیدہ دفینے کھوجنے کا خبط تھا۔ عمل یہ تھا کہ کسی تازہ مُردے کی آنکھیں نکال کر اپنے پاس رکھ لو تو دفینے نظر آجاتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف کبھی مرگھٹ پر تضیع اوقات کرتے اور کبھی اطلاع ملنے پر قبرستان جاتے اور اپنا کام کرتے رہتے مگر کامیاب نہ ہوئے۔

زور صاحب کا اصرار تھا کہ انھیں بُرہان پور کی سَیر کرادی جائے۔ میں موقع کا منتظر تھا۔ برہانپور میں تعطیلات گزار رہا تھا۔ اتفاق سے اطبار کی کانفرنس کا انعقاد برہان پور میں قرار پایا تھا۔ میں نے کار پردازوں کے سامنے زور صاحب کی صدارت کی تجویز پیش کی۔ زور صاحب کو دعوت پیش کی گئی اور موصوف نے بھی قبول کرلی۔ خواجہ حمید الدین شاہد ان کے ہمراہ تشریف لائے تھے۔ ایک دن آثارِ قدیمہ دیکھنے گئے۔ ایک جیّد صوفی حضرت نظام الدین عرف شاہ بھکاری کے مزار پر فاتحہ پڑھ کر لوٹ رہے تھے۔ درگاہ میں ایک نو دس سالہ لڑکا کھڑا تھا۔ زور صاحب نے اس سے بات کرنا چاہا مگر لڑکے نے ایک بھی سوال کا جواب نہیں دیا۔ زور صاحب نے فرمایا۔ میں باتیں کر کے برہان پور کی عوامی زبان سننا چاہتا تھا۔ پڑھے لکھوں کی زبان سے صحیح اندازہ مشکل ہوتا ہے۔ وہاں سے مغلوں کی یادگار آہو خانہ دیکھنے گئے۔ مغلوں کے تعمیراتی فن و جمال کا تذکرہ ہو رہا تھا کہ ہمارے ساتھی ڈاکٹر شیخ فرید صاحب نے آہ بھر کر مغلوں کے عیش و طرب کی داد دینا چاہا تو زور صاحب نے سخت لہجے میں فرمایا:

"ہائے وائے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ اپنے زمانے میں سامان مہیا کر کے عیش کیجئے۔"

آہو خانہ سے لوٹتے ہوئے جناب قاضی افضال الرحمن شہر قاضی کے دولت کدے پر لے گیا۔ برہان پور کے قدیم خاندانوں میں سے وہ ایک ہے۔ ان کے یہاں مخطوطوں کا ذخیرہ ہے۔ قاضی صاحب سے مخطوطوں کے لیے درخواست کی گئی۔ چند مخطوطے قاضی صاحب نے پیش کر دیے۔ زور صاحب نے ایک نظر ڈالی اور دو تین پر دستخط ثبت کر دیے۔ قاضی صاحب نے دستخط کی اہمیت

کو نہیں سمجھتے تھے ، منع کر دیا۔ زور صاحب نے قلم روک لیا۔ جب قیام گاہ پر پہنچے تو میں نے کہا۔ شاید آپ گرمی کی وجہ سے برہم تھے۔ فرمایا۔" بھئی میں پان ساتھ لینا بھول گیا تھا طبیعت بدمزہ ہو رہی تھی۔

۵۸ یا ۶۰ء میں زور صاحب صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے کشمیر گئے تھے۔ ایک سال پی۔ ایچ ڈی کے طلبہ کے "وائے وا" کے لیے میرے نام دعوت نامہ بھجوایا۔ مگر میں نہیں گیا۔ ۶۲ء میں جب بمبئی تشریف لائے تو دعوت نہ قبول کرنے کی شکایت کی۔ میں نے بھی کچھ عذر پیش کر دیا۔ فرمایا، میں اس سال دعوت نامہ بھجواؤں گا تو انکار نہ کرنا اور کم از کم پندرہ روز کے لیے مع اہل و عیال آنا۔ اس موقع پر آپ کو تین توسیعی لکچرز بھی دینے ہوں گے۔ میں نے کہا۔" جناب میرے پاس کوئی مقالہ تیار نہیں ہے۔ بس آجاؤں گا۔ فرمایا۔ مقالے میں بتا دیتا ہوں۔ ایک ولی پر، دوسرا نورالمعرفت پر اور تیسرا گجرات میں اردو پر۔ ایسے تین مقالے ہوں گے۔ میں نے کہا کیا خوب! میں ولی پر مقالہ پڑھوں گا اور آپ صدارتی تقریر میں اس کی تردید کریں گے۔ زور صاحب کھل کھلا کر ہنسے اور فرمایا۔ میں ولیؔ کی وطنیت کے متعلق ایک لفظ نہیں کہوں گا۔ دورانِ گفتگو فرمایا۔ میں تو ڈیڑھ سال میں حیدرآباد لوٹ جاؤں گا۔ اگر آپ کو بلائیں تو کشمیر نہ جانا۔ مجھے تلخ تجربے ہوئے ہیں، آپ مقابلہ نہیں کر پائیں گے۔ انھوں نے بعض باتیں بیان بھی کیں، میں نے کہا، زور صاحب! یہ جنت میری قسمت میں نہیں ہے۔ میں نے کہا، آپ کے تقرر سے قبل ایک اشتہار کے پیشِ نظر میں نے حکومت سے اجازت حاصل کر کے درخواست بھیجی تھی۔ انٹرویو دلّی میں تھا۔ فیضی صاحب انتخابی کمیٹی کے صدر تھے۔ ریل میں ریزرویشن بھی کرا لیا تھا۔ لیکن جانے کے دن ہی فیصلہ بدل دیا اور اسٹیشن پر میرے ایک شاگرد دوست شریف احمد (حال صدر شعبۂ اردو۔ دہلی یونیورسٹی) جو لکچرر کی آسامی کے لیے جا رہے تھے۔ ان سے وہاں اطلاع کرنے کے لیے کہہ دیا۔ بہرحال مجھے نہ بلائیں گے، نہ میں جاؤں گا۔ آپ بھی آجائیے۔ جائیے ہے جی نجات کے غم میں۔ ایسی جنّت گئی جہنم میں۔"

بمبئی میں فیضی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے فرمایا۔ آپ کیوں نہیں آئے۔ آپ کارینڈر کی جگہ پر تقرر کرنے والے تھے۔

۱۹۶۲ء میں آخری بار جب بمبئی تشریف لائے تھے تو حیدر آباد جانے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ فرمایا:

میں اپنے ادارے کے کام کے لیے بہت فکرمند ہوں۔ وہاں تو گویا قفل لگ گئے ہیں۔ مجھے کشمیر نہیں جانا چاہیے تھا۔ اب صحت بھی گرتی جا رہی ہے۔ طبیعت بیٹھے جا رہی ہے۔ ہم دونوں ایر کے ٹکٹ کے لیے گئے، لیکن اس دن جگہ خالی نہیں مل پائی۔ بہت ہی مایوس گھر لوٹے۔ دوسرے دن صبح کشمیر کے لیے ہوائی جہاز سے روانہ ہو گئے۔ روانگی کے بعد چوتھے ہی روز اخبار میں اس فعال شخصیت کے انتقال کی منحوس خبر نظر سے گزری۔ اللہ ان کی قبر ٹھنڈی رکھے۔

مرحوم پروفیسر ابراہیم ڈار

گذشتہ نو سال کے عرصے میں اسماعیل کالج کی محفل علم وادب کے تین ایسے رکن اس دارِفانی سے رخصت ہو گئے جن کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔ اس بزم کے صدر نشین ڈاکٹر بذل الرحمن ۱۹۴۷ء میں رحمنِ حقیقی کو پیارے ہو گئے۔ کالج کے لیے یہ صدمۂ عظیم تھا۔ مرحوم کی سرپرستی میں کالج نے جو ترقی کی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں صرف کالج ہی ان کا مرہون منت نہیں، بلکہ بمبئی شہر کے مختلف علمی و تعلیمی ادارے اس چراغِ ہدایت سے منور ہوتے رہے ہیں۔ ابھی آنکھ کے آنسو خشک ہونے ہی پائے تھے کہ ڈاکٹر باقر علی ترمذی اعلیٰ تعلیم کے لیے قاہرہ گئے ۱۹۵۱ء میں اس عروس البلاد کی آغوش میں ہمیشہ کے لیے سو گئے۔ اس جوان مرگی اور کالج کی بدقسمتی کا شورِ ماتم ابھی ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اس بزم کے تیسرے سرگرم رکن پروفیسر محمد ابراہیم صاحب ڈار نے داغِ مفارقت دیا۔ علمی فضا میں اِس محشر خیز تلاطم سے جو اثرات پیدا ہوئے ہیں، اس کا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔ ڈار صاحب کی موت صرف اُن کے اہل وعیال ہی کے لیے باعثِ رنج وغم نہیں ہے بلکہ یہ قومی سانحہ ہے۔ بیسیوں جویندگان علم ان کی رہبری سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے۔

ڈار صاحب اہلِ کشمیر سے تھے۔ کشمیر کا ایک برہمن خاندان ڈار/ڈر اور در کے نام سے مشہور ہے۔ اسی جماعت کے ایک فرد ڈار صاحب کے دادا مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ یہ بزرگ اپنے آبائی وطن کو ترک کر کے تلاشِ معاش میں لاہور آگئے۔ اور یہیں بود و باش اختیار کرلی۔ ان کے بیٹے یعنی ڈار صاحب کے والد شیخ حبیب اللہ لاہور میں گورنر کے عملہ میں ملازم تھے، ملازمت سے سبکدوش ہونے پر شیخ صاحب نے ٹھیکیداری کا سلسلہ شروع کیا۔ اسی سلسلہ میں یہ لاہور سے امرتسر آگئے۔ جہاں مستقل بود و باش اختیار کرلی۔

شیخ صاحب نے یکے بعد دیگرے تین عقد کیے۔ آخری بیوی سے چھ فرزند پیدا ہوئے۔ جن میں سے دو نے صغر سنی میں وفات پائی۔ باقیوں میں سے ڈار صاحب کے بڑے بھائی شیخ یوسف نے درویشی اختیار کرلی۔ دوسرے بھائی شیخ محمد یامین سنِ شعور سے تا دمِ مرگ ملکی سیاست میں الجھے رہے۔ یہ سوشلسٹ جماعت کے ایک سرگرم رکن تھے۔ ان کی انتہا پسندی کی وجہ سے حکومت برطانیہ نے انھیں ۴۲ء میں نظر بند کر دیا تھا۔ دورانِ قید میں یہ قید فرنگ و قید حیات دونوں سے آزاد ہو گئے ڈار صاحب کے چھوٹے بھائی سعید الغنی صاحب نے بھی اپنی خاندانی روایت کو زندہ رکھا۔ جنگ آزادی کے ابتدائی دور سے یہ انڈین نیشنل کانگریس کے ایک جانباز سپاہی کی طرح خدمت انجام دیتے رہے۔ اور اپنی خدمات کی وجہ سے کئی سال اس کی مجلس عاملہ کے بھی سرگرم رکن رہ چکے ہیں۔ اِس وقت پنجاب کے ایم ایل اے کی حیثیت سے خدمت الناس میں مصروف ہیں۔

ڈار صاحب میں بھی خاندانی جذبۂ حرّیت بدرجۂ اتم موجود تھا۔ اس جذبۂ حرّیت نے اپنے ظہور کے لیے علم و ادب کی جولانگاہ تجویز کی۔ ان کی تقریر و تحریر دونوں میں ان کی فطرت کے اس وصفِ خاص کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ڈار صاحب کی ثانوی تعلیم امرتسر کے اسلامیہ ہائی اسکول میں ہوئی "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" یہ ابتدا سے اپنی ذکاوت و ذہانت کے ثبوت پیش کر کے اپنے استادوں اور ہم درسوں سے خراجِ تحسین

حاصل کرتے رہے۔ تقریر و تحریر میں شاید ہی کوئی طالب علم ان پر سبقت لے گیا ہو۔ میٹرک کے امتحان میں صوبۂ پنجاب کے کل مسلمان طلبا میں ڈار صاحب اوّل رہے۔ اور وظیفہ حاصل کیا۔ میٹرک کے بعد بی، اے تک امرت سر کے خالصہ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ عربی ان کا محبوب مضمون تھا۔ بی۔ اے میں بھی امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئے۔ ایم، اے کے لیے انھیں لاہور جانا پڑا۔ جہاں خوش قسمتی سے پرنسپل محمد شفیع صاحب جیسے عالم متبحر سے اکتسابِ علم کا موقع ملا۔ ڈار صاحب بھی ہونہار تھے۔ شفیع صاحب کی نظر نے انھیں تاڑ لیا تھا۔ موصوف نے اُن کی تربیت میں خاصی دلچسپی لی اور اس طرح شفیع صاحب کی توجّہ خاص کی وجہ سے ان کی لیاقتوں کو ابھرنے کا زرّیں موقع مل گیا۔ ڈار صاحب بھی اِس احسان عظیم کو کبھی نہ بھولے۔ اکثر اپنے استاد کے علم و فضل اور رعب و جلال کا تذکرہ چھیڑتے تو گھنٹوں مزے لے لے کر بیان کرتے۔ شفیع صاحب سے یہ بہت مرعوب تھے۔ فرماتے تھے کہ آج بھی شفیع صاحب سے اتنا ہی ڈرتا ہوں جتنا زمانہ طالب علمی میں ڈرا کرتا تھا۔ مولوی فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات میں بھی محض اپنے استاد کے حکم کی تعمیل اور خوشنودی کے خیال سے شریک ہوا تھا۔ ورنہ خود اس کا آرزومند نہیں تھا۔ ایم، اے کا امتحان عربی سے دیا۔ اور اس میں بھی اوّل درجے میں کامیاب ہوئے۔ اور میک لیوڈ اسکالرشپ حاصل کی اور ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۹ء تک پنجاب یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے شفیع صاحب کی نگرانی میں جاحظ کی کتاب الحیوان پر چند مضامین سپردِ قلم کیے۔ اسی دوران جاحظ کی کتاب البخلا کا اُردو میں ترجمہ کیا جو پنجاب یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔ ایم۔ اے کے بعد ڈار صاحب امرتسر چلے آئے تھے۔ کیونکہ ان کے والد کو ان کی جدائی منظور نہیں تھی۔ ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے جب ڈار صاحب کا تقرر ہوا تو شفیع صاحب نے انھیں لاہور میں رہنے کو کہا۔ یہ موقع ڈار صاحب کے لیے بہت ہی آزمائش کا تھا، ایک طرف والد کی محبّت کا پاس، دوسری طرف استاد کی خوشنودی کا خیال، ڈار صاحب نے کسی کو ناراض ہونے کا موقع نہیں دیا۔ انھوں نے تقرر منظور کر لیا مگر روزانہ امرت سر سے لاہور جاتے۔ اگرچہ اس میں انھیں بڑی زحمت ہوتی لیکن ڈار

صاحب نے یہ تکلیف گوارا کرلی۔

ڈار صاحب کے لیے یہ زمانہ نہایت مبارک و مسعود ثابت ہوا۔ اسی زمانے میں انھیں دوسرے جیّد عالم و محقّق حافظ محمود شیرانی کی صحبتوں سے مستفید ہونے کا موقع ملا شیرانی سے ڈار صاحب کی ملاقات کا واقعہ نہایت دلچسپ ہے۔ لاہور کی کسی ادبی صحبت میں شیرانی صاحب مقالہ پڑھنے والے تھے۔ اس مجلس میں ڈار صاحب بھی شریک تھے۔ اس زمانہ میں شیرانی صاحب کی تنقید شعر العجم مولانا شبلی کے موافقین و مخالفین کی صحبتوں کا موضوع بحث بنی ہوئی تھی۔ شیرانی صاحب کو دیکھتے ہی ڈار صاحب کو تنقید شعر العجم یاد آگئی۔ چونکہ ڈار صاحب بڑے منچلے شخص تھے۔ دل چاہا کہ شیرانی صاحب کے ایک آدھ چٹکی لے لیں۔ شیرانی صاحب مجلس برخاست ہونے کے بعد باہر نکلے ہی تھے کہ ڈار صاحب ان کی طرف لپکے اور راستہ روک کر یہ کہتے ہوئے گذر گئے شیرانی صاحب! تنقید اور تنقیص میں کیا فرق ہے؟ ڈار صاحب کے اس طرز عمل سے ان کی فطرت کے اہم گوشے واضح ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ ابتدائی دور میں بھی انھیں اپنی رائے پر پورا بھروسہ تھا۔ اور اس کے اظہار میں یہ کبھی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ شیرانی صاحب جیسے بزرگ سے ڈار صاحب کا یہ انداز گفتگو کوئی مستحسن بات نہیں تھی۔ لیکن ڈار صاحب مقتضائے فطرت سے مجبور تھے۔ وہ کسی سے محبت کرتے تو اتنی شدت کے ساتھ کرتے کہ اس کے خلاف ایک لفظ سننے کو تیار نہ ہوتے، اس سے پہلے کہ شیرانی صاحب سوال کا جواب دیں، ان کا نکتہ چین جا چکا تھا لیکن شیرانی صاحب بھی تھے بڑے سخت، ڈار صاحب کی کھوج میں رہے اور موقع پاتے ہی ڈار صاحب کو چائے پر مدعو کیا اور اس صحبت میں اپنا جواب تفصیل سے پیش کر دیا۔ شیرانی صاحب کے جواب سے ڈار صاحب کی تشفی ہوئی یا نہیں یہ کہنا مشکل ہے۔ لیکن یہ اُن کے علم و فضل سے بہت متاثر ہوئے اور اس دن سے یہ انھیں اپنا استاد ماننے لگے۔ ان دونوں کے درمیان محبت کا ایک ایسا مضبوط رشتہ قائم ہو گیا تھا کہ آخری دم تک نہ ٹوٹ سکا۔ شیرانی صاحب نے اپنے انتقال سے پہلے اپنی ایک پوتی کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ میرے مرنے کی اطلاع ابراہیم

صاحب کو ضرور لکھ بھیجا۔ جب اس مضمون کا خط ڈار صاحب کو ملا تو ان کے رنج و غم کی انتہا نہ تھی۔ میں نے یہ منظر دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ انھیں اپنے قریبی عزیز کے مرنے کا بھی اتنا افسوس نہ ہوا ہوگا۔ نہ ٹھیک سے کھانا کھاتے، نہ کام میں جی لگتا۔ کئی دن یہ حالت رہی، آخر اُن کے احباب نے کسی طرح ان کا غم غلط کیا۔ شیرانی صاحب سے ان کی عقیدت مندی کی جھلکیاں ان کی تحقیق و تنقید میں مل جاتی ہیں۔ ڈار صاحب نے دونوں میدانوں میں اپنے استاد کے نقش قدم پر چلنے کی پوری کوشش کی، اور واقعہ ہے کہ ڈار صاحب نے حقِ شاگردی ادا کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ۱۹۴۶ء میں ڈار صاحب نے شیرانی صاحب سے استفسار کیا کہ شمس العلماء عبدالغنی کے جواب تنقید کا جواب الجواب لکھ رہے ہیں۔ یا نہیں، شیرانی صاحب اس وقت اپنی عمر کی آخری منزل پر تھے۔ جواب لکھ بھیجا۔ مجھ میں اور قبر میں اب بہت کم فاصلہ رہ گیا ہے۔ اگر آپ جواب کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ تو جواب دیجئے۔" ڈار صاحب نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ اور ایک نہایت مدلّل مضمون لکھ کر رسالہ "اردو دہلی کو اشاعت کے لیے بھیجا۔ لیکن بدقسمتی سے ۱۹۴۷ء میں انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ اور دفتر کے ساتھ یہ مضمون بھی انسانیت سوز بربریت کی آگ کی نذر ہوگیا تھا۔ ڈار صاحب نے یہ مضمون دوبارہ لکھا۔

۱۹۳۱ء میں فارسی ادب کے استاد کی حیثیت سے ڈار صاحب کا تقرر گجرات کالج احمد آباد میں ہوا۔ احمد آباد کے زمین و آسمان اُن کے لیے نئے تھے۔ کچھ پہلے انھیں بہت اجنبیت محسوس ہوئی۔ لیکن بہت جلد سازگار ماحول پیدا ہوگیا۔ انھوں نے اپنے علم و فضل، منکسر المزاجی اور خوش طبعی سے طلباء اور شہر کے اہل ذوق حضرات کو گرویدہ بنا لیا۔ اور اس طرح کالج کے باہر بھی شہر کی ادبی سرگرمیوں میں یہ حصہ لینے لگے اس زمانہ میں گجرات کالج میں صدر شعبۂ فارسی کی حیثیت سے پروفیسر نیازی صاحب کام کر رہے تھے۔ چونکہ ڈار صاحب کا خاص مضمون عربی تھا، اس لیے نیازی صاحب انھیں اپنے شعبہ کے لیے زیادہ موزوں نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ ایک دفعہ اثنائی گفتگو میں یہاں تک کہہ دیا کہ اگر انتخاب کا مجھے اختیار دیا جاتا تو میں کبھی آپ کو پسند نہ کرتا۔ کوئی

فارسی داں کو لیتا۔ ڈار صاحب کی انصاف پسندی دیکھیے کہ انھوں نے نیازی صاحب سے کلّی اتفاق کیا اور دل میں ذرا میل نہ لائے مگر دن گذرنے کے بعد نیازی صاحب ڈار صاحب کی فارسی دانی سے اتنے مطمئن ہو گئے کہ کالج کے بڑے درجے کی شکل کتابیں بھی ان کے ذمّے کر دیتے تھے۔ قیام احمد آباد میں تاریخ گجرات ان کا محبوب مشغلہ بن گیا تھا اس شوق کے محرک ایک طرف احمد آباد کے وہ آثار قدیمہ جن میں ان کے بانیوں کے سطوت و جلال کی جھلکیاں ایک حسّاس شخص کے دل میں تلاطم برپا کر دیتی ہیں اور دوسری طرف گجرات کالج کے ایک پروفیسر شری کامی سیریٹ صدر شعبۂ تاریخ تھے جو تاریخ گجرات مرتب کر رہے تھے انھیں فارسی ماخذوں کے سلسلہ میں کسی فارسی داں کی مدد درکار تھی۔ لہٰذا ڈار صاحب نے اپنے ایک شریک کار کی علمی اعانت کے خیال سے کتب تواریخ کا مطالعہ شروع کیا۔ ڈار صاحب کے مضامین خلجیوں کے عہد میں گجرات، سلاطین گجرات کے عہد میں علمی تہذیبی ترقیاں، مرات احمدی کے ماخذ وغیرہ اسی تاریخ بینی کے شوق کا نتیجہ ہیں۔

۳۹ء میں ڈار صاحب کا تبادلہ بمبئی کے اسماعیل کالج میں ہوا۔ چھ سات سال کے قیام احمد آباد میں احباب کے اخلاق کریمانہ نے انھیں اتنا متاثر کیا کہ یہ احمد آباد چھوڑنے میں پس و پیش کر رہے تھے۔ دوسری طرف اہل احمد آباد بھی اس تبادلہ سے خوش نہ تھے۔ باثر لوگوں نے اس حکم کی منسوخی کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور کامیاب بھی ہوئے۔ لیکن اس کی منسوخی کا حکم اس وقت صادر ہوا جب ڈار صاحب بمبئی آ چکے تھے۔ ڈار صاحب نے واپس جانا مناسب نہیں سمجھا اور یہیں اپنے عہدے کا چارج لے لیا۔

بمبئی کا ادبی ماحول احمد آباد سے بہت مختلف تھا۔ کالج میں ڈاکٹر رحمٰن مرحوم، داؤد پوٹا، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، ڈاکٹر ہمدانی، سراج حسن نقوی (صدر شعبۂ سائنس) جیسے ماہر اساتذہ کا اجتماع تھا۔ عربی، فارسی، اور اسلامک کلچر کے میدانوں میں ان لوگوں کی شہ سواری مسلّم تھی۔ مگر ڈار صاحب نے بھی کالج کے اندر اور کالج کے باہر بہت

جلد تقریروں کے ذریعے سے اپنی علمی لیاقت کا سکّہ بٹھا دیا۔ اگرچہ ڈار صاحب کو اچھا مقرّر ہونے کا کبھی دعویٰ نہ تھا۔ اور حتی الامکان تقریر سے گریز کرتے تھے لیکن جن لوگوں کو ان کی تقریروں سے مستفید ہونے کا موقع ملا ہے وہ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ ڈار صاحب نہایت کامیاب مقرّر تھے۔ یہ اپنی تقریر کبھی قلم بند نہ کرتے صرف ذہن میں اس کا خاکہ محفوظ رکھتے تھے۔ حیات شبلی پر ایک ناقدانہ تقریر بمبئی کے اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام توسیعی لیکچرز کے سلسلہ میں کی تھی۔ جس کو ۱۹۵۰ء میں ـــ جب ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے "نوائے ادب" کا اجرا ہوا تو میری درخواست پر اُسے قلم بند کر دیا۔ اس زمانے میں ڈار صاحب نے کئی دوسرے مضامین بھی لکھے ہیں جن میں سے مغلوں سے قبل فارسی ادب اور انڈو پرشین لٹریچر قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر ۱۹۴۷ء میں رسالہ اردو میں شائع ہو چکا ہے۔ اور موخر الذکر بھنڈار کر انسٹی ٹیوٹ پونا کی استدعا پر World literature Volume V" کے لیے ۱۹۴۵ء میں لکھا گیا تھا۔

ڈار صاحب کو بمبئی کی علمی فضا راس آ گئی تھی۔ یہاں تصنیف و تالیف کے لیے ماحول سازگار تھا۔ ان کی ذہنی کاوشوں کے قدردان بھی اس جگہ موجود تھے۔ مگر ۱۹۴۶ء میں انھیں پھر گجرات کالج احمد آباد بھیجا گیا۔ بمبئی کو چھوڑنے کی وجہ سے انھیں روحانی کوفت ہوئی، یہ تبادلہ باعثِ زحمت تھا۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ رہائشی مکانوں کی قلت، گرانی کی گرم بازاری چھ سات بچّوں کی پڑھائی کا سوال اور سب سے اہم بات بیوی بچّوں سے جدائی، غرض تمام فکروں اور پریشانیوں کے ہجوم کے ساتھ ۲۰ جون کو احمد آباد پہنچ گئے۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ جب احمد آباد سے آنا نہیں چاہتے تھے۔ اس وقت زبردستی وہاں سے بمبئی بھیجے گئے، اور اب کی بار مجبوراً بمبئی سے احمد آباد جانا پڑا۔

ڈار صاحب سے میری ملاقات اُسی زمانے میں ہوئی۔ اگرچہ ان کے علم و فضل سے ناواقف نہیں تھا۔ ان کے حُسنِ اخلاق کے متعلق احمد آبادی احباب سے بہت کچھ سُن چکا تھا۔ لیکن بالمشافہ ملاقات کا پہلا موقع تھا۔ انھیں قریب سے دیکھنے اور اُن کے علم و فضل سے مستفید ہونے کا موقع میسر آیا۔ میں احمد آبادی سید مصطفیٰ حسن صاحب قادری

کے بنگلے کے (دیوان کا بنگلہ) ایک حصہ میں رہتا تھا۔ قادری صاحب ڈار صاحب کے قدر دان دوستوں میں سے تھے۔ ڈار صاحب بھی ۲۰ر جون کو احمد آباد پہنچ کر پہلے ان ہی کے ہاں فروکش ہوئے اور قریب ایک سال اسی جگہ گذارنا پڑا۔ ہم دونوں میں کچھ دن تو مغائرت رہی لیکن رات دن ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ ایک دوسرے کے مزاج سے واقف ہوتے گئے۔ اور بہت جلد اجنبیت وغیریت کے پردے درمیان سے اٹھ گئے اور یک جہتی اس حد تک بڑھ گئی کہ ایک روح دو قالب ہو گئے۔ ڈار صاحب سے میری وابستگی کئی حیثیت سے رہی، چہار سالہ دوستانہ تعلقات چہل سالہ قدیم معلوم ہوتے تھے۔ اور چار سال میں میں نے ڈار صاحب سے جو کچھ حاصل کیا۔ وہ دس سال میں بھی نہ کر سکا تھا۔ یہ میرے استاد اور محسن تھے۔ عمر میں، علم وفضل میں، تجربے میں یہ مجھ سے بہت بڑے تھے لیکن مجھے ان کا ایک بے تکلف بلکہ گستاخ دوست ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ان کی مہربانیوں اور غمگساریوں کو بیان کرنے کے لیے ایک الگ مضمون درکار ہے۔ ایک آدھ مثال کے ساتھ اتنا کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ میری محرومیوں کا وہی بدنصیب اندازہ کر سکتا ہے جسے کسی مخلص دوست نے داغ مفارقت دیا ہے۔ فلک کج رفتار نے اس مشفق و مہربان دوست کو مجھ سے بہت جلد علیحدہ کر دیا۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد

ایک ملاقات میں بر سبیل تذکرہ کہیں مجھ سے یہ سن لیا کہ میں فارسی عربی کی دو ایک کتابیں پڑھنا چاہتا ہوں۔ بات آئی گئی ہو گئی ۱۹۴۷ء کے سیاسی خلفشار کی وجہ سے سکون کہاں نصیب تھا کہ ڈھنگ کا کوئی کام ہوتا۔ میں تو حقیقت میں بھول چکا تھا۔ مگر ڈار صاحب نہیں بھولے تھے۔ ایک روز ایک کتاب لے کر گھر پر آدھمکے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد بر سر مطلب آئے۔ اور مجھ سے کہا کہ اس کتاب میں چند مشکل مقامات ہیں وہ میں سمجھا دوں گا۔ میں نے جواب دیا۔ "بہتر ہے میں ہفتہ میں دو تین روز آپ کے گھر آکر پڑھ لیا کروں گا۔" (اس وقت انھیں کرایہ پر مکان مل چکا تھا، جو میری قیام گاہ سے تین میل کے فاصلہ پر تھا) فرمایا۔ "نہیں جناب! میں یہیں آکر پڑھا دیا کروں گا۔" اس بات

پر دیر تک حجت ہوتی رہی لیکن وہ میری ایک نہ مانے. ہفتہ میں دو روز آتے اور مجھے چند مقامات بتا دیتے۔

دوستی کے معاملے میں بہت مخلص تھے لیکن اتنے ہی سخت بھی تھے. اس امر میں یہ چند اصولوں کے سختی سے پابند تھے. اور اپنے دوستوں سے بھی ایسی ہی توقع رکھتے تھے، دوستی میں منفعت کرم داشتن کو یہ گناہ کبیرہ تصور کرتے تھے۔ مولانا مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی ڈار صاحب کے دوستوں میں خصوصیت رکھتے ہیں۔ مولانا کو اُن سے عشق تھا. پندرہ روز میں ایک دن ڈار صاحب کے گھر آتے اور یہ کہتے ہوئے زینہ چڑھتے" بلا کشانِ محبت بہ کوئے ڈار روند"۔ بعض اوقات کسی مسئلہ پر سخت اختلاف رائے ہوتا لیکن دونوں عالم دوست وضع داری کے اتنے پابند تھے کہ صحبت کے ختم ہوتے ہی اختلافات بھی دفن کر دیتے۔

ڈار صاحب کے لیے قیام احمد آباد کا دور بہت ہی صبر آزما تھا. اگرچہ احمد آباد ان کے لیے وطن ثانی کا حکم رکھتا تھا. قادری صاحب کا بنگلہ ان کے اپنے گھر کے مانند تھا. احباب کا اجتماع تنہائی محسوس نہیں ہونے دیتا تھا. باایں ہمہ اہل وعیال سے دوری ان کے لیے سوہانِ رُوح تھی. قریب ۴۷ء میں مکان کا انتظام ہو گیا. اہل وعیال احمد آباد آ گئے. مگر سیاسی خلفشار ان کے لیے رُوحانی کوفت کا باعث ہوا. ہر طرف سے وحشت ناک خبروں نے سکونِ قلب غارت کر دیا تھا. کئی بار ان کے اہل وعیال کو قادری صاحب کے بنگلے میں پناہ گزین ہونا پڑا. دو ایک دفعہ تو یہ خود اپنا گھر چھوڑ کر بنگلے میں چلے آئے. لیکن دو ایک موقعوں کے بعد پھر اپنا مکان نہیں چھوڑا. جب انھیں خطرہ سے آگاہ کیا جاتا تو کہتے" ایسے جینے سے عزت کے ساتھ مر جانا بہتر ہے"۔

اسی دوران میں ڈار صاحب کے خسر کا لاہور میں انتقال ہو گیا. گھر بھر کے لیے یہ باعثِ رنج وغم تو تھا لیکن مزید براں فسادات کی آگ اتنی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی کہ بیوی بچے لاہور تک کا سفر کر سکتے. ان حالات میں صرف کالج کے فرائض انجام دیتے رہے. اس کے علاوہ لکھنے لکھانے کا کوئی کام نہ کر سکے. ان پریشانیوں کے باوجود وضع داری اور

معمول میں کبھی فرق نہ آنے دیا۔ ڈار صاحب کے خسر کے انتقال کو پندرہ روز بھی نہ ہوئے ہوں گے کہ کالج کے عربی شعبہ کے ایک پروفیسر جناب بہاءالدین صاحب داور کرکسی سلسلہ میں افریقہ جارہے تھے۔ ڈار صاحب نے انھیں رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ میں نے سمجھایا کہ ان حالات میں اس کا کوئی موقع نہیں ہے۔ صاحب کہنے لگے "میں خود جانتا ہوں کہ یہ دعوت بے موقع ہے مگر داور کر صاحب یہ خیال کریں گے کہ چونکہ وہ میرے ماتحت پروفیسر ہیں اس لیے انھیں میں نے نظرانداز کردیا۔" ڈار صاحب میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے ماتحتوں اور چھوٹوں کو کبھی اپنے سے چھوٹے ہونے کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے، اپنے شاگردوں کو ہمیشہ دوست کہتے اور ان کی عزّت کرتے۔

۱۹۴۸ء جون میں ڈار صاحب دوبارہ اسماعیل کالج آگئے۔ جہاں علمی وادبی مشاغل کا تعلّق ہے۔ ان کی زندگی کا یہ دور بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس دور میں انھوں نے غیر معمولی مستعدی اور انہماک کا ثبوت دیا۔ یہ ان کی علمی زندگی کا شباب تھا۔ اس وقت ان کے مطالعے اور تجربے کا پیمانہ چھلک رہا تھا۔ اس انہماک کے کئی اسباب تھے جن میں ایک سبب ان کے ایک دوست اور شریک کار ڈاکٹر ترمذی مرحوم بھی تھے۔ ان کی تحریک پر ڈار صاحب نے کئی مضامین لکھے۔ حیات شبلی پر ایک نظر، ریاض الانشا پر تنقید وتبصرہ، فریدالدین عطار، خواجہ معین الدین عطار، خواجہ معین الدین کے دیوان کے متعلق نئی تحقیقات، الغزالی اور تعلیمی مسائل، بوعلی سینا، گجری، اقبال اور حب وطن، اور اقبال اور عربی شعراء اسی آخری دور کی یادگار ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ شبلی اور ان کے نکتہ چیں، قاطع برہان، دساتیر وغیرہ ایسے موضوع تھے جو ان کے ذہن میں چکر لگا رہے تھے۔ ان مضامین کی داغ بیل بھی ڈال چکے تھے۔ اقبال بھی ان کے پیش نظر تھے۔ افسوس کہ ان کے اشہب قلم کی رفتار سے اُن کے رخش عمر کی رفتار زیادہ تیز نکلی۔

اس زمانے میں اگرچہ کئی مضمون لکھنے میں مصروف رہے تاہم نہ کالج کے فرائض انجام دینے میں کوتاہی کی نہ طلبہ کی علمی اعانت سے کبھی گریز کیا۔ استاد کی حیثیت سے تو ڈار

صاحب ایک بے مثل شخص تھے۔ شاگردوں کا گھر پہ ہجوم رہتا۔ چھوٹی جماعت سے لے کر بی۔ایچ ڈی تک کے طلباء استفادے کی غرض سے آجاتے۔ لیکن کسی وقت بھی نہ اپنی مصروفیات کا ذکر کرتے نہ کسی قسم کے صلے کی تمنا کرتے اور نہ ہی اپنا احسان جتاتے۔ علمی، ادبی امداد سے انکار ان کے نزدیک بہت بڑا گناہ تھا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ انھیں کسی چیز کا علم نہ ہوتا۔ مگر یہ معلومات بہم پہونچانے کے لیے بھی پہلوتہی نہ کرتے۔ دو چار روز کی مہلت مانگ کر سب سے مطلوبہ اطلاع حاصل کرتے، اور طالب تک پہونچا دیتے علمی معاملات میں ان کی ایمانداری کا یہ عالم تھا کہ کالج میں دوشنبہ کو ایم اے اسلامک کلچر کے دو گھنٹے لیتے تھے جس کی تیاری کے لیے سنیچر اور اتوار کا دن مخصوص کر دیا تھا۔ بڑی چھان بین کے بعد اپنے لکچرز ترتیب دیتے۔ خود کہتے تھے کہ ڈیڑھ گھنٹے کے کام کے لیے میرا ڈیڑھ دن ہو جاتا ہے۔

اسی طرح یہ اپنی ذات اور اپنے اثر و رسوخ سے مستحق لوگوں کو فائدہ پہنچانا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ بے شمار غریب اور مستحق طلباء نے ان کے اس جذبۂ ہمدردی سے فائدہ اٹھایا ہے۔ بعض لوگوں نے تو اعلا عہدیداروں سے بھی ان کے ذریعے اپنے کام نکلوائے ہیں۔ مگر جو کچھ جائز طریقے پہ ہو سکتا وہی کرتے۔ اپنے اثر و رسوخ سے کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ ان کاموں میں انھیں تکلیف بھی اٹھانا پڑتی۔ لیکن بامروت ایسے تھے کہ کبھی انکار نہ کرتے۔

فطرتاً مزاج میں نرمی اور ملائمت تھی۔ درگذر ان کا بڑا وصف تھا لیکن علمی مباحث میں نرمی کے قائل نہ تھے۔ ۱۹۵۱ء میں حکومت ہند کی طرف سے دلی میں کل ایشیا تمدنی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ ہندوستان کے ایک نمائندے کی حیثیت سے ڈار صاحب بھی اس میں مدعو تھے۔ اس موقع پہ مولانا ابوالکلام آزاد سے کسی ایک ملاقات میں کوئی علمی بحث چھڑ گئی۔ ڈار صاحب نے اس موقع پہ ایک تحقیقی نکتے پہ اختلاف کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا۔ اسی طرح اپنے سیاسی خیالات و عقیدوں میں یہ بہت سخت تھے

سیاسی اُمور کا مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ یہ ابتدا سے نیشنلسٹ گروہ سے تعلق رکھتے تھے

ڈار صاحب کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ قلیل تنخواہ میں نو بچوں کی پرورش وپرداخت و تعلیم کا خرچ برداشت کرنا ان کے لیے آزمائش کی انتہا تھی۔ لیکن مزاج میں قناعت کا وصف تھا۔ بہت صبر و برداشت سے کام لیتے۔ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا تو کیا اپنی تنگ دستی کا ذکر بھی خودداری کے خلاف سمجھتے تھے۔ ان حالات میں بھی وضع داری کے اتنے پابند تھے کہ بمبئی اور احمد آباد میں ان کی مسافر نوازی اور سیر چشمی مشہور ہے ۵۲ء میں قاضی عبدالودود صاحب ایک دو ماہ کے لیے بمبئی تشریف لائے تھے۔ اس وقت ڈار صاحب علالت کی وجہ سے صاحب فراش تھے۔ قاضی صاحب ان کی عیادت کے لیے گئے۔ قاضی صاحب سے یہ پہلی ملاقات تھی، باوجود اپنی علالت کے ڈار صاحب نے قاضی صاحب سے دوپہر کے کھانے کے لیے اصرار کیا۔ قاضی صاحب نے محض دلجوئی کے خیال سے منظور کر لیا اور ان کے سامنے تھوڑا بہت خاطراً کھا لیا۔

۵۲ء میں ڈار صاحب کو حکومت کشمیر میں ہسٹاریکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے جانے کا موقع مل رہا تھا۔ لیکن درس و تدریس سے انھیں ایسا عشق تھا کہ کسی قیمت پر اُسے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔

اکتوبر ۵۳ء میں اہل احمد آباد نے ایک ضعیف العمر صوفی منش شاعر حضرت کلیم کی جُبلی منانے کا فیصلہ کیا۔ بمبئی سے ندوی صاحب، ڈار صاحب اور میں مقالے پڑھنے کے لیے یاد کیے گئے تھے۔ ندوی صاحب اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے جلسہ کی صدارت کے فرائض انجام دے کر فوراً لوٹ آئے لیکن احباب کے اصرار پر ہمیں کچھ دنوں کے لیے رکنا پڑا۔ اس موقع پر اہل احمد آباد نے ڈار صاحب سے جس عقیدت کا اظہار کیا وہ بیان سے باہر ہے۔ خاطر تواضع میں لوگ بچھے جاتے تھے۔ یہ ان کے حسن اخلاق اور ملنساری کا نتیجہ تھا۔ آٹھ دس روز تک صبح سے رات کے ایک بجے تک وقت کچھ اس طرح گذرتا تھا گویا ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات تھی۔ ڈار صاحب بڑے نازک مزاج تھے

لیکن خیال خاطر احباب کی وجہ سے خواب و خور میں بے احتیاطی کا خیال نہ کیا یہی بے احتیاطی
مہلک مرض کے ظہور کا بہانہ ہوئی۔

۲۰ر اکتوبر کو ہم احمد آباد سے لوٹے۔ نقاہت و بے خوابی کی وجہ سے ڈار صاحب
کی طبیعت مضمحل رہنے لگی۔ خیال تھا کہ ایک آدھ ہفتے میں یہ کسل دور ہو جائے گی لیکن
طبیعت سنبھلنے کے بجائے بگڑتی ہی گئی۔ ۲۰ر نومبر کو اسپتال لے جایا گیا۔ جہاں ڈاکٹروں کی
تشخیص سے معلوم ہوا کہ گردے بیکار ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹروں اور طبیبوں نے اپنی کوشش
میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ لیکن مرض لاعلاج تھا۔ کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ اس موقع پر
ڈار صاحب کے احباب و تلامذہ نے جو تیمار داری اور خدمت کی اس کو بیان نہیں کیا
جا سکتا۔ یہ ان کے حسن سلوک اور شفقت و مہربانی کا نتیجہ تھا۔ آخر کار چھ ماہ کی شدید
علالت کے بعد، ۱ر مئی کو صبح گیارہ بجے اس پیکرِ علم و عمل نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

ڈار صاحب اُن مخصوص لوگوں میں سے تھے جنھیں دنیا میں اکتسابِ علم کے
علاوہ کوئی شوق نہیں ہوتا ہے۔ قدرت نے انھیں وہ تمام صلاحیتیں عطا کی
تھیں جو ایک محقق، نقاد اور قابل استاد ہونے کے لیے ضروری ہیں۔ انھوں
نے اپنی زندگی میں کم و بیش ۲۵۔ ۳۰ مضامین لکھے جن میں سے ہر ایک وسیع مطالعہ
اور عمیق نظر کا نتیجہ ہے۔ ڈار صاحب کو اُردو فارسی اور عربی تینوں زبانوں کے
اَدب سے شغف تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ تاریخ و اسلامک کلچر بھی ان کے مرغوب مضامین
رہے ہیں۔

تحقیق و تنقید کے میدان میں ڈار صاحب نے اپنے استاد حافظ محمود شیرانی
کے نقش قدم پر چلنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ایک محقق و نقاد کی حیثیت سے
ڈار صاحب کی کامیابی کا راز اس میں مُضمَر ہے کہ انھوں نے اپنے موضوع پر حاوی ہوئے
بغیر کبھی نہ قلم اٹھایا۔ نہ زبان کھولی۔ جب انھیں تلاش و تحقیق سے کُلّی اطمینان ہو جاتا
تب ہی اظہار خیال کرتے اور وہ بھی اتنے اعتماد کے ساتھ کہ پھر کسی قیمت پر اپنی رائے
بدلنے پر تیار نہ ہوتے۔

اُن کے تنقیدی مضامین میں بعض جگہ غم و غصّہ اور طنز کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن ایسے موقعوں پر ڈار صاحب نے کبھی ادب کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ایسے مقامات پر اکثر ان کا قلم رک جاتا اور موزوں الفاظ کی تلاش میں گھنٹوں غور کرتے رہتے۔ ڈار صاحب کے طرزِ تحریر میں سنجیدگی و متانت پائی جاتی ہے۔ انھیں زبان پر قدرت حاصل تھی۔ پیچیدہ مسائل اور مشکل نکات کو بھی اتنی صاف ستھری زبان میں پیش کیا ہے کہ مصنف کے مافی الضمیر سے واقف ہونے میں قاری کو ذرا دقت پیش نہیں آتی۔ غرض مرحوم کے مضامین شوق تلاش و جستجو، وسعت مطالعہ اور انتقادی صلاحیتوں کے ایسے نمونے ہیں جو اس وادی کے رہروں کے لیے مشعل راہ کا کام دیں گے۔

عیدن بائی

عیدن بائی نہ طوائف تھیں نہ قحبہ تھیں۔ وہ ایک گویا استاد تھیں۔ اُستادانِ فن اسی نام سے یاد کرتے تھے۔ وہ ماہرِ موسیقی تھیں اور صفِ اوّل کے لوگوں میں ان کا شمار تھا۔

وہ پیدا تو لکھنؤ میں ہوئی تھیں لیکن عہدِ شباب سے بڑھاپے تک عمر سورت میں بسر کی۔ خود عیدن بائی کا بیان ہے کہ وہ ایک درزی کی لڑکی تھیں۔ پانچ سات سال کی عمر میں اوباش اغوا کر کے لے گئے اور کسی کسبی قحبہ کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ اس نے عیدن بائی کو موسیقی کی تعلیم دِلوائی۔ گلے میں نور تھا، جگری لے پائی تھی اور ذہنِ رسا ملا تھا۔ بہت جلد واجبی تعلیم حاصل کرلی۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں سورت آگئی تھیں۔ اس زمانے میں سورت کی صورت ہی کچھ اور تھی۔ اہلِ سورت لہری لاابالی، دولت کی فراوانی تھی اور ہے۔ موسیقی سورت کے رنگین مزاجوں کے عین موافق تھی۔ شمال سے آنے والے قافلے اور طائفے پہلے سورت ہی میں منزل کرتے۔ ان کی دوسری منزل بڑودہ ہوا کرتی تھی۔ امراء کا بجھتا چراغ تھا۔ ذرا تیز ہی جلتا رہا۔ ادھر اہلِ نشاط کی بن آئی تھی۔

عیدن بائی کو اللہ نے حُسنِ فن کے ساتھ حسنِ تن بھی عنایت کیا تھا۔ مقبولیت میں دیر نہ لگی۔ دُور دُور تک ان کی شہرت کا چرچا تھا۔ مانگرول کے نواب حسین میاں (متوفی ۱۸۰۸ء) نے انھیں یاد کیا۔ وہ ایسی گئیں کہ نواب موصوف کی وفات تک مانگرول ان کا مسکن بنا رہا۔ نواب موصوف موسیقی کے رسیا تھے اور علما

تھے کہ گویّے ان کے سامنے کان پکڑتے تھے۔ طبلہ نوازی کے فن میں تو یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ چار طبلہ نوازوں سے جُدا جُدا تال شروع کراتے اور موصوف ہاتھوں اور پیروں سے ہر ایک کو تال دیتے جاتے۔ نواب صاحب نے عیدن بائی کی تعلیم کو مکمل کرانے کے خیال سے ایک اُستاد کا تقرر کیا تھا۔ بائی کے استادوں میں قدرت اللہ خاں، عبداللہ خاں اور عبدالعزیز خاں کے نام ملتے ہیں۔ ممکن ہے انہی میں سے وہ استاد ہوں گے۔

عیدن بائی مانگرول سے سورت لوٹ آئیں۔ قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ سورت آنے کے بعد ان کو سندھ سے میر پور خاص سے دعوت ملی تھی۔ میر پور کے امیر نے ہندوستان کے نامی گرامی گویّوں کو بُلا کر ایک جشن کیا تھا۔ اس جشن میں بھی عیدن بائی نے اپنے فن کا مظاہرہ غیر معمولی طور پر کیا تھا۔ اس جگہ ایک ایسا مقام آیا کہ عبدالعزیز خاں نے سنگت میں ہار مان لی اور اپنی سارنگی یہ کہہ کر زمین پر پٹخ دی کہ "جو ساز ایک عورت کی سنگت نہ کر سکے وہ ساز ہی کیا[1]"۔

میری معلومات کے مطابق یہ واقعہ سورت میں پیش آیا تھا۔ عیدن بائی کا ایک بیٹا کسی مرض کی وجہ سے وفات پا گیا۔ عیدن بائی کو اس کی موت کا اتنا رنج ہوا تھا کہ وہ دماغی توازن کھو چکی تھیں۔ کسی علاج سے فائدہ نظر نہیں آیا۔ عبدالعزیز خاں جب مایوس ہو گئے تو غصّے میں یہ کہہ کر سارنگی زمین پر دے ماری کہ "سارنگی بجتی تو عیدن ہی کے ساتھ بجتی"۔ خانصاحب گھر چھوڑ کر بڑودہ چلے گئے اور وہاں جمال الدین خاں بین کار سے تعلیم لی۔ ۱۹۱۲ء کے دہلی دربار میں آگرہ کی زہرہ بائی اور سورت کی عیدن بائی کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔

عیدن بائی کے فن پر تو وہی تبصرہ کر سکتا ہے جس نے اس کوچے کی خوب خاک چھانی ہو میں تو اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ بائی شاستریہ سنگیت کے علاوہ غزل، ٹھمری، دادرہ، ٹپّہ بہ حسن و خوبی گاتی تھیں۔ ان کو سُر اور لَے تال پہ قدرت حاصل تھی۔ وہ کسی بھی سُر اور کسی بول سے تان کہہ دیتیں۔ پھر وہ سپاٹ تان ہو کہ پیچیدہ، مگر ان میں فنی پہلو اُبھر کر سامنے آتا۔ مینڈھ، مُرکی، ہوڑ سے وہ اس طرح راگ کو سنوارتیں کہ ہمیشہ نیا پن معلوم ہوتا۔ عموماً ٹھمری طوائف نہیں

---

[1] سورت کے ڈاکٹر موتی بھائی شاہ نے عیدن بائی پر ایک مختصر مضمون کسی گجراتی ماہنامے میں سپردِ قلم کیا ہے۔ اس میں ڈاکٹر موصوف نے بائی کے استادوں اور اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔

گاتی۔ اُستاد گواتے سنوارتے اور سماباندھتے ہیں۔ مگر عیدن بائی ٹھمری گائیں، سنواریں۔ اُستاد بائی کے پابند ہوتے۔

ایک دفعہ اجمیر کے عُرس میں خاں صاحب نصیر الدین خاں نے عیدن بائی کو دیکھ کر کہا تھا "عیدن تو بھی اچھا گاتی تھی۔" عیدن بائی کے گھر پر اکثر استادوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ کریم خاں اور عبدالعزیز خاں شہر آئے تو سب سے پہلے عیدن بائی کے ہاں سلامی دی۔ یہ لوگ آتے تو مجلس گرم ہو جاتی۔ چیلے گے استاد اور طوائفیں نیاز مندی کے ساتھ جمع ہو جاتے تھے اور تین چار گھنٹے صحبت رہتی تھی۔ سورت کے ماسٹر دینا ناتھ اکثر عیدن بائی کے گھر جاتے اور بعض اوقات سنگت بھی کرتے تھے۔

عیدن بائی کا عہدِ شباب بہت ٹھاٹھ باٹ سے گزرا۔ رات دن ہُن برستا تھا۔ ہمیشہ ہیرے موتی سے سجی رہتی تھیں۔ شام کو بگھی میں سیر تماشے کے لیے جاتی تھیں۔ ان کی ایک ایک پشواز ہزاروں روپے کی ہوتی تھی۔

مگر زوال بھی ایسا آیا کہ نہ دیکھا جائے۔ بائی کی دیوانگی کے زمانے میں جو جس کے ہاتھ لگا لے بھاگا۔ دھتاروں نے الگ لوٹا۔ غرض گھر میں جھاڑو پھر گئی۔ آخر میں ایک تان پورا اور ایک پشواز بچ گئے تھے۔ پشواز تو وقتِ ضرورت رہن رکھ کر رقم لے لیتی تھیں۔ ایک روز تان پورا بھی مجھے دیا۔ میں نے رقم دے دی اور تان پورا بھی لوٹا دیا۔ دیوانگی کے زمانے سے گھر پر ٹیم لگانا تو بند ہی ہو چکا تھا۔ ہندو ہمدرد ان کے گانے کی محفلیں منعقد کر کے ان کی مالی امداد کر دیتے۔ مسلمانوں میں پرانے لوگ انہی کا گانا مجرا سنتے تھے۔ ایک قدر دان نے ان کو رہنے کے لیے گھر دے دیا تھا۔ اس طرح وہ کرائے کی ادائیگی سے بچ گئی تھیں۔ سورت کے معززین کے گھروں میں ان کا گزر بسر ہوتا رہتا تھا۔ ایک دفعہ مانگرول سے نواب بیگم سورت آئی تھیں۔ عیدن بائی کو دیکھ کر خوش ہوئیں اور بائی سے کہا کہ وہ ان کے ہمراہ مانگرول جائیں اور وہیں رہ کر بچوں کو سنگیت کی تعلیم دیتی رہیں۔ مگر عیدن بائی ٹال گئیں۔ بعد میں میں نے انکار کی وجہ دریافت کی تو کہا۔ میاں اصل کے قاعدے کے مطابق میں کہیں باہر نہیں جا سکتی تھی۔ یہ میرے لیے بہت سخت قید ہے۔ استاد آتے رہتے ہیں مجھے تھوڑی سی فرصت نصیب ہو جاتی ہے اس سے

بھی محروم ہو جاتی۔

ایک شاگرد کی حیثیت سے میرا تعلق ۱۹۳۰ء کے بعد سے شروع ہوا تھا۔ میرے شوق کے پیشِ نظر انھوں نے بطورِ خاص توجہ دینا شروع کی۔ صبح سات بجے سے کھرج کے سُر بھرواتیں اور عموماً صبح ہی کو وہ تعلیم دیتیں۔ بدقسمتی یہ تھی کہ یہ سلسلہ دو تین ہفتہ رہتا۔ پھر میری عدم موجودگی یا ان کی عدم موجودگی سے ٹوٹ جاتا۔ اس طرح بارہ سال گزر گئے۔ ۱۹۴۲ء میں میرا الہ آباد میں ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا تو یہ سلسلہ بالکل ختم ہو گیا۔ ادھر میرا میدانِ عمل بھی بدل گیا۔ بلا پس و پیش یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنے فن کا خزانہ مجھ پر نچھاور کر دینا چاہتی تھیں۔ مگر مجھ بدنصیب نے کچھ حاصل نہیں کیا۔ اکثر کالج کے جلسوں میں گانے کے لیے وہ کوئی چیز تیار کرا دیتیں اور طبلہ بھی ساتھ کر دیتیں۔

ڈاکٹر شاہ کا خیال ہے کہ عیدن بائی نے اسّی سال کی عمر میں بہ سنہ ۱۹۸۰ء وفات پائی۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ میں گرما کی چھٹیوں میں سورت میں تھا اور سال ۴۶ یا ۴۷ ہوگا۔ ایک روز اطلاع ملی کہ عیدن بائی کا انتقال ہو گیا۔ ظہر کی نماز سے قبل موسیقی کے اس خزانے کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔

صادق میاں بن محمد حسین نرما والے بھی راقم کے اُستادوں میں سے تھے۔ وہ سُورت کی پٹنی جماعت کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ چند سال انھوں نے اُردو، فارسی کی تعلیم الہ آباد میں حاصل کی تھی۔ سورت کے صفِ اوّل کے شاعروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ صادق تخلص کرتے تھے۔ موسیقی اور شاعری میں انھوں نے میری رہبری کی ہے۔ فنِ طب میں تھوڑی بہت مہارت تھی۔ آخر عمر میں مطب کرتے تھے۔ ۱۹۴۴ء کی یکم دسمبر کو صادق صاحب نے وفات پائی۔

صادق صاحب کو موسیقی سے بے حد شغف تھا۔ اس فن کو حاصل کرنے میں چالیس پچاس ہزار روپیہ صَرف کیا تھا۔ کہتے تھے کہ جس کو میں نے کچھ نہ دیا اس نے مجھے سب کچھ دے دیا۔ شاید یہ اشارہ استاد عبدالعزیز خاں کی طرف تھا۔ ہارمونیم باجے پر بڑی قدرت رکھتے تھے۔ سورت میں ان کا ثانی نہیں تھا۔ ہندوؤں میں بہت مقبول تھے۔ اجمیر میں استاد نصیر الدین خاں نے اس طرح تعریف کی تھی۔ "انگلی بہت پیاری ہے"۔ ان کا گھر ہمیشہ میراثیوں سے بھرا رہتا تھا۔ وہ

اس بات سے واقف تھے کہ میں قیلولہ کا عادی ہوں۔ اس لیے روزانہ دوپہر دو بجے میرے لیے وقت مقرر کیا تھا۔

ایک میراثی استاد نے مجھے طبلہ نوازی کی تعلیم دی تھی۔ ان کا نام مشتاق تھا۔ ایک سال ہی یہ سلسلہ رہا۔ کیوں کہ وہ سورت سے چلے گئے۔

ان سب استادوں کے احسانات میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ موسیقی کے علاوہ ان کی ہدایات زندگی میں بہت کام آئیں۔ عیدن بائی نے ایک دفعہ ہدایت کی کہ میاں کسی کو بُرا نہ کہنا۔ موسیقی ایک سمندر ہے، کسی نے چند قطرے پیے ہیں اور کوئی ایک گھونٹ پی سکا۔ یہ ہدایت ہر شعبۂ حیات میں کام آسکتی ہے۔

صادق صاحب نے مجھے نصیحت کی تھی کہ جب تک شوق جنون کی حد تک نہیں ہوتا وہاں تک مقصد میں کامیابی نہیں ہوتی۔ میں نے ہمیشہ دونوں ہدایتوں کو ذہن میں رکھا۔

اُردُو غزل منزل بہ منزل

اُردُو سماج میں غزل کا وہی درجہ ہے جو کسی بھرے پرے گھر میں ایک البیلی دوشیزہ کا ہوتا ہے۔ اس کے چاہنے والوں میں بچّے، جوان، بوڑھے، عورت، مرد، رِند صوُفی، اہل، نااہل، پڑھے لکھے، اَنپڑھ سبھی ہیں۔ بعض اس کے الڑھ پن کے دلدادہ ہیں اور بعض اس کی شوخیوں پر فریفتہ ہیں۔ بعض اس کی متانت و رکھ رکھاؤ کے شیدائی ہیں اور بعضے اس کے تاؤ بھاؤ اور چاؤ چونچلے پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ جوان کا اس سے عاشقانہ و رِندانہ برتاؤ ہوتا ہے اور بوڑھوں کا پدرانہ و پیرانہ۔

غزل ہمارے دِلوں کی محرمِ راز ہے۔ یہ ہماری معلّم ہے اور رہبر بھی ہے اور ہم سفر بھی۔ خوشیوں میں ہماری شریک اور غم والم میں غمگسار بھی ہے۔ اس کے دو بول، ہماری مسّرتوں کو دوچند اور کبھی رنج و غم کو ہلکا بھی کر دیتے ہیں۔ غزل انسانی قلب و نظر کی گہرائیوں سے خوُب واقف ہے۔ بعض اَوقات اس کے اشاروں کنایوں کے توسّط سے صرف دوسروں ہی کے دلوں ہی کی کیفیتیں معلوم نہیں کر لیتے بلکہ خود اپنے دل کے پوشیدہ گوشوں میں پوشیدہ جذبات سے بھی آگاہی حاصل کر لیتے ہیں۔

غزل ہماری سماجی تاریخ کا ایک دلکش مرقّع ہے۔ اس نے تہذیبوں کے اُتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ سیاسی بدلتے ہوئے رنگوں اور تخت و تختہ کے تماشے کی اپنے

مخصوص انداز میں آئینہ داری کرتی ہے۔ غرض ہر دور کی ذہنی پستی و بلندی کا حقیقی نقش اس کے آئینہ خانہ میں موجود و محفوظ ہے۔

غزل فن و جمال کا ایک حسین پیکر ہے۔ خیال و زبان اور ہئیت کی ہم آہنگی سے اِس پیکر میں حسن و جمال پیدا ہوتا ہے۔ یہ ہم آہنگی جب جذبات سے ہم آہنگ ہوتی ہے تو غزل کا آہنگ بلا کا طوفان بَرپا کر دیتا ہے۔ انسان کا دل ادنا و اعلا، حسین و قبیح، بہائمی و انسانی ہر قسم کے جذبات و احساسات کا نہاں خانہ ہے۔ شعر جن جذبات کا حامل ہوتا ہے، سننے والے کے انہی جذبات کے تار چھیڑ دیتا ہے اور سامع کی زبان سے واہ یا آہ نکل جاتی ہے۔

غزل پر انتشار، بے ربطی، اختصار۔ تنگ نائے وغیرہ نہ جانے کتنے الزام لگائے جاتے ہیں مگر جس طرح زُلفِ پریشاں، گردشِ چشم کی سیمابیت اور غیر مربوط اندازِ تکلم کسی حسین کو حسین تر بنا دیتے ہیں اسی طرح غزل کا انتشار، اختصار رمز و کنایہ، بے ربطی کا ربط غزل کے حسن میں نکھار پیدا کر دیتے ہیں۔

فن موسیقی کے ہر زیر و بم میں فلسفۂ حیات و کائنات کے راز پوشیدہ ہیں۔ حیات انسانی کے نازک ترین پہلوؤں سے موسیقی کا بہت گہرا تعلّق ہے۔ انسانی زندگی کو بنانے سنوارنے کے لیے اس فن کو بھی اہم مقام حاصل ہے۔ مگر زندگی کا بننا اور بگڑنا اس فن کے صحیح اور غلط مَصرف پر مَوقوف ہے اسی طرح غزل کا بھی صحیح مَصرف انسانیت کی اعلا و ارفع منزلیں طے کرا سکتا ہے اور غلط استعمال قعرِ مذلّت میں ڈھکیل بھی سکتا ہے۔

غرض غزل ایک ہمہ گیر صنفِ سخن ہے اس میں آفاقیت، مقامیت، علویت، اسفلیت، خود غرضی سے لے کر انسانی اخوت و ہمدردی سبھی کچھ ہے اسی وجہ سے یہ رندوں کی بزم میں رند، صوفیوں کے حلقے میں صوفی، فلسفیوں کے اجتماع میں فلسفی، سیاستدانوں کے جمگھٹے میں سیاستداں پائی جاتی ہے۔ ہر گروہ اپنے ذوق و مزاج کے مطابق اس سے کام لیتا ہے۔ غزل کی یہ ہمہ گیری آج کل کی بات نہیں یہ صدیوں کی انسانی کاوشوں

کا نتیجہ ہے۔

آج سے بارہ سو سال قبل اُردو کا خمیر گجری کے روپ میں اٹھنا شروع ہو گیا تھا۔ گجری بولی کی حیثیت سے اپنا مقام بناتی رہی تیرھویں صدی عیسوی میں دہلی میں فارسی ترکی پنجابی زبانیں بولنے والے جمع ہوئے تو وہاں بھی اردو کا ایک روپ دہلوی بولی کی شکل میں رواج پا گیا۔ چودھویں صدی عیسوی میں گجرات پر حکومتِ دہلی کا قبضہ ہو گیا۔ لہٰذا سیاسی سماجی، تجارتی اسباب کی بنا پر گجرات اور دہلی کے درمیان تاجروں اور دفتروں کے اہل کاروں کی آمد و رفت کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ یہ لوگ اپنے ساتھ فارسی اور دہلوی بولی گجرات لائے۔ اس طرح گجرات کی گجری اور دہلی کی دہلوی بولیاں جو عوامی زبانیں تھیں ان میں وحدت پیدا ہوتی گئی۔ اور گجری میں اتنی توانائی پیدا ہو گئی کہ احمد آباد کے صوفیائے کرام نے اس کی مقبولیت کے پیش نظر گجری کو ادبی شکل دیدی اور بولی کو زبان کا درجہ حاصل ہو گیا۔ اسی عہد میں صوفی سنتوں کے رشحات میں غزل بھی ریختہ کی صورت میں سامنے آتی رہی۔

فارسی لفظ ریختہ دراصل موسیقی کی اصطلاح ہے۔ یہ امیر خسروِ کے اجتہاد کا نتیجہ ہے اس کے معنی پختہ، ٹوٹا پھوٹا، ایجاد کرنا، بنانا، ڈھالنا، موزوں کرنا کے پیش نظر اردو زبان، غزل، نظم وغیرہ کو ریختہ نام دیا گیا ہے۔ ایک قدیم دکنی شاعر سعدی کا ایک شعر ہے:

سعدی کہ گفتہ ریختہ در ریختہ ددر ریختہ　　　شیر و شکر آمیختہ ہم ریختہ ہم گیت ہے

ریختہ کے مختلف معنی و مفہوم کے پیش نظر یہ ادبی تجربہ امیر سے عالمگیر تک ہوتا رہا۔ صوفیوں سنتوں کے یہاں بہ اعتبارِ زبان و صنف جو نمونے ملتے ہیں ان کا دور امیر سے زٹل اٹل تک قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ لفظ ریختہ زبان اور غزل کے لیے میرؔ، سوداؔ، وغیرہ نے استعمال کیا ہے بلکہ غالبؔ نے بھی غزل کو ریختہ کہا ہے۔

ریختہ بہ اعتبار زبان گیانیشور ۱۲۷۵ء، رام داس، میراں بائی، کبیر، تلسی داس ۱۶۲۳ء، ایک ناتھ، نام دیو، تکارام ۱۶۵۰ء وغیرہ کے ہاں اس طرح پایا جاتا ہے:

۱- میراں بائی :

رام کی دیوانی میرا درد نہ جانے کوئی — گھائل کی گت گھائل جانے جو گھائل ہوئے کوئی

۲- ایک ناتھ :

دل کی گانٹھ کھولو — یارو رام نام بولو

۳- تلسی داس :

سدا سدا میں شرن تمہاری — تم بڑے گریب نواج

۴- نام دیو :

توں داناتوں بینا میں وچار وکیا کرو — تا میہ سوامی نو

عالمگیر کے عہد تک بیسیوں ریختہ گویوں کا پتا چلتا ہے۔ ان میں رس رنگ، جمالی عشقی، بہرام سقا، سیّدن، عالم، وِنے وجے، شہریار، تاج، برہمن خصوصیت رکھتے ہیں۔

دکن میں ۷۴۷ھ سے ۱۰۹۷ھ تک دکنی تاجداروں کا دورِ حکومت رہا۔ اس کے بعد دکن مغلیہ قلمرو میں شامل کر دیا گیا۔ چار سو سالہ دورِ حکومت میں آخری ایک سو سال تک اردو ادب کے لیے سنہری دَور رہا۔ اس طرح گجرات کے بعد دکن اردو ادب کا دوسرا مرکز قرار پایا۔ شمال میں دہلوی (اردو) بول چال کی زبان کی حیثیت سے عام تھی فارسی کے مقابلہ میں اردو کو ادب کے لیے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔

دکن میں اردو ادب خانقاہوں میں پرورش پاتا رہا۔ جیسا کہ گجرات میں ہوتا رہا۔ دکن میں تاجداروں کی توجّہ خاص کی وجہ سے زبان و ادب خانقاہوں سے نکل کر درباروں اور محلوں میں باریاب ہو گئے۔ درباری ماحول نے اردو میں مثنوی قصیدہ جیسے اصناف کو ارتقائی مدارج طے کرا دیے۔ شامیوں اور ایرانی علما و ادبا کے مذہبی رجحانات کی بنا پر صنف مرثیہ کو پنپنے کا موقع مل گیا اور محلات کی فضائے حسن و جمال اور عشق و ہوس کی وجہ سے غزل بھی نکھار کے ساتھ جلوہ گر ہو گئی مگر تاجداروں اور چند گِنے چُنے شعرا ہی نے صنف غزل میں طبع آزمائی کی ہے۔ چند ایسے بھی پائے جاتے ہیں جنھوں نے

منہ کا مزہ بدلنے یا پھر اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دینے کے لیے غزلیں کہی ہیں۔ عموماً دکن میں صنفِ مثنوی مقبول رہی اور اس صنف میں باکمالوں نے اپنا کمالِ فن ظاہر کیا ہے اور بلند پایہ مثنویاں پیش کیں۔ دکن کے غزل گویوں میں محمد قلی قطب شاہ متوفی ۱۰۲۰ھ محمد قطب شاہ متوفی ۱۰۳۵ھ، عبداللہ قطب شاہ متوفی ۱۰۸۳ھ، تاناشاہ، بیجاپور کا علی عادل شاہ ثانی متوفی ۱۰۸۳ھ، حسن شوقی اور خواجہ غواص، خصوصیت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ مشتاق اور لطفی بھی دکن کے شعرا میں بلند درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی چند غزلیں پائی جاتی ہیں۔ آخری دور کا ایک مثنوی نگار شاعر ہاشمی صاحب دیوان شاعر گزرا ہے۔ اس کی ۲۷۳ غزلوں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

غزلگویوں میں محمد قلی قطب شاہ المتخلص معانی سرفہرست ہے اس کے ضخیم کلیات میں سینکڑوں غزلیں بھی ہیں۔ اس نے اجتہاد سے کام لیا اور اپنے حسن وعشق سے متعلق خیالات واحساسات کو خوش اسلوبی سے ادا کیے ہیں۔ اس کی غزلوں میں فطری جذبات پائے جاتے ہیں جو حسن وعشق وہوس سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس وقت تک دکن میں گجری، دکنی، دہلوی اور ایرانی تہذیبوں اور زبانوں کے میل سے ایک ذہن بن چکا تھا اور اس ذہن کی پیداوار سے دکنی بولی اور دکنی اردو وجود میں آگئی۔ اسی دکنی اردو میں دکن کے شعرا نے اپنی تخلیقات پیش کی ہیں۔ متغزلین نے بھی اسی محاورے کو کام میں لیا بلکہ وہ اس کو بنیاد بناکر اپنی اجتہادی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ دکن کے مثنوی ادب میں داخلی موضوعات اور طریق اظہار پہلے ہی سے موجود تھے لہٰذا متغزلین کو ان سے طرزِ فکر وطرز ادا میں مدد مل گئی۔ متغزلین نے فارسی سے معیار وموضوعات کو لے کر تغزلی طرز ادا اور لب ولہجہ کو قائم کیا اور اس طرح صنف غزل کا الگ وجود منظرِ عام پر آگیا ان متغزلین کے کلام کے مطالعہ سے واضح ہوگا کہ ان لوگوں نے فارسی کی نری نقالی نہیں کی ہے۔ ان لوگوں نے ہندی عنصر کے ساتھ فارسی عنصر کو کھپانے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ ان کے پیکرِ غزل میں نقائص ضرور ہیں تاہم یہ تجربہ قابلِ ستائش ہے۔

اس نقش اول میں بعض جگہ ہندی اور فارسی دھارے الگ الگ پائے جاتے ہیں، لسانی عناصر میں امتزاج اور یک رنگی نہیں ہے اس لیے زبان میں گھلاوٹ نہیں ہے۔ ان کی تخلیقات کے مطالعہ سے ایک ایسا نقش سامنے آتا ہے جیسے ایک نئی نویلی دلہن نئے ملک اور نئے گھر کی فضا میں اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس وجہ سے اس کے لباس، وضع قطع، بول چال میں دورنگی پائی جاتی ہے۔

دکنی غزل گویوں کے تصورات حسن و عشق میں حقیقت و واقعیت پائی جاتی ہے۔ ان کے محبوب اور عاشق دونوں جاندار شریف النفس اسی دنیا سے تعلق رکھنے والے پیکر ہیں۔ غزلوں میں ہندی فضا کی بڑی دلیل عورت کی طرف سے اظہار عشق اور ہجر و فراق سے متعلق اپنے جذبات کی وضاحت ہے۔ جیسے

۱۔ تمن بن دیس منج نس ہے تمن سوں دین منج دن ہے
کھڑی اک پاؤ پر جوں سرو ملنے کی آتا لی میں

انتظار میں ایک پاؤ پر کھڑے رہنا عورت کی خصوصیت ہے۔

۲۔ دو تن گلتی ہور جلتی جوں موم بتی
گنواتی ہے جلنے منے ساری راتا

رقیب کے حسد میں جلنے کو ظاہر کیا گیا ہے۔

عاشق کی شرافت ملاحظہ کیجئے۔

گلے لگنے کوں منگتا ہوں ولے دھن کیا کہے گی کر
جتا دھنتا ہوں اتنے کوں سوئی ہوتا ہے شک مانع

عاشق محبوب کو اپنے گلے سے لگا لینا چاہتا ہے مگر اس کا شک روکتا ہے کہ محبوبہ اس فعل کو پسند نہیں کرے گی۔

منج ترا ہجر ہو نمرود جب آتش میں ہے تب خلیل ہو میں اس آتش کوں گلستاں کروں

اگر تیرے فراق کی آگ آتش نمرود ہے تو میں خلیل اللہ کی طرح اس کو گلزار بنا دوں گا۔

خدایا عشق مشکل ہے بھرم رکھ تو معانی کا
پڑے دنبال میں میرے سواس نینا کے دنبالے

جیوں مے پرست کرتے پیالے سیتی دوا صبح
میرا خمار توڑو آپ حسن کی نگہ سوں

ان غزل گویوں کے یہاں ہندی فارسی خیالات کے ساتھ نئے مضامین تشبیہ واستعارہ میں جدّت وندرت، مشکل زمینوں میں تخلیقات نے ایک آہنگ غزل پیش کر دیا اسی آہنگ پر تجربے ہوتے رہے اور رنگ بدلتے رہے۔

عالمگیر کے بعد سے مغل سلطنت کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ یہ زوال صرف مغلیہ حکومت کی بد نصیبی نہیں تھا بلکہ پورے ہندوستان کے لیے بُرے دن کی پیش گوئی تھی۔ جنوب ہو کہ شمال سیاسی سماجی، مذہبی شعبہ جات میں ایک خلف شار برپا ہو چکا تھا اور ذہنی انتشار اپنا رنگ جمائے ہوئے تھا۔ ایسے وقت میں ایک انسانیت دوست مشیر و مصلح کی ضرورت تھی جو اپنے فکر وفن کے ذریعہ مردہ دلوں میں جینے کی تمنا پیدا کرتا، حیات وکائنات کی حقیقتوں کو سمجھنے کا شعور دیتا اور ذریعۂ اظہار زبان وادب کی فرسودگی کو مٹا کر توانائی بخشتا۔

زمانہ وماحول نے اس خدمت جلیلہ کے لیے ایک عہد آفریں شاعر وؔلی پیدا کیا جس نے جمود کو توڑا اور مایوسیوں کے طلسم کو بکھیر دیا۔ وؔلی بے شمار صلاحیتوں کا مالک تھا۔ وہ جیدّ عالم، بلند مرتبت شاعر وانشا پرداز، نظام تصوّف کا نمائندہ دوُر بین انسانیت دوست تھا۔ اس کا نصب العین خدمت النّاس تھا۔ اس نے مقصد حیات کی تکمیل کے لیے اللہ کی دی ہوئی تمام لیاقتوں اور صلاحیتوں کو کام میں لیا۔

وؔلی نے اپنے زمانہ کے حیدری تقاضے پورے کرنے کے لیے صنف غزل کو اپنایا۔ اس نے حسن وعشق کی علامتوں اور حسن فطرت کے کرشموں کے پردے میں فلسفۂ حیات اور تصوّفی نکات کو پیش کر کے غزل کو تغیر حیات وکائنات بنا کر ادب کی مادّی زندگی کے قریب کر دیا۔ اس کی وجہ سے اس دَور میں تصوّرات حسن وعشق نے نیا رخ اختیار کیا۔ محدوُد تصوّرِ حسن وعشق میں وُسعت پیدا ہو گئی۔ صرف جسمانی لذّتیت غزل کا موضوع نہیں رہا۔ مادّی حیات کے مسائل کے ساتھ ساتھ رُوحانی مسرّتوں کی

ترجمانی ہونے لگی۔ عملی زندگی کی قدروں کا ذکر ہونے لگا اور غمِ جاناں اور غمِ دوراں میں وحدت غزل کی اہم خصوصیت بن گئی۔ موضوعات کے تنوّع کی وجہ سے غزل میں توانائی اور نکھار پیدا ہو گیا۔

تصوّف ولی کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اس کے تصوّرات حسن و عشق تصوّف ہی کے محور پر گھومتے ہیں۔ رمز و اشاریت سے مجاز و حقیقت میں وحدت کے عجیب عجیب کرشمے دکھلائے ہیں۔ ولی کا کلام وحدت کے پیغام کی وجہ سے ٹھنڈی چھاؤں کا حکم رکھتا تھا یہی پراگندہ خاطروں کے لیے تسکین قلب کا سامان قرار پایا۔

اس دور کی ادبی زبان ولؔی کے لسانی اجتہاد کی مرہونِ منّت ہے۔ ولؔی کے سامنے دکنی متغزلین کی تخلیقات موجود تھیں۔ وہ زبان کا نبض شناس تھا۔ اس نے زبان کی خامیاں معلوم کر لی تھیں۔ ولؔی فارسی میں یدِ طولار رکھتا تھا لہٰذا اس نے اس عنصر کو اردو غزل میں بہت ہی سلیقہ مندی سے کام میں لیا۔ اسی طرح ہندی طرزِ تخئیل پر ذخیرۂ فارسی طرزِ تخئیل کو ترجیح دی۔ ولؔی نے بعض ہندی الفاظ کو متروک قرار دیا اور فارسی ذخیرۂ الفاظ سے حسب ضرورت لیتا گیا اور اس طرح استعمال کیا کہ کہیں بھی جوڑ پیوند کھلتا نظر نہیں آتا۔ فارسی تشبیہوں، استعاروں، محاوروں کو ولؔی نے کام میں لیا پرانی تشبیہوں اور استعاروں کی جدّتِ ادا سے مسیحائی کی اور نئی نئی تشبیہوں تمثیلوں وغیرہ کا اضافہ بھی کیا۔ فارسی محاوروں کو ترجمہ کر کے خوش اسلوبی سے کھپایا اسی طرح نئی نئی ترکیبوں اور مرکّبات کو بھی اردو میں روشناس کرایا۔ چند مرکّبات جیسے موجِ آبِ وفا، گوہرکانِ حیا، کنعانِ دل، مصرعۂ زنجیرِ جنوں، حصارِ خاموشی، ہوشِ دشمن، جنّتِ احبابِ تمنّا، طغرائے نیاز وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

ولؔی نے ہندی عُنصر کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ہندی لفظوں اور ترکیبوں کے علاوہ تاریخی تلمیحوں، مذہبی اصطلاحوں اور ہندوستانی زیور، سنگار پھل پھول، ساز، راگ، دریاؤں کے ناموں وغیرہ کو تشبیہاً، استعارتاً، تمثیلاً استعمال کر کے توازن قائم کیا۔

غرض ولی نے غزل اور موضوعِ غزل کی مناسبت سے ایک لطیف زبان کو رواج

دیا۔اس نے پاکیزہ خیالات کو پاکیزہ زبان میں کچھ اس طرح پیش کیا کہ ایک اچھوتا اسلوب سامنے آگیا اور غزل کا ایک ایسا آہنگ ثابت ہوا کہ اس حسین دوشیزہ پر ہر طرف سے ڈورے ڈالے جانے لگے۔

وَلی نے صرف مجاز و حقیقت ہی میں وحدت کا تماشا نہیں دکھلایا ہے بلکہ ہندی اور فارسی عناصر کے امتزاج سے لسانی وحدت کا نمونہ پیش کیا اور اسی طرح ایک ادبی زبان کو رواج دے کر جنوب و شمال میں بھی وحدت پیدا کر دی۔ وَلی کے عہد میں شمالی ہند میں اردو، بول چال کی منزل سے آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔ وَلی کا کلام شمال میں پہنچا تو ادب سے دلچسپی رکھنے والے متاثر ہوئے اور اردو شاعری کی دھوم مچ گئی اور ایسے ایسے بلند مرتبہ شاعر پیدا ہو گئے، جنھوں نے اردو شاعری کو تیزی سے ارتقائی منزلیں طے کرا دیں۔ اس طرح اردو غزل منزل بہ منزل موجودہ دور میں ہم تک پہنچی۔

وَلی کے دور کی لسانی خصوصیت اور نئے دھارے کے بہاؤ کا اندازہ وَلی اور اس کے ہمعصروں کے کلام کے مطالعہ ہی سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ یہاں چند اشعار نمونہ کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

وَلی: موجِ دریا کوں دیکھنے مست جا	دیکھ اس زلفِ عنبری کی ادا
۱۔ کیا کہوں نبضِ دل کی بے تابی	قوت جس کا ہے آتش و نشتر
۲۔ اول ریحاں و آخر لالہ رنگ	ظاہر ابرک حنا شمشیر ہے
۳۔ سحر پرداز ہیں پیا کے نین	ہوش دشمن ہیں خوش ادائے نین
۴۔ مہ جبیں پر لگائے کیوں ٹیکا	ماہ میں کام کیا ہے دیوے کا
۵۔ اے سکندر نہ ڈھونڈ آبِ حیات	چشمۂ خضر خوش بیانی ہے
۶۔ پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا	شاید کہ مرا حال اسے یاد نہ آیا
فیض: تشبیہہ قد دلبر ہوں	سرو گلشن منیں نہال ہوا
رضی: خراب نرگسِ مستانہ ہوں نین کی قسم	بہ رنگ بلبل دیوانہ ہوں چمن کی قسم
راجا رام: رکھتا ہے گرچہ ساغر و صہبا کی آرزو	اوس چشم پر خمار طرف جھک کہیں نہ جھک
آبرو: تم نظر کیوں چرائے جاتے ہو	جب تمہیں ہم سلام کرتے ہیں
حاتم: بندگی سے سرو قد کی یک قدم باہر نہیں	سرو گلشن بیچ کہتے ہیں مگر آزاد ہے

MAZAMINE MADNI

Publications of Gujarat Urdu Akademi Gandhinagar-17

1	ADABI ASNAF - Dr. Gyanchand Jain	RS. 30-00
2	GUJRI MATHNAVIYAN - Dr. Saiyed Zahiruddin Madani	RS. 35-00
3	KUCH BACHA LAYA HOON - Prof. Varis Alvi	RS. 51-00
4	MAZAMINE MADANI - Dr. Saiyed Zahiruddin Madani	RS. 53-00
5	PESHA TO SIPAHGARI KA BHALA Prof. Varis Alvi	RS. 56-00
6	TAZKIRATUL - WAJEEH - Saiyed Husaini Peer	RS. 47-00

Annual Journals

1	Sabar Nama	- 1985	Rs. 40.00
2	Sabar Nama	- 1988	Rs. 40.00
3	Sabar Nama	- 1990	———

گجرات اردو اکادمی

GUJARAT URDU AKADEMI
GANDHINAGAR-17